ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

برہان

جلد ۴۰ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۵۸ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آخر ہندی کے نادان دوستوں اور پرجوش حامیوں کی ناسمجھی اور بے احتیاطی رنگ لائی اور آج ملک کی قومی زبان کا مسئلہ وقت کا سب سے اہم اور نازک مسئلہ بن کر رہ گیا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ حکومت نے جو لسانی کمیشن مقرر کیا تھا اُس کے ایک رکن ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی نے جو ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں انگریزی کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی مخالفت میں ایک طویل اور نہایت فاضلانہ اختلافی نوٹ لکھا جس کی تائید ایک دوسرے رکن نے بھی کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نوٹ میں صاف طور پر ان خطرات سے آگاہ کر دیا تھا جو عجلت پسندی کے ساتھ ہندی کو انگریزی کی جگہ دے دینے سے رونما ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس اندیشہ کا اظہار کیا تھا وہ صحیح نکلا۔ چنانچہ ماہ دسمبر کے وسط میں جنوبی ہند میں زبان سے متعلق جو اجتماع ہوا تھا اس میں شری راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر راماسوامی آئر اور سر مرزا محمد اسماعیل جیسے لائق فخر فرزندانِ ہند نے اپنی تقریروں میں بالکل غیر مشروط طریقہ پر ہندی کو سارے ملک کی سرکاری زبان بنانے کی شدید مخالفت کی اور ایسے تند و تیز لہجے میں کی کہ شمالی ہند کے در و دیوار لرز اُٹھے۔ اس کے بعد اسی ماہ کے آخری ہفتہ میں کلکتہ میں ملک کے مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی اس میں بھی مقررین نے ہندی کی مخالفت میں سخت تقریریں کیں اور رزولیوشن منظور کیے اس کے فوراً بعد ہی احمد آباد میں آل انڈیا بنگالی لٹریری کانفرنس ہوئی اس میں بھی اسی قسم کے خیالات و افکار کا اسی قسم کی زبان میں اظہار کیا گیا۔ یہ اجتماعات اگرچہ الگ الگ ہوئے لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے اُن کے مطالبات میں امرِ مشترک یہ ہے کہ

(۱) ہندی کو ملک کی سرکاری زبان بنانے سے متعلق دستور میں جو دفعہ ہے اُس میں ترمیم کی جائے،

(۲) دستور میں جن چودہ زبانوں کا ذکر ہے اُن سب کو قومی زبان تسلیم کیا جائے۔

(۳) مذکورۂ بالا زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی قومی زبان تسلیم کیا جائے۔

حکومت کے لسانی کمیشن پر غور و خوض کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ نے مختلف زبانوں کے نمائندوں کی ایک سب کمیٹی بھی مقرر کی ہے جس میں اردو کے نمائندے مولانا محمد حفظ الرحمن ہیں۔ اس کمیٹی کے سامنے بڑا اہم اور کٹھن مرحلہ ہے اور ملک کی نگاہیں اس کی رپورٹ پر لگی ہوئی ہیں۔ مدراس، کلکتہ اور احمد آباد کے اجتماعات کے بعد مشرقی اور جنوبی ہند کے اخبارات کا رویہ بھی ہندی کے متعلق کافی بدلا ہوا نظر آتا ہے جس سے یہ قیاس کرنا بے جا نہیں ہے کہ اگر سرکاری زبان کی اس گتھی کو حزم و احتیاط اور انصاف کے جذبہ کے ساتھ سلجھانے کی کوشش نہیں کی گئی تو بقول شری راجگوپال اچاریہ کے اس کا نتیجہ ملک کی وحدت و اتحاد کے حق میں بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، موصوف نے اس سلسلہ میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی کلکتہ والی تقریر کا جواب دیتے ہوئے یہ بالکل بجا فرمایا کہ مذہب کے بعد زبان ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ایک انسان سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس لئے اگر زبان کے اختلاف کے قضیہ کو عدل و انصاف اور رواداری کے ساتھ طے نہ کیا جائے تو اُس سے سخت تفرقے پیدا ہو سکتے ہیں۔ پنجاب میں مہینوں تک جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہی ہے بہر حال ہم شروع سے ہی جو کہتے آ رہے تھے کہ محض اُردو کی مخالفت میں ہندی کو ملک پر ٹھونسنے کی جارحانہ پالیسی خود ہندی اور ملک کے حق میں مہلک ثابت ہو گی آج حالات و واقعات اُس کی حرف بحرف تصدیق کر رہے ہیں مگر اب بھی کچھ زیادہ بگڑا نہیں ہے۔ ابھی وقت ہے کہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول پر اس مسئلہ کو طے کر لیا جائے۔ "ہندی بے شبہ ایک دن سارے ملک کی سرکاری زبان ہو گی" لیکن ملک کی وحدت اُسی وقت قایم رہ سکتی ہے جب کہ دستور کی باقی زبانوں کے ساتھ بھی پریم اور عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے اور ان زبانوں میں ایک اُردو بھی ہے۔"

عجیب بات ہے کہ ادھر ہندی کے خلاف یہ ہنگامہ آرائی اور دوسری جانب شمالی ہند کی چشم تمنا

کا ایک گرا ہوا آنسو جنوبی ہند کے دامن پر مچل کر گل و گلزار بن گیا۔ یعنی آندھرا میں اُردو کو علاقائی زبان مان لیا گیا۔ اس سلسلہ میں آندھرا اسمبلی کے اسپیکر اور ریاست کے وزیرِ اعظم کی تقریروں کا پارلیمنٹ اور دوسرے صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبروں نے جس پرتپاک طریقہ پر خیر مقدم کیا ہے وہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اب ملک میں اُردو کے ساتھ انصاف کرنے کا جذبہ روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے اور عام فضا بہت کچھ سازگار ہوگئی ہے، بہر حال ہم آندھرا پردیش کی حکومت کو اس کے اس دانشمندانہ اقدام پر دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں، کہ اس راہ میں پہل کرنے کا شرف اُس کو حاصل ہوا۔ یوپی بہار اور دلی و پنجاب کی حکومتوں کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔

افسوس ہے دسمبر کے آخری ہفتہ میں جناب رام بابو سکسینہ کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے بحالتِ سفر اچانک انتقال ہو گیا، موصوف کو اُردو زبان و ادب کے ساتھ عشق تھا اور وہ اس کا بڑا وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ذمہ دار سرکاری عہدہ کی چند در چند مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ادبِ اُردو پر متعدد ضخیم کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان کی کتاب تاریخ ادب اُردو کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اس موضوع پر یہ کتاب اس پایہ کی ہے کہ ادبِ اردو کا کوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ "اردو کے انگریز شعرا" نامی کتاب انھوں نے بڑی تلاش و جستجو اور محنت سے مرتب کی تھی۔ ایک کتاب حال میں ہی "مرقع شعراء" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ دو کتابوں کے مسودے ابھی اور باقی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں، موصوف اب دنیا میں نہیں لیکن اُن کے یہ شاندار ادبی کارنامے اُن کا نام زندہ رکھیں گے۔

علمائے ہند کی کلامی خدمات

از

(جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ بی ٹی ایچ۔ رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی یوپی)

(۳)

تصنیف و تالیف کا آغاز؛ تاریخِ ادبِ عربی کا یہ دلچسپ مسئلہ ہے کہ سب سے پہلے عربی زبان میں تصنیف و تالیف کی بنیاد کس نے ڈالی۔ اس سلسلے میں سندھ کا یہ دعویٰ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عربی ادب کے پہلے مصنف کا نام سندھ سے وابستہ ہے اگرچہ بعض لوگوں کی رائے میں امام عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج البصری (المتوفی ۱۶۵ھ) اور بعض کی رائے میں ابو النضر سعید بن عروبہ (المتوفی ۱۵۶ھ) عربی زبان کے پہلے مصنف ہیں مگر ابو محمد الرامہرمزی کے قول کے مطابق یہ شرفِ اولیت ربیع بن صبیح (المتوفی ۱۶۰ھ) کو حاصل ہے۔[۱] طبری نے لکھا ہے کہ عبد الملک بن شہاب المسمعی کے ساتھ ملک سندھ میں رضاکارانہ طور پر جو لوگ جہاد کرنے گئے تھے اُن میں ربیع بن صبیح بھی تھے۔ ربیع نے سندھ ہی میں وفات پائی۔ اس طرح سندھ کی خاک پاک کو یہ شرف حاصل ہے کہ عربی زبان کا پہلا مصنف اُس کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔

لیکن علم کلام؟ ملحوظات بالا سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سندھ نے اسلامی علوم کے ارتقاء میں بڑا اہم کردار انجام دیا ہے۔ مگر اس دور میں ملک سندھ کے اندر علمِ کلام کے سلسلے میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اہلِ سندھ بڑے صحیح العقیدہ تھے۔ یہ چیز کسی نہ کسی صورت میں ۳۷۵ھ تک جب کہ مقدسی نے سندھ کا سفر کیا باقی رہی چنانچہ وہ یہاں کی مذہبی حالت کے بارے میں لکھتا ہے۔

انھم علی طریقۃ مستقیمۃ ومذاھب محمودۃ وصلاح وعفۃ قد اراحھم	یہ لوگ طریق مستقیم پر گامزن ہیں اور اچھے مذاہب اور صلاح و پاکدامنی کے ساتھ متصف ہیں اللہ تعالیٰ نے

[۱] کشف الظنون جلد اول صد ۲۶

اللہ من الغلو والعصبیۃ والھرج والفتنۃ[1] — انھیں غلو و افراط، عصبیت، ہرج و مرج اور فتنہ پردازی سے نجات دے دی ہے۔

معاشرتی حالات میں وہ بحران پیدا نہ ہوا تھا جس کے معالجے کے لئے کلامی جدال کی ضرورت ہو۔ خود مرکزِ اسلام میں علمِ کلام کو کوئی مقبولیت حاصل نہ تھی بلکہ متکلمین کی سرگرمیاں زجر و توبیخ کا نشانہ بنی ہوئی تھیں امام ابویوسفؒ کا حسب ذیل قول کلام کی مذمت میں مشہور ہے۔

"من طلب الدین بالکلام تزندق ومن طلب المال بالکیمیاء افلس ومن حدث بغرائب الحدیث کذب"[2]

اسی قسم کی روایت شعبی اور مالک بن انس سے بھی کی گئی ہے کیوں کہ حسب تصریح امام ابوبکر البیہقی ان حضرات کے زمانے میں کلام کا مصداق اہلِ بدعت کی بد دینیاں تھا۔ اہلِ سنت اس کے ساتھ شاید ہی اعتنا کرتے ہوں۔

"قال ابوبکر البیھقی وروی ھذا ایضاً عن مالک بن انس قال وانما یرید واللہ اعلم بالکلام کلام اھل البدع فان فی عصرھما انما کان یعرف بالکلام کلام اھل البدع فاما اھل السنۃ فقلما کانوا یخوضون فی الکلام حتی اضطروا الیہ"[3]

یہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں اہلِ دین متکلمین کے ساتھ مناظرہ کرنا بھی دینداری اور ثقاہت کے منافی سمجھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل پر جب دربارِ مامون میں معتزلہ زبان درازی کے اندر غالب آگئے تو ضرورت تھی کہ علمائے اہلِ سنت والجماعت دربارِ خلافت میں جاتے اور جا کر معتزلہ سے بحث کرتے مگر ان لوگوں نے جانا پسند نہیں کیا اور انھیں کی اس احتیاط کی بنا پر امام احمد بن حنبل کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔ چنانچہ ابن عساکر نے قاضی ابوبکر الباقلانی سے اس شکوہ کی روایت کی ہے۔

"قال ابن کلاب والمحاسبی ومن کان فی عصرھما من المتکلمین ا ت — ابن کلاب اور محاسبی اور اُن کے ہم عصر متکلمین نے کہا کہ ہم مامون کے دربار میں نہیں جائیں گے یہاں تک کہ

---

[1] احسن التقاسیم للمقدسی صـ۲۶۲ [2] تبیین کذب المفتری لابن عساکر صـ۳۳۳ [3] ایضاً صـ۳۳۴

المامون لا تحضر مجلسہ حتی ساق احمد الی طرسوس ثم مات المامون وردوہ الی المعتصم فامتحنہ ورضی بہ وھؤلاء اسلموہ ولو مرّوا الیہ … وقالوا نحن نخاصم هؤلاء القوم [illegible] حجة [illegible] وبیّنوا للمعتصم لارتدع المعتصم ولکن اسلموہ فجری علی احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ ما جری۔[1]

امام احمد بن حنبل طرسوس کو گئے۔ کچھ دن بعد مامون الرشید کا انتقال ہو گیا اور لوگ انھیں معتصم باللہ کے پاس لے گئے اُس نے اُن سے قرآن کے مخلوق ہونے کا اعتراف کرنے کا حکم دیا مگر انھوں نے انکار کر دیا اس پر اُنھیں مارا مگر ابن کلاب محاسبی وغیرہ نے (کچھ پروانہ کی اور) اُنھیں اُس کے سپرد کر دیا۔ اگر یہ لوگ اُس کے پاس جاتے اور اُس سے بحث و مناظرہ کرتے تو پھر وہ ایسا نہ کرتا کیوں کہ اُس کا خیال تھا کہ ان لوگوں کے پاس اپنے موقف کی تائید میں کوئی دلیل و حجت نہیں ہے لہٰذا اگر یہ لوگ اُس کے پاس چلے جاتے اور معتصم کے سامنے دلائل بیان کر دیتے تو وہ ضرور باز رہتا مگر انھوں نے تو گویا احمد بن حنبل کو اُس کے سپرد کر دیا بس اُن پر جو کچھ بیتی وہ بیتی۔

اس عام نفرت و بیزاری کا نتیجہ یہ تھا کہ علم کلام کے ساتھ مشغولیت دنیا کا بدترین گناہ تصور کی جاتی تھی۔ امام شافعیؒ جو خود کسی زمانے میں ابوالہذیل العلاف کے شاگرد رہ چکے تھے اور علم کلام کے خوب واقف تھے، فرماتے ہیں

لان یبتلی المرء بکل ما نھی اللہ عنہ سوی الشرک خیر لہ من الکلام ولقد اطلعت من اھل الکلام علی شئ ما ظننت ان مسلما یقول ذلک۔[2]

اگر آدمی شرک کے سوا ہر گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اُس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ وہ علم کلام میں مشغول ہو اور میں متکلمین کے ایسے اقوال پر مطلع ہوا ہوں کہ میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی مسلمان ایسا کہے۔

---

[1] تبیین کذب المفتری لابن عساکر ص ۱۱۹-۱۲۰ [2] ایضاً ص ۳۳۵

امام شافعی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علم کلام کی مشغولیت کے لئے نہایت توہین آمیز سزا مقرر کی امام ابن تیمیہ نے رسالہ تسعینیہ میں اُن کا قول نقل کیا ہے :۔

حکمی فی اھل الکلام ان یضربوا بالجرید والنعال ویطاف بھم فی القبائل والعشائر ویقال ھذا جزاء من ترک الکتاب والسنۃ واقبل علی الکلام۔[1]

متکلمین کے متعلق میرا فتویٰ یہ ہے کہ اُنھیں چھڑیوں اور جوتوں سے پیٹا جائے اور قبیلے قبیلے اُن کی تشہیر کی جائے اور کہا جائے کہ یہ اُس شخص کی سزا ہے جس نے کتاب اللہ اور سنت رسول کو چھوڑ کر علم کلام پر توجہ کی۔

اس سخت گیرانہ دار و گیر کے بعد خود مرکزِ خلافت میں جہاں ہر قسم کے مکاتیبِ فکر کو آزادی کے ساتھ اپنے اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کی اجازت تھی علم کلام کو مقبولیتِ عامہ حاصل ہونے کا کوئی موقعہ نہ تھا اس کے بعد خلافت اسلامیہ کے دور دراز صوبوں میں کلامی سرگرمیوں کے فروغ کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ ابھی ثقافتی اقدار اور معاشرتی خوب و ناخوب کے معیار میں تبدیلی کے لئے ایک قرن درکار تھا۔ اگلی صدی میں اہلِ سنت والجماعت تک میں علم کلام کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوگئی اور فرقوں میں تو پہلے ہی سے رواج تھا۔ اس تبدیلی سے دوسرے صوبے بھی متاثر ہوئے۔ جہاں تک سندھ کا تعلق ہے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بایںہمہ دیگر علوم و فنون کی طرح علم کلام کے آغاز و ارتقار کے ساتھ بھی سندھ کا نام وابستہ ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ کلامی تفکیر کے قدیم نمایندے معتزلہ تھے اور معتزلی مکتبِ فکر کا قدیم ترین نمایندہ [بلکہ اکثر مورخین کے نزدیک اُس کا بانی] واصل بن عطار تھا۔ اس واصل بن عطار کا دست راست عمرو بن عبید تھا جو معتزلہ کے فرقہ عمریہ کا بانی ہے چنانچہ عبدالقاہر بغدادی نے الفرق بین الفرق میں لکھا ہے

"ذکر العمریۃ منھم وھم اتباع عمرو بن عبید بن باب" (الفرق بین الفرق ص۱۰)

یہ عمرو بن عبید سندھ ہی کا ایک نامور فرزند تھا جس کا دادا موالی کے زمرے میں کابل سے عراق لے جایا گیا تھا۔

---

[1] رسالہ تسعینیہ لابن تیمیہ

مسعودی لکھتا ہے

" وھو عمرو بن عبید بن رباب مولی بنی تمیم وکان جدہ رباب من سبی کابل من رجال السند - وکان شیخ المعتزلۃ ومفتیھا ولہ خطب و رسائل "

(مروج الذہب ومعادن الجوہر برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد ہشتم ص ۹)

عمرو بن عبید غالباً شروع میں واصل بن عطار کا حریف تھا اور اُس سے اُس کے مناظرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ابن الندیم لکھتا ہے کہ واصل کی گردن اُٹھی ہوئی تھی۔ ایک دن عمرو بن عبید سے اُس کا مناظرہ ہونے والا تھا تو عمرو بن عبید نے کہا " انی اری عنقا لا یفلح صاحبھا " واصل نے اس پر اُسے سرزنش کی بہر حال مناظرہ ہوا اور واصل غالب آیا۔ (الفہرست لابن الندیم تکملہ ص ۱)

بعد میں عمرو بن عبید واصل کا ارادتمند بلکہ شاگرد ہو گیا تھا چنانچہ شہرستانی لکھتا ہے۔

" نسج علی منوالھم (القدریۃ) واصل بن عطاء الغزال وکان تلمیذ الحسن البصری وتلمذ لہ عمرو بن عبید وزاد علیہ فی مسائل القدر (الملل والنحل جلد اول ص ۱۲)

اسی طرح اُس نے " المنزلۃ بین المنزلتین " کے باب میں واصل کا تتبع کیا چنانچہ شہرستانی آگے چل کر لکھتا ہے

" وتابع علی ذلک عمرو بن عبید بعد ان کان موافقا لہ فی القدر والصفات "

(الملل والنحل جلد اول ص ۲۳)

اور فریقین جنگ جمل کے تخطئہ کے بارے میں تو وہ واصل سے بھی بڑھ گیا۔ واصل تو یہی کہتا تھا کہ فریقین میں سے ایک خطا پر ہے (یہ نہیں معلوم کون) لہذا اُس کے نزدیک اگر حضرت علی اور طلحہ یا زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین کسی معاملے میں شہادت دیں تو یہ شہادت نافذ نہ ہوگی کیونکہ ان میں سے ایک شاہد مجروح ہے لیکن عمرو بن عبید دونوں فریقوں کا تخطئہ کرتا تھا۔ شرح المواقف میں ہے۔

" واتفق العمریۃ اصحاب عمرو بن عبید وافواصلیۃ اصحاب واصل بن عطاء علی رد شہادۃ الفریقین قالوا لو شھد الجمیع علی باقۃ بقل لم نقبلھا اما العمریۃ فلانھم

یرون فسق الجمیع من الفریقین واما الواصلیۃ فلانھم یفسقون احد الفریقین لا بعینہ۔"

عمرو بن عبید پہلے یزید ناقص کے داعیوں میں سے تھا مگر انقلابِ خلافت کے بعد ابو جعفر منصور کا طرفدار بن گیا تھا شہرستانی لکھتا ہے۔

"وکان عمرو من دعاۃ یزید الناقص ایام بنی اُمیۃ ثم والی المنصور وقال بامامتہ"

(الملل والنحل ص ۱۲)

خلیفہ منصور بھی اُس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا مسعودی نے لکھا ہے کہ ایک دن وہ ابو جعفر منصور کے دربار میں آیا۔ خلیفہ نے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ بٹھایا اور اُس سے وعظ و نصیحت کی درخواست کی۔ وعظ کے بعد جب عمرو جانے لگا تو خلیفہ نے اُسے دس ہزار کی رقم پیش کی مگر عمرو نے باوجود منصور کے اصرار کے قبول نہیں کی۔ جب وہ چلا گیا تو خلیفہ نے اُس کی بے نیازی سے متاثر ہو کر کہا

"کلکم یمشی روید کلکم یطلب صید غیر عمرو بن عبید"

(مروج الذہب برحاشیہ ابن الاثیر جلد ہشتم ص ۹)

شہرستانی بھی اُس کے زہد و تقویٰ کا معترف ہے۔

"وکان عمرو من رواۃ الحدیث معروفا بالزھد" (الملل والنحل ص ۱۲)

مگر عبد القاہر بغدادی کو اُس میں گمراہی و ضلالت کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ واصل کی بدعتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وانضم الیہ قرینہ فی الضلالۃ عمرو بن عبید بن باب کعبد صبی لغیۃ امہ فقال الناس یومئذ فیھما انھما قد اعتزلا قول الامۃ وسمی اتباعھما من یومئذ معتزلۃ ثم انھما اظھرا بدعتھما فی المنزلۃ بین المنزلتین وضما الیھا دعوۃ الناس الی قول القدریۃ علی رائے معبد الجھنی۔"

(الفرق بین الفرق ص ۹۸)

ہندوستان میں مستقل اسلامی سلطنت کا قیام

سندھ عرصے سے نزاری وقحطانی تعصب کی خانہ جنگی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ مرکزِ خلافت سے جو گورنر بھی بھیجا گیا ناکام رہا۔ اُدھر معتصم باللہ نے جن ترکوں کو بے دریغ روپیہ خرچ کر کے استحکامِ سلطنت کے لئے پرورش کیا تھا، اُن کی ترک گردی نے خود قصرِ خلافت کی بنیادیں ہلادیں۔ ۲۳۲ھ میں متوکل باللہ سریر آرائے خلافت ہوا اور پندرہ سال بعد معتصم کی اس ترک نوازی کا پہلا شکار ہوا۔ ظاہر ہے جب مرکزِ خلافت ہی خود ضعف واختلال سے دوچار ہو تو دور دراز صوبوں پر اقتدار کس طرح قائم رہ سکتا تھا۔ سندھ کا ایک مقامی رئیس عمر بن عبدالعزیز الہباری اتنا طاقتور ہو چکا تھا کہ حکام بھی اس سے دبتے تھے۔

آخری گورنر جو دربارِ خلافت سے سندھ بھیجا گیا وہ ہارون بن ابی خالد مروزی تھا۔ اُس سے پہلے سندھ ایتاخ کی ولایت میں تھا جس کی جانب سے عنبسہ وہاں کا عامل تھا[1] جب ۲۳۴ھ میں ایتاخ معتوبِ بارگاہ ہوا تو عنبسہ بھی سندھ سے بھاگ آیا اور متوکل نے اُس کے بجائے ہارون کو سندھ کا والی مقرر کیا۔ یعقوبی نے لکھا ہے۔

"ولما بلغ عنبسة بن اسحاق عامل ایتاخ علی السند الخبر سار الی العراق فولّی المتوکل مکانه هارون بن ابی خالد"[2]

جب عنبسہ بن اسحاق کو جو ایتاخ کی جانب سے سندھ کا عامل تھا ایتاخ کی گرفتاری اور تعذیب وقتل کی خبر ملی تو وہ سندھ سے عراق کے لئے بھاگ نکلا اور متوکل نے اُس کے بجائے ہارون بن ابی خالد مروزی کو سندھ کا والی مقرر کیا۔

لیکن ہارون سندھ کی بدنظمی فرو کرنے میں قطعاً ناکام رہا اور ۲۴۰ھ میں اُس کی وفات پر عمر بن عبدالعزیز الہباری نے متوکل سے سندھ کی حکومت کی درخواست کی۔ یعقوبی لکھتا ہے

وتوفی هارون بن ابی خالد عامل

ہارون بن ابی خالد والی سندھ ۲۴۰ھ میں مرگیا اور

---

[1] تاریخ ابن واضح الیعقوبی جلد دوم ص۵۸۹ [2] ایضاً ص۵۹۳

السند سنہ ۲۴۰ وکتب عمر بن عبد العزیز السامی المنتمی الی سامہ بن لوی وھو صاحب البلد ھنالک انہ ان ولی البلد فاقام بہ ضبطہ فاجابہ الی ذلک فاقام طول ایام المتوکل"[1]

عمر بن عبد العزیز سامی نے جو سامہ بن لوی کی جانب منسوب ہے اور جو منصورہ پر قابض ہو گیا تھا، متوکل کو لکھا کہ اگر وہ سندھ کا والی بنا دیا جائے تو اس کا بڑی خوش اسلوبی سے انتظام کرے گا۔ متوکل نے (مجبوراً) اُس کی درخواست منظور کر لی پس وہ متوکل کی زندگی بھر وہاں کا حاکم رہا

اس طرح متوکل نے مجبور ہو کر عمر بن عبد العزیز اہباری کو سندھ کا نیم خود مختار حکمران تسلیم کر لیا اور ہندوستان میں پہلی مستقل اسلامی سلطنت کا قیام ظہور میں آیا۔

ہباری خاندان اس خاندان کا پہلا فرمانروا عمر بن عبد العزیز تھا۔ اُس کے آبا و اجداد حکم بن عوانہ الکلبی کے ساتھ سندھ میں آئے تھے۔ بلاذری نے لکھا ہے۔

"وکان جد عمر ھذا ممن قدم السند مع الحکم ابن عوانۃ الکلبی"[2]

اور اس عمر (بن عبد العزیز اہباری) کا دادا حکم بن عوانہ کلبی کے ہمراہ سندھ آیا تھا۔

وہ بڑا سیاس و مدبر تھا اور نہایت کامیابی سے تقریباً ۲۷۰ ہجری تک حکومت کرتا رہا۔ ۲۷۰ھ میں سندھ کے تخت پر اُس کا بیٹا عبد اللہ بن عمر متمکن نظر آتا ہے کیوں کہ اسی سال الرور کے راجہ مہروک بن رایک نے اُس سے درخواست کی کہ سندھی زبان میں اسلام کی تعلیمات لکھ کر اُسے بھیجی جاویں۔ اس طرح پہلی مرتبہ سندھ کے اندر علم کلام (عقائد) کی کتاب لکھی گئی۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ عبد اللہ بن عمر نے تیسری صدی کے اختتام تک غالباً حکومت کی۔ اُس کے بعد اُس کا جانشین عمر بن عبد اللہ اہباری ہوا۔ تخت نشینی کی صحیح تاریخ تو نہیں معلوم مگر مسعودی نے ۳۰۳ھ میں اُسے سندھ کا حکمران پایا۔ مسعودی ہندوستان میں ۳۰۳ھ میں آیا تھا جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے "ورأیت مثل ذلک ببلاد کنبایہ (کھمبات) من ارض الھند وکان دخولی الیھا فی سنۃ ثلاث وثلثمائۃ"[3]

---

[1] تاریخ ابن واضح الیعقوبی جلد دوم ص ۵۹۹ [2] فتوح البلدان ص ۴۵ [3] مروج الذہب و معادن الجوہر جلد اول ۱۶۳

اسی سال وہ منصورہ پہنچا جہاں عمر بن عبداللہ اہباری تخت حکومت پر متمکن تھا۔ اُس کا وزیر زیاد تھا
اُس نے یہ بھی دیکھا کہ سندھ میں سادات کے بہت سے معزز خاندان آباد تھے چنانچہ لکھتا ہے:

"وکذلک کان دخولی الی بلاد المنصورۃ
فی ھذا الوقت والملک علیھا ابو المنذر
عمر بن عبد اللہ ورایت بھا وزیرہ
زیاداً وابنیه محمداً وعلیا۔ ورایت
بھا رجلا سیداً من العرب وملکا
من ملوکھم وھو المعروف بحمزۃ
وبھا خلق من ولد علی بن ابی طالب
رضی اللہ من ولد عمر بن علی وولد
محمد بن علی وبین ملوک المنصورۃ
وبین ابی الشوارب القاضی قرابة وصلة
لنسب وذلک ان ملوک المنصورۃ الذین
الملک فیھم فی وقتنا ھذا من ولد
ھبار بن الاسود ویعرفون ببنی
عمر بن عبد العزیز القرشی ولیس
ھو عمر بن عبد العزیز الاموی۔"[1]

اسی طرح منصورہ میں بھی میں اسی زمانے میں پہنچا۔
وہاں کا بادشاہ ابو المنذر عمر بن عبداللہ تھا میں
نے وہاں اُس کے وزیر زیاد اور اُس کے بیٹوں
محمد اور علی کو بھی دیکھا۔ میں ایک اور معزز عرب سے
بھی ملا جس کا نام حمزہ ہے۔ یہاں سادات کی
ایک بہت بڑی جماعت آباد ہے جو عمر بن علی اور
اور محمد بن علی کی اولاد میں سے ہے منصورہ کے
شاہی خاندان اور قاضی (ابن) ابی الشوارب کے
خاندان میں رشتہ داری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ منصورہ
کے حکمران جن کے قبضہ میں آج کل وہاں کی حکومت
ہے ہبار بن الاسود کی اولاد میں سے ہیں اور بنی عمر
بن عبدالعزیز القرشی کہلاتے ہیں۔ یہ عمر بن عبدالعزیز
القرشی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز الاموی نہیں تھا۔

عمر بن عبداللہ اہباری بڑا قابل اور مدبر تھا اُس نے زمین کی آبادکاری پر خصوصی توجہ دی تھی سارا صوبہ
سرسبز و شاداب تھا۔ اُس کے حیطۂ اقتدار میں تین لاکھ گاؤں تھے۔ مسعودی لکھتا ہے

"وجمیع ما للمنصورۃ من الضیاع

منصورہ میں تین لاکھ گاؤں تھے ہر ایک میں کھیت

[1] مروج الذہب ومعادن الجوہر جلد اول صفحہ ۲۴۳ - ۲۴۴ (برحاشیہ ابن الاثیر)

والقری ممایضاف الیھا الثمائة الف قریة ذات زروع واشجار وعمائر متصلة [1] — اور باغات تھے اور آبادیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

لیکن عمر بن عبداللہ کے بعد ہباری خاندان کمزور ہو گیا اور اکثر علاقے اس خاندان کے تصرف سے نکل گئے پھر بھی ۳۷۵ھ کے بعد تک منصورہ پر انھیں کی حکومت رہی کیوں کہ مقدسی جس نے ۳۷۵ھ میں سندھ کا سفر کیا تھا لکھتا ہے

"واما المنصورة فعلیھا سلطان من قریش یخطبون للعباسی" [2] — منصورہ (سندھ خاص) میں قریشی (ہباری) خاندان کی حکومت تھی جو عباسی خلفاء کا خطبہ پڑھتے تھے۔

غالباً چوتھی صدی کے آخر میں ہباری خاندان کی حکومت ختم ہو گئی اور قرامطہ کی (اسمٰعیلی) حکومت قایم ہوئی جس کا آخر کار محمود غزنوی نے خاتمہ کر دیا۔

ملتان اور اسمٰعیلی دعاۃ کا پروپگنڈا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۱۱ھ میں جنید بن عبدالرحمٰن المری کے سندھ سے خراسان تبدیل ہو جانے کے بعد ملتان کا علاقہ سندھ کی بالادستی سے خارج ہو گیا تھا مگر غالباً یہاں آخر تک مسلمانوں ہی کی حکومت رہی۔ ۳۰۳ھ میں مسعودی یہاں آیا تھا وہ لکھتا ہے

"وتفسیر (؟) المولتان رجل من قریش من ولد سامہ بن لوی بن غالب...... وملک صاحب المولتان متوارثان قد یما منذ صدر الاسلام" [3] — ملتان کا والی ایک قریشی شخص ہے جو سامہ بن لوی بن غالب کے خاندان سے ہے...... اور ملتان کی حکومت اس خاندان میں قدیم زمانے سے ہے اور صدر اسلام سے ان کے ورثہ میں آئی ہے

یہ خاندان ملتان میں ۳۶۷ھ کے بعد تک قابض رہا کیوں کہ جب ۳۶۶ھ میں ابن حوقل یہاں آیا تو اس نے ملتان میں بنو سامہ ہی کی حکومت پائی جو سنّی تھے۔ وہ لکھتا ہے۔

---

[1] مروج الذھب و معادن الجوہر جلد اول ص۲۴۵ [2] احسن التقاسیم ص۴۸۵ [3] مروج الذھب جلد اول ص۱۳۷

وبخارج الملتان علی نصف فرسخ ...... معسکر امیر ...... وھومن ولد سامہ بن لوی بن غالب ولیس ھو فی طاعة احد وخطبتہ لبنی العباس [۱]

ملتان سے باہر ½ میل کے فاصلے پر ..... امیر کی چھاؤنی ہے ..... جو سامہ بن لوی بن غالب کی اولاد میں سے ہے۔ وہ کسی کا محکوم نہیں ہے (خود مختار ہے) البتہ خطبہ بنو عباس کے نام کا پڑھتا ہے (سُنّی ہے)

لیکن جب ۳۷۵ھ میں مقدسی اس علاقے میں آیا تو اُس نے یہاں اسماعیلیوں کو حکمراں پایا۔ غرض ۳۶۷ھ اور ۳۷۵ھ کے درمیان بنو سامہ کا زوال ہوا اور اُن کی جگہ ملتان میں اسمٰعیلی حکومت قائم ہوئی۔

سندھ کا پہلا اسماعیلی داعی جس کا نام ہیثم تھا ۲۷۰ھ کے قریب یہاں آیا [۲]۔ اس کے بعد فاطمی دُعاۃ ملک میں انقلاب برپا کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ جب فضا سازگار ہوگئی تو ۳۶۷ھ اور ۳۷۵ھ کے درمیان فاطمی خلیفہ العزیز باللہ نے جلم بن شیبان کو فوجی امداد دے کر بھیجا۔ ملک انقلاب کے لئے تیار ہی ہوچکا تھا۔ جلم بن شیبان نے بنو سامہ کی سنی حکومت کو ختم کر کے اسماعیلی سلطنت کی بُنیاد ڈالی۔ اُسی نے ملتان کے قدیم بت کو توڑا اور اسماعیلی مذہب کی شدت سے تبلیغ کی۔

جلم کے بعد شیخ حمید تخت نشین ہوا۔ اس زمانہ میں غزنوی ترکوں نے ہندوستان پر حملے شروع کئے۔ ان حملوں کے دوران میں شیخ حمید نے خفیہ طور پر لشکرِ اسلام کو زک پہنچانے کی کوشش کی لہذا ۳۸۲ھ میں سبکتگین نے ملتان پر حملہ کیا مگر شیخ حمید نے صلح کر لی ۳۸۷ھ میں سبکتگین کے مرنے پر محمود اس کا جانشین ہوا۔ ۳۹۵ھ تک شیخ حمید اور اس کے جانشین صلح پر قائم رہے مگر بعد میں شیخ حمید کے پوتے داؤد بن نصر نے ایسی حرکتیں کیں کہ ۳۹۶ھ میں سلطان محمود غزنوی کو اُس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا پڑی۔ ملّا نظام الدین ہروی نے لکھا ہے:

"گویند کہ چوں حاکم ملتان داؤد بن نصر از ملاحدہ بود سلطان را حمیت دین بداں داشت کہ او را نیز تادیب نماید پس بعزیمت ملتان سواری فرمود ...... ہفت روز ملتان را محاصرہ نمود حاکم ملتان بر سالہ بست

[۱] کتاب صورۃ الارض لابن حوقل ص۳۲۲ [۲] نزہۃ الاذکار بحوالہ تاریخ سندھ۔

ہزار درم قبول نمودہ اجرائے احکام شرعیہ را تعہد کردہ توبہ بازگشت نمود۔[1]

اس واقعہ کا معاصر عتبی ہے وہ لکھتا ہے

"قد کان بلغ السلطان یمین الدولہ وامین الملہ حال والی الملتان ابی الفتوح فی خبث نحلتہ ودخل دخلتہ وحس اعتقادہ وقبح الحادہ ودعائہ الی مثل رایہ اھل بلادہ فالف للدین من مقارتہ علی فظاعۃ شرہ وشناعۃ امرہ ... ... فثنی العنان الیہا مستعینا باللہ علی ما احدث فی دینہ ..... حتی افتتحہا عنوۃ وشحنہا عقابا وسطوۃ والزمہم عشرین الف الف درہم"[2]

سلطان یمین الدولہ امین الملہ (محمود غزنوی) کو حاکم ملتان ابوالفتوح (امیر داؤد بن نصر) کا حال معلوم ہو چکا تھا نیز اُسے اُس کی خباثتِ مذہبی، فسادِ باطن، بدعقیدگی اور الحاد کا پتہ چل گیا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنی رعایا کو اپنے مذہب کے قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے تو سلطان کی حمیت دینی نے نہ برداشت کیا کہ اُسے اُس کی بدکاری اور شرارت و شناعت پر آزاد چھوڑ دے ...... لہذا اُس نے اُس کی بدعتوں کے خلاف اللہ تعالیٰ سے نصرت و اعانت کی دعا مانگ کے اُس کی طرف عنانِ عزیمت منعطف کی ...... یہاں تک کہ ملتان کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور اسے سطوت و سیاست سے بھر دیا اور اہلِ ملتان پر دو کروڑ درہم کا جرمانہ کیا۔

داؤد نے یہ صلح دب کر کی تھی اس لئے خفیہ طور پر قدیم پالیسی پر قائم رہا اس لئے مجبور ہو کر ۴۰۱ھ میں محمود نے ملتان پر دوبارہ حملہ کیا اور تہس نہس کر ڈالا۔ ملا نظام الدین نے لکھا ہے۔

"سلطان غازی باز در سنہ احدیٰ و اربعمائۃ از غزنین قصدِ ملتان نمودہ آنچہ از ولایت ملتان ماندہ بود بتمامی متصرف شد و قرامطہ و ملاحدہ کہ آنجا بودند اکثرے را کشت و دست ببرید۔ بعضے را بقلعہ بند کرد تا آنجا بمردند و دریں سال داؤد بن نصر را بغزنین بردہ بقلعہ غورک فرستادہ محبوس داشت تا ہمان جا مرگ یافت۔"[3]

۱؎ طبقات اکبری ص۶ ۲؎ تاریخ یمینی ص۲۱۱-۲۱۲ ۳؎ طبقات اکبری ص۶

سندھ میں اسماعیلی حکومت | یہاں سے خاسر و غائب ہو کر اسماعیلیوں نے منصورہ [سندھ] پر قبضہ کر لیا جہاں اُن کی حکومت ۴۱۶ھ تک قائم رہی۔ اس سال جب محمود سومنات سے واپس جا رہا تھا تو منصورہ کے اسماعیلی حکمران خفیف کی شہ سے سندھ کے جاٹوں نے محمود کو بُری طرح پریشان کیا چنانچہ فرشتہ کہتا ہے:

"جتانے کہ در کنار دریائے جودی واقع شدہ بودند در وقت مراجعت از سومنات بلشکر سلطان بے ادبیہا کردہ انواع آزار رسانیدہ بودند"[۱]

محمود اصل وجہ کو جانتا تھا لہٰذا اس کے مستقل تدارک کے لئے اس نے ۴۱۷ھ میں منصورہ پر حملہ کر کے اُسے تباہ و برباد کر دیا۔ ابن خلدون لکھتا ہے

وقصد المنصورۃ وکان صاحبھا	سلطان نے منصورہ کا ارادہ کیا یہاں کا والی مرتد ہو گیا
ارتد عن الاسلام ففارقھا	تھا (قرمطی ہو گیا تھا) محمود کی آمد کی خبر سن کر وہ شہر
وتسرّب فی غیاض ھناک	چھوڑ کر جنگل میں جا چھپا۔ لشکر سلطان نے اسے گھیر
فاحاطت عساکر السلطان	لیا اور ان کا پیچھا کر کے تباہ کر دیا۔ پھر سلطان بھاطیہ
بھا وتتبعوھم بالقتل فافنوھم	چلا گیا۔
ثم سار الی بھاطیۃ[۲]	

ابن خلدون سے پہلے ابن الاثیر نے ۴۱۶ھ کے واقعات میں لکھا تھا

"وقصد المنصورۃ وکان صاحبھا	(سومنات سے واپسی میں محمود نے) منصورہ کا قصد کیا۔
قد ارتد عن الاسلام فلما بلغہ	یہاں کا حکمران اسلام سے پھر گیا تھا (قرمطی ہو گیا تھا)
خبر مجیٔ یمین الدولۃ فارقھا	جب اُسے محمود کے آنے کی خبر ہوئی تو شہر چھوڑ کر گھنے
واحتمی بغیاض اشبہ فقصدہ	جنگلوں میں جا چھپا۔ سلطان نے دو طرف سے پیچھا کیا
یمین الدولۃ من موضعین	اور اسے و اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔ اس کے اکثر

---

[۱] تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۵ [۲] تاریخ ابن خلدون جلد رابع صفحہ ۳۷۵

فاحاط به ومن معه فقتلوا اکثرهم وغرق منهم کثیر ولم ینج منهم الا القلیل ثم سار الی بهاطیه فرحل الی غزنه .....[1]"

ساتھی مارے گئے اور بہت سے ڈوب گئے اور بہت کم بچے پھر سلطان بھاٹیہ ہوتا ہوا غزنی چلا گیا۔

اگلے سال محمود اُن سرکش جاٹوں کی تادیب و سرزنش کے لئے حملہ آور ہوا جنھوں نے سومنات سے لوٹتے وقت اسے پریشان کیا تھا اور اُنھیں بھی تباہ و برباد کر ڈالا۔ نظام الدین نے لکھا ہے

" و دریں سال سلطان بعزیمت مالش دادن جتانے راکہ در وقت مراجعت از سومنات بہ لشکر سلطان بے ادبیہا کردہ انواع آزار رسانیدہ بودند بالشکر عظیم بجانب ملتان رسید ...... ہمہ (جتان) ہمچناں غرق شدند و بقیہ کہ ماندند علف تیغ گشتند و لشکر سلطان بر سر عیال ایشان رفتہ ہمہ را اسیر ساختند"[2]

اس طرح بحر عرب سے ہمالیہ تک کا علاقہ محمود کے حیطۂ اقتدار میں آگیا۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی

مذہبی حالت | ۳۶۷ھ کے قریب ابن حوقل سندھ میں آیا اور یہاں کے معاشی و معاشرتی حالات کو قلمبند کیا۔ خاص سندھ [منصورہ] کے بارے میں لکھتا ہے:

" والمنصورة .... اهلها مسلمون ملکها من قریش من ولد هبار بن الاسود وقد تغلب علیهما اجداده وساسوهم سیاسة اوجبت رغبة الرعیة فیهم وایثارهم علی من سواهم غیر ان الخطبة لبنی العباس "[3]

منصورہ (سندھ) ...... یہاں کے باشندے مسلمان ہیں۔ اُن کا بادشاہ قریشی النسب ہے جو ہبار بن الاسود کے خاندان کا ہے اس بادشاہ کے آباء و اجداد اس ملک پر قابض ہو گئے تھے اور اس خوش اسلوبی سے حکومت کی کہ رعایا میں ہر دل عزیز بن گئے اور اُس نے اُنھیں اُن کے حریفوں پر ترجیح دی۔ یہ بادشاہ خود مختار ہے مگر خطبہ بنو عباس کے نام کا پڑھتا ہے۔

ملتان کے بارے میں لکھتا ہے

---

[1] کامل ابن الاثیر جلد نہم ص ۱۱۱ [2] طبقات اکبری ص ۱۰ [3] کتاب صورۃ الارض لابن حوقل ص ۳۲۰

وفی أھلھا رغبة فی القرآن وعلمہ والأخذ بالمقابری السبعة والفقه وطلبه والعلم۔[۱]

اہلِ ملتان قرآن اور علومِ قرآن کا شوق رکھتے ہیں۔ قرأت سبعہ حاصل کرنے کا رواج ہے۔ نیز فقہ کے شائق ہیں اور علم وادب کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں۔

ابن حوقل کے آٹھ سال بعد (۳۷۵ ہجری میں) مقدسی آیا۔ سندھ (منصورہ) میں ابھی سنی حکومت ہی قایم تھی اس لئے مذہب بھی سنی تھا مگر ملتان اسمٰعیلی انقلاب کا شکار ہو چکا تھا اور وہاں حکومت کے ساتھ ساتھ مذہب بھی شیعی (اسماعیلی) ہو چکا تھا۔ چنانچہ مقدسی اقلیم سندھ کی مذہبی حالت کے متعلق لکھتا ہے:

مذاھبھم: أکثرھم أصحاب الحدیث ورأیت القاضی ابا محمد المنصوری داؤدیا اماماً فی مذھبه وله تدریس وتصانیف قد صنف کتباً عدة حسنة واھل الملتان شیعة یھوعلون فی الأذان ویثنون فی الاقامة ولا تخلو القصبات من فقہاء علی مذھب ابی حنیفة ولیس به مالکیة ولا معتزلہ ولا عمل للحنابلہ۔ انھم علی طریقة مستقیمة ومذاھب محمودة وصلاح وعفة قد اراحھم اللہ من الغلو والعصبیة والھرج والفتنة۔[۲]

مذہب: اکثر لوگ اہلِ حدیث ہیں۔ میں نے قاضی ابو محمد منصوری کو دیکھا جو داؤدی مذہب کے امام ہیں۔ درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت سی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اہلِ ملتان شیعہ ہیں جو اذان میں حی علی خیر العمل کہتے ہیں اور اقامت میں دو دو بار کلمات ادا کرتے ہیں کوئی شہر حنفی فقہاء سے خالی نہیں ہے۔ سندھ میں نہ مالکی ہیں نہ معتزلہ اور نہ حنبلیوں کا اثر ہے۔ لوگ سیدھے راستہ پر ہیں۔ نیک مذاہب کا اتباع کرتے ہیں۔ صلاح وعفت کے ساتھ متصف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں غلو فی الدین، تعصب، ہرج اور فتنہ پردازی سے عافیت میں رکھا ہے۔

---

[۱] کتاب صورۃ الارض لابن حوقل صفحہ ۳۲۲ [۲] ایضاً صفحہ ۳۲۲

اس کے ساتھ اخلاقی حالت بھی بہت اچھی تھی علم کا چرچا تھا۔ مقدسی خاص سندھ (منصورہ) کے بارے میں لکھتا ہے:

المنصورة هی قصبة السند	منصورہ سندھ کا پایہ تخت ہے .....
...... لهم مروة ولا سلام عندهم طراوة والعلم واهله كثير والتجارة ثم مفيدة ولهم ذكاء وفطنة ومعروف وصدقة[1]	... اہل منصورہ میں شرافت ہے اور ان کے یہاں اسلام سرسبز و شاداب ہے علم اور علماء کا بڑا چرچا ہے۔ تجارت کا مرکز ہے۔ باشندے ذہین ہوشیار اور نیکوکار ہیں۔

ملتان کی اخلاقی حالت کے بارے میں لکھتا ہے:

"ليس عندهم زنا ولا شرب خمر ومن ظفروا به يفعل ذلك قتلوه او حدّوه ولا يكذبون فی بيع ولا يبخسون فی كيل ولا يخسرون فی وزن يحبون الغرباء[2]	ان میں زناکاری اور مےخواری بالکل نہیں ہے۔ اگر کسی کو ایسا کرتے پکڑ لیتے ہیں تو مار ڈالتے ہیں یا حد شرعی جاری کرتے ہیں خرید و فروخت میں جھوٹ نہیں بولتے، ناپ میں کمی نہیں کرتے، تول میں کم نہیں تولتے۔ مسافروں سے محبت کرتے ہیں۔

مدارس و تعلیم | ابن حوقل کہتا ہے کہ اہل ملتان علوم قرآن بالخصوص قرأت سبعہ کا شوق رکھتے ہیں نیز فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل کے شائق ہیں۔ مقدسی کہتا ہے کہ اہل منصورہ کے یہاں علم اور علماء کی بڑی کثرت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی میں سندھ کی تعلیمی حالت بہت اچھی تھی۔ دنیائے اسلام کے دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی کثیر تعداد میں مدارس تھے چنانچہ مقدسی منصورہ کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ علم اور تجارت کا مرکز ہے۔ اس نے یہاں کے مدارس میں سے ایک مدرسہ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ یہ منصورہ کے قاضی ابو محمد داؤدی کا مدرسہ تھا جس میں وہ خود درس دیتے تھے [" وله تدريس "]

مشاہیر اہل علم | اس علم کی فراوانی اور تعلیم کے رواج نے بہت سے مشاہیر اہل علم پیدا کئے جن کی

---

[1] احسن التقاسیم ص۴۷۹ [2] ایضاً ص۴۸۰

جلالتِ قدر سے متاثر ہو کر تذکرہ نویسوں نے دنیائے اسلام کے فحول علمار کے دوش بدوش اُن کا ذکر کیا۔ سندھ میں متعدد شہر تھے لیکن دو شہر بہت زیادہ مردم خیز تھے: دیول اور منصورہ دیول (دیبل) ایک قدیم ساحلی شہر تھا جسے سنہ ۹۲ھ میں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ منصورہ ایک جدید آبادی تھی جس کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد بن قاسم نے سنہ ۱۲۰ھ کے قریب ڈالی تھی بعد میں یہ شہر سندھ زیریں کا پایۂ تخت قرار پایا۔

تاریخ وتراجم کی کتابوں نے دیول کے حسب ذیل علمار کا تذکرہ محفوظ رکھا ہے۔

ابو جعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی: سمعانی نے اُن کے متعلق لکھا ہے۔

"ساکن مکہ یروی کتاب التفسیر لابن عیینہ عن ابی عبید اللہ سعید بن عبد الرحمٰن المخزومی وکتاب البر والصلہ لابن المبارک عن ابی عبد اللہ الحسین بن الحسن المروزی عنہ یروی عن عبد الحمید بن صبیح ایضاً"[1]

مکہ معظمہ میں جاکر متوطن ہو گئے تھے۔ ابو عبید اللہ سعید بن عبد الرحمٰن المخزومی سے ابن عیینہ کی کتاب التفسیر کی اور ابو عبد اللہ حسین بن حسن مروزی سے ابن المبارک کی کتاب البر والصلہ کی روایت کی انھوں نے عبد الحمید بن صبیح سے بھی روایت حدیث کی ہے۔

اُن کے شاگردوں میں تین شخص مشہور ہیں۔ ابو الحسن احمد بن ابراہیم بن فراس المکی، ابو بکر محمد بن ابراہیم بن علی بن المقری اور خود اُن کے ہم وطن ابو العباس احمد بن عبد اللہ بن سعید الدیبلی۔

ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الدیبلی: سابق الذکر کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے موسیٰ بن ہارون اور محمد بن علی الصائغ وغیرہما سے علم حدیث حاصل کیا۔

ابو القاسم شعیب بن محمد بن احمد بن شعیب بن بزیع بن سواد الدیبلی: ابن قطعان الدیبلی کے نام سے مشہور ہیں۔ سمعانی نے اُن کے متعلق لکھا ہے:

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی صفحہ ۲۳۶ ب

"قدم مصر وحدث بها قال ابو سعید بن یونس کتبت عنہ"[1]

وہ مصر میں آئے اور حدیث کا درس دیا۔ ابو سعید بن یونس کا کہنا ہے کہ میں نے اُن سے حدیث لکھی ہے

علی بن موسیٰ الدیبلی: دیبل کے مشاہیر محدثین میں سے تھے۔ ان کے تلامذہ میں سب سے مشہور اُن کے ہم وطن خلف بن محمد دیبلی تھے

خلف بن محمد الموازینی الدیبلی: سمعانی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے

"نزل بغداد وحدث بها عن علی بن موسی الدیبلی روی عنہ ابو الحسن احمد بن محمد بن عمران بن الجندی"[2]

بغداد میں آئے اور علی بن موسیٰ دیبلی کی مرویات روایت کیں۔ اُن سے ابو الحسن احمد بن محمد بن عمران بن الجندی نے روایت کی۔

ابو العباس محمد بن محمد بن عبد اللہ الوراق الدیبلی: سمعانی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے:

"الزاهد وکان صالحاً عالماً ...... توفی فی شهر رمضان سنہ ۳۴۶ صلی علیہ ابو عمرو بن نجید"[3]

زاہد صالح اور عالم تھے ...... رمضان ۳۴۶ھ میں وفات پائی ابو عمرو بن نجید نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی

ابو العباس محمد نے ابو خلیفہ فضل بن خباب جمحی، جعفر بن محمد بن حسن فریابی، عبدان بن احمد بن موسیٰ عسکری، محمد بن عثمان بن ابی سوید بصری اور اُن کے معاصرین سے علم حدیث حاصل کیا۔ وہ حاکم ابو عبد اللہ کے استاد تھے۔

ابو العباس احمد بن عبد اللہ بن سعید الدیبلی: سمعانی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے

"من الغرباء الرحال المتقدمین فی طلب العلم ومن الزهاد الفقراء العباد سکن نیسابور ایام ابی بکر

طلب علم میں بڑے سفر کرنے والوں میں سے تھے، زاہد و عابد فقراء میں محسوب ہوتے تھے۔ امام ابوبکر بن خزیمہ کے زمانہ میں نیشاپور میں متوطن ہو گئے تھے جسن بن یعقو

[1] کتاب الانساب للسمعانی ط ۲۳۶ [2] ایضاً [3] ایضاً

محمد بن اسحٰق ابن خزیمہ وھو خانکاہ الحسن بن یعقوب الحدادی تزوج فی المدینۃ الداخلۃ وولد لہ وکان البیت فی الخانکاہ برسمہ ویاوی الی اھلہ فی المدینۃ بعد ان صلی الصلوٰۃ فی المسجد الجامع وکان یلبس الصوف وربما مشی حافیا[1]

علادی کی خانقاہ میں (؟) انھوں نے اندرونِ شہر میں شادی کر لی تھی اور اولاد بھی ہوئی تھی۔ مکان خانقاہ ہی میں تھا۔ جامع مسجد میں نماز پڑھتے۔ پھر گھر میں آکر اہل وعیال کے ساتھ رہتے۔ پشمینہ پوش تھے اور اکثر برہنہ پا سفر کرتے۔

وہ علم حدیث کے بڑے مستعد طالب علم تھے۔ اس غرض سے انھوں نے دور دراز شہروں کا سفر کیا۔ بصرہ میں ابو خلیفہ قاضی سے، بغداد میں جعفر بن محمد فریابی سے، مکہ معظمہ میں مفضل بن محمد جندی اور محمد بن ابراہیم دیبلی سے، مصر میں علی بن عبد الرحمٰن اور محمد بن زبان سے، دمشق میں ابو الحسن احمد بن عمیر بن جوصا سے، بیروت میں ابو عبد الرحمٰن مکحول سے، حران میں ابو عروبہ حسین بن ابی معشر سے، تستر (شوستر) میں احمد بن زہیر تستری سے، عسکر مکرم میں عبدان بن احمد الحافظ سے، نیشاپور میں ابو بکر محمد بن اسحٰق بن خزیمہ سے، اور اسی طرح دوسرے محدثین سے۔ حاکم ابو عبد اللہ الحافظ اُن کے بھی شاگرد ہیں۔ رجب ۳۴۳ھ میں شہر نیشاپور کے اندر وفات پائی اور مقبرہ حیرہ میں مدفون ہوئے۔

دیبل کے بعد دوسرا مردم خیز شہر منصورہ تھا جو اگرچہ بنا آباد ہوا تھا مگر تجارت کے ساتھ ساتھ علم کا بھی مرکز تھا۔ یہاں کی خاک سے بھی مشاہیر علمائے حدیث پیدا ہوئے۔

ابو العباس احمد بن محمد القاضی المنصوری: سمعانی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے

سکن العراق و فارس ویکنی بابی العباس کان اماما علی مذھب

عراق و فارس میں جاکر آباد ہو گئے تھے، ان کی کنیت ابو العباس تھی۔ داؤد ظاہری کے مذہب کے امام تھے

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی ص ۲۳۶

داؤد الاصبهانی سمع الاثرم وطبقته — اثرم اوران کے اقران سے حدیث کی سماعت کی تھی

روی عنه الحاکم ابو عبد الله الحافظ۔"[۱] — حاکم ابو عبد اللہ الحافظ اُن کے شاگرد تھے۔

ابن الندیم نے الفہرست میں اُن کا نسب نامہ بدینطور دیا ہے، ابو العباس احمد بن محمد بن صالح المنصوری اور لکھا ہے:

"علی مذهب داؤد من افاضل — داؤدی مذہب کے مشاہیر فضلا میں سے تھے۔ بہت سی

الداؤدیین وله کتب جلیلة حسنة — جلیل القدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً کتاب المصباح

کبار منها کتاب المصباح کبیر، کتاب — (جو ضخیم ہے)، کتاب الہادی، کتاب النیر۔

الهادی، کتاب النیر۔"[۲]

ابو العباس احمد بن صالح التمیمی القاضی المنصوری: سمعانی نے انساب میں احمد بن محمد القاضی المنصوری (مذکور الصدر) کے فوراً بعد ابو العباس احمد بن صالح التمیمی القاضی المنصوری کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دوسرے بزرگ ہیں۔ بہر حال ان کے بارے میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"من اهل منصورة سکن العراق — منصورہ کے رہنے والے تھے مگر عراق میں متوطن ہو گئے

وکان اظرف من رایت من العلماء — تھے۔ جن علماء سے میں ملا ہوں اُن میں سب سے زیادہ

سمع بفارس ابا العباس بن الاثرم — ظریف اور طباع تھے۔ فارس میں ابو العباس بن اثرم

وبالبصرة اباروق الهمدانی۔"[۳] — سے اور بصرہ میں ابو روق ہمدانی سے علم حدیث حاصل کیا

قاضی ابو محمد المنصوری: بشاری مقدسی نے احسن التقاسیم میں ان کے متعلق لکھا ہے:

رائیت القاضی ابا محمد المنصوری — میں نے قاضی ابو محمد منصوری سے ملاقات کی۔ وہ

داؤدیا اماما فی مذهبه وله — داؤدی مذہب کے امام ہیں۔ اُن کا ایک مدرسہ ہے اور

تدریس وتصانیف قد صنف — وہ صاحب تصانیف ہیں۔ انھوں نے بہت سی

کتباً عدة حسنة۔"[۴] — اچھی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

---

[۱] کتاب الانساب للسمعانی ص۵۴۵ ب [۲] الفہرست لابن الندیم ص... [۳] کتاب الانساب ص۵۴۵ ب
[۴] احسن التقاسیم ص۴۸۱

مولانا عبد الحئی نے نزہۃ الخواطر میں ان تینوں منصوریوں کو ایک ہی بتایا ہے۔ بظاہر مقدسی کے قاضی ابو محمد منصوری اور سمعانی کے احمد بن محمد القاضی المنصوری کے مذہب اور تبحر فی علم الحدیث کی تفصیلات متشابہ ہیں اور اسی طرح مقدسی کے قاضی ابو محمد منصوری اور ابن الندیم کے ابو العباس احمد بن محمد بن صالح المنصوری میں اس اعتبار سے مشابہت ہے کہ دونوں بہت سی عمدہ کتابوں کے مصنف ہیں مگر اولاً تو کنیتیں مختلف ہیں۔ سمعانی اور ابن الندیم کے یہاں ابو العباس ہے اور مقدسی کے یہاں ابو محمد۔ ثانیاً سمعانی نے لکھا ہے کہ وہ عراق و فارس میں متوطن ہو گئے تھے اور مقدسی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انھیں سندھ ہی میں درس و تدریس میں مشغول پایا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ شخصیتیں ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابو محمد عبد اللہ بن جعفر بن مرۃ المنصوری المقری: حسب تصریح سمعانی انھوں نے حسن بن مکرم اور ان کے اقران سے علم حدیث حاصل کیا۔ حاکم ابو عبد اللہ الحافظ ان کے بھی شاگرد تھے [۱]۔

یہ فضلاء تو سندھ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے لیکن دار الخلافہ سے بھی اہل علم آ آ کر سندھ کے علمی خاندانوں میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ ابن الاثیر ۲۸۳ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:

"وفیھا فی شوال مات محمد بن ابی الشوارب القاضی وکانت ولایتہ القضاء بالمدینۃ المنصورۃ ستۃ اشھر" [۲]	اور اسی سال شوال کے مہینے میں قاضی محمد بن ابی الشوارب نے وفات پائی وہ منصورہ میں چھ مہینے قاضی رہنے پائے تھے۔

قاضی محمد بن ابی الشوارب ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو عرصے تک مرکزِ خلافت میں عہدۂ قضا پر فائز رہا۔ محمد بن ابی الشوارب اگرچہ زیادہ عرصے سندھ میں زندہ نہ رہے مگر انھوں نے وہاں کے علمی خاندانوں میں ایک خاندان کا اضافہ کر دیا جو اپنی عالی نسبی کی بنا پر سندھ کے حکمراں خاندان کا کفو سمجھا جاتا تھا جیسا کہ مسعودی نے لکھا ہے [۳]۔

دوسرا مشہور خاندان جس کے رشد و ہدایت سے عرصے تک اہلِ ہند فیض یاب ہوتے رہے شیخ

---

[۱] کتاب الانساب [illegible] ب [۲] کامل ابن اثیر جلد ششم ص [۳] مروج الذہب جلد اول [illegible]

بہاءالدین زکریا ملتانی کا ہے جو پہلے سندھ میں آباد تھا بعد ازاں ملتان میں منتقل ہو گیا۔

علم کلام سندھ کا عام مذہب اہل السنت والجماعت اور حنفیت تھا۔ منصورہ میں داؤد ظاہری کا مذہب بھی بہت مقبول ہوا ۔ سنہ ۳۴۲ھ سے یہاں شیعیت بالخصوص زیدیہ فرقے کی اشاعت ہوئی اسی زمانے میں خارجی بھی آئے مگر انھیں کوئی کامیابی نہ ہوئی سنہ ۲۷۰ھ سے قرمطی (اسماعیلی) مذہب کی خفیہ طور پر اشاعت ہونے لگی ۔ بعد میں مملکتی سرپرستی میں ملتان کے اندر اس کی تبلیغ ہونے لگی جس کے انسداد کے لئے محمود غزنوی نے وہاں حملہ کیا ۔ اس مذہبی تکثر و تعدد کے نتیجے میں علم کلام کی ترقی فطری تھی مگر تاریخ نے متکلمین سندھ کا کوئی تذکرہ محفوظ نہیں رکھا البتہ بزرگ بن شہریار کی تصریح سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۲۷۰ھ کے قریب بعہد امیر عبداللہ بن عمر بن عبد العزیز الہباری سندھ میں علم کلام (عقائد اسلامیہ) کی پہلی کتاب لکھی گئی ۔ اُس سے ابو محمد حسن بن حمویہ نے کہا تھا

"كنت بالمنصورة في سنة ثمان وثمانين
ومائتين وحدثني بعض مشائخها
ممن يوثق به ان ملك الرا هو اكبر ملوك
بلاد الهند والناحية التي هو بها بين
قشمير الاعلى وقشمير الاسفل وكان
يسمّى مهروك بن رائق كتب في سنة
سبعين ومائتين الى صاحب المنصورة
وهو عبد الله بن عمر بن عبد العزيز
يسأله ان يفسر له شريعة الاسلام
بالهندية فاحضر عبد الله هذا رجلا
كان بالمنصورة اصله من العراق
حد القريحة حسن الفهم شاعرا فطنا

میں سنہ ۲۸۸ھ میں منصورہ میں تھا اور وہاں کے ایک
قابلِ اعتماد عالم نے مجھ سے ذکر کیا کہ الرور کا بادشاہ
جو ہندوستان کے بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ
ہے اور اُس علاقے کے راجاؤں میں جو کشمیر بالا اور کشمیر
زیریں کے درمیان واقع ہے سب سے طاقتور ہے اور
جس کا نام مہروک بن رائق (؟) ہے اُس نے سنہ ۲۷۰ھ
میں منصورہ کے والی عبداللہ بن عمر بن عبد العزیز کو
لکھا اور خواہش کی کہ ہندی زبان میں اُس کے لئے
شریعت اسلام کی تفصیل بیان کر دے ۔ اس پر عبداللہ
بن عمر نے ایک شخص کو بلایا جو رہتا تو منصورہ میں تھا
مگر اصل باشندہ عراق کا تھا اور جو بڑا ذہین اور فہیم
تھا ۔ اس کے ساتھ شاعر بھی تھا اور چوں کہ ہندوستان میں

نشأ ببلاد الهند وعرف لغاتهم على اختلافها فعرفه ما سأله ملك الرا فعمل قصيدة وذكر فيها ما يحتاج اليه وانفذها اليه فلما قرئت على ملك الرا استحسنها وكتب الى عبد الله يسأله حمل صاحب القصيدة فحمله اليه واقام عنده ثلث سنين ثم انصرف عنه"[1]

اُس کی پرورش ہوئی تھی لہذا یہاں کی مختلف زبانوں سے واقف تھا۔ پس الرور کے راجہ کی خواہش اُسے بتائی گئی تو اُس نے ایک قصیدہ تیار کیا اور (شریعت اسلام) کی جملہ ضروریات کا اُس میں ذکر کیا۔ عبداللہ نے اس قصیدہ کو راجہ کے پاس بھیج دیا۔ جب یہ قصیدہ راجہ کے سامنے پڑھا گیا تو اُس نے بہت پسند کیا اور عبداللہ کو لکھا کہ اس شاعر کو اُس کے دربار میں بھیج دیا جائے۔ عبداللہ نے اُس شاعر کو اُس کے پاس بھیج دیا اور وہ وہاں تین سال رہا پھر واپس آگیا۔

جب وہ عراقی شاعر لوٹ کر آیا تو والیِ سندھ نے راجہ کے بارے میں اُس سے دریافت کیا۔ شاعر نے جو تفاصیل بتائیں وہ بڑی دلچسپ ہیں۔

"اُس نے کہا میں اُسے اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ اُس کا دل اور زبان دونوں اسلام لا چکے ہیں مگر نعمتِ جاہ کے زوال اور سلطنت چھن جانے کے اندیشے سے وہ علی الاعلان اسلام کا اظہار نہیں کرسکتا منجملہ اور حکایات کے اُس نے یہ واقعہ بتایا کہ راجہ نے اُس سے قرآن حکیم کی ہندی زبان میں تفسیر بیان کرنے کی فرمائش کی، شاعر نے اُس کی تعمیل کی شاعر نے کہا جب میں سورۂ یٰسین کی تفسیر تک پہنچا اور میں نے اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کی "من یحیی العظام وھی رمیم۔ قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم" اُس وقت وہ سونے کے تخت پر بیٹھا تھا جو بیش قیمت جواہرات اور موتیوں سے آراستہ تھا تو اُس نے مجھ سے دوبارہ اُس کی تفسیر کے لئے کہا جب میں دوبارہ اُس کی تفسیر کرچکا تو وہ اپنے تخت سے اُترا اور زمین پر کھوڑی دور چلا جو پانی چھڑکنے کی وجہ سے تر تھی پس اُس نے اپنا رخسارہ زمین پر رکھ دیا اور اتنا رویا کہ وہ رخسارہ گرد آلود ہوگیا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ بے شک

---

[1] عجائب الہند لبزرگ بن شہریار ص ۳

یہی پروردگار اور قابلِ پرستش معبود ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کوئی چیز اُس کے مانند نہیں ہے۔ (اس کے بعد) اُس نے اپنے لئے ایک علیحدہ مکان بنوایا اور لوگوں سے ظاہر کیا کہ وہ وہاں تنہائی میں مہماتِ ملک پر غور کیا کرتا ہے۔ حالانکہ وہ وہاں پوشیدہ طور پر نماز پڑھا کرتا تھا۔[1]

اسلام تو اُس کی قسمت میں تھا ہی مگر اس توفیق کا سبب ظاہر عراقی شاعر کی یہ منظوم کتاب تھی۔ غرض سندھی زبان میں یہ پہلی اسلامی تصنیف تھی جس کا تذکرہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ اس طرح عقائد اسلامیہ پر پہلی کتاب ہندوستان میں ۲۷۰ھ میں تصنیف کی گئی اور اس کے ساتھ سرزمین ہند پر علم کلام کا آغاز ہوا۔

سمعانی نے "کتاب الانساب" میں علمائے سندھ کا ایک مختصر تذکرہ دیا ہے۔ ان میں ایک متکلم بھی ہیں اور چونکہ اس تذکرے میں صرف یہی اکیلے سندھی متکلم ہیں لہٰذا قیاس مقتضی ہے کہ یہ متکلمین اسلام میں ایک نمایاں شہرت و اہلیت رکھتے ہوں گے کیونکہ دنیائے اسلام کے عمومی تذکروں میں صرف انھیں علماء کو بار مل سکتا تھا جو غیر معمولی ذہانت و فطانت رکھتے ہوں۔ اس سندھی متکلم کا نام "ابو نصر الفتح بن عبد اللہ" ہے۔ سمعانی نے لکھا ہے:

"الفقیہ ابو نصر الفتح بن عبد اللہ السندی کان فقیہاً متکلماً وکان مولیٰ لآل الحکم ثم عتق وقرأ الفقہ والکلام علی ابی علی الثقفی"۔[2]

فقیہ ابو نصر فتح بن عبد اللہ: فقیہ اور متکلم تھے۔ وہ پہلے آلِ حکم کے غلام تھے پھر آزاد ہو گئے انھوں نے ابو علی ثقفی سے فقہ اور کلام کی تعلیم حاصل کی۔

یاقوت نے معجم البلدان میں سندھی علماء کا تذکرہ اور بھی سرسری طور پر کیا ہے پھر بھی ابو نصر الفتح بن عبد اللہ اور اُس کے متکلم ہونے کا ذکر ضرور کیا ہے[3] جس سے اُس کی شہرت و علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سمعانی نے اُس کا سالِ وفات نہیں دیا مگر چونکہ ابو نصر الفتح بن عبد اللہ ابو ثقفی کے شاگرد تھے جو ابن سریج المتوفی ۳۰۶ھ کے معاصر تھے لہٰذا ابو نصر کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا نصفِ اول سمجھا جا سکتا ہے۔

---

[1] عجائب الہند ص ۳ [2] کتاب الانساب ص ۳۱۵ [3] معجم البلدان جلد خامس ص ۱۵۲

بہرکیف ابونصر فتح بن عبداللہ عمرو بن عبید بن باب کے بعد سب سے قدیم ہندوستانی متکلم ہیں جن کا حال ہم تک پہنچا ہے۔ سمعانی نے عبداللہ بن حسین سے اُس کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ روایت کیا ہے۔

"ایک دن ہم ابونصر سندی کے ساتھ جا رہے تھے ساتھ میں شاگردوں کا مجمع تھا اور ہم کیچڑ میں سے گزر رہے تھے۔ وہاں ایک شریف عرب بدمست پڑا تھا۔ جب اُس نے ہماری طرف دیکھا تو ابونصر نے اُس کی بوئے شراب سونگھ لی۔ اُس بدمست عرب نے کہا اے غلام ایک طرف ہو کر چل تو دیکھتا ہے کہ میں تو زمین پر پڑا ہوں اور تو اس شان سے جا رہا ہے کہ تیرے پیچھے تیرے معتقدین کا یرجمِ غفیر ہے۔ ابونصر نے کہا کہ اے شریف تو اس کا سبب بھی جانتا ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ میں نے تیرے بزرگوں کا طریقہ اختیار کیا اور تو نے میرے بزرگوں کا"[1]

---

[1] کتاب الانساب ص۳۱

حسّان بن ثابت اور اُن کی شاعری

از
(جناب چوہدری غلام احمد صاحب ایم - اے لکچرار اسلامیہ کالج لائل پور)

(۲)

اسلام اور شعر و شاعری ظہورِ اسلام کے بعد عربی شاعری نے نئے بال و پر کھولے - دورِ جاہلیت جہالت و عصبیّت کا مظہر اور ان کی شاعری جذباتِ جنگ و جدال کی آئینہ دار تھی - افرادِ خاندان کی کثرت اور نسلی نجابت پر اترانا ان کی شاعری کا محبوب ترین موضوع تھا - جب اسلام نے جملہ اقوامِ عالم کو اسلامی اخوت میں جکڑ دیا اور پرانے بغض و عناد مبدّل بالفت و مودّت ہوئے، قومی فخر و مباہات کو پاؤں تلے روند گیا تو عربی شاعری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی یہی وجہ ہے کہ قرآن نے شعراء کے بارہ میں "والشعراء یتبعھم الغاوٗن" کا فتویٰ دیا اور حدیث میں ارشاد ہوا لَاَنْ یَمتلِیَ جوفُ اَحدِکم قیحًا خیرٌ لہ مِنْ اَنْ یمتلِیَ شِعرًا -

اللہ تعالیٰ نے رسولِ مقبولؐ کی شان میں فرمایا مَا عَلَّمْنَاہُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ -

اگرچہ اسلام نے مطلقاً شعر کی کبھی مذمت نہیں کی بلکہ شعر کی خوبی و برائی اس کے مضمون کی حیثیت سے قرار دی - چنانچہ صحیح بخاری میں مرفوعاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے قالَ رسول اللہ صلعم الشعر بمنزلۃ الکلام حسنہٗ کحسنِ الکلام وقبیحہٗ کقبیح الکلام - یعنی شعر بمنزلہ کلام کے ہے اچھا شعر اچھے کلام کے مانند اور بُرا شعر بُرے کلام کی طرح ہے -

دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا "اِنَّ من الشعر لحکمۃ واِن من البیان لسحرًا" یعنی خطابت اصل میں حکمت و موعظت ہے لیکن کبھی کبھی حدودِ شعر میں داخل ہو جاتی ہے اور سحر بن جاتی ہے اور کبھی کوئی شعر حدودِ خطابت میں آ جاتا ہے اور سحر سے حکمت بن جاتا ہے -

اگر اسلام کی حمایت و مدافعت شعر کے ذریعہ سے کی جائے تو یہ معیوب نہیں - ایسے اشعار

آپ اکثر سنا کرتے اور شاعر کی حاجت روائی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے جس کے باپ نضر نامی کو آپ نے قتل کروا دیا تھا خدمت مبارک میں حاضر ہو کر چند اشعار پڑھے تو آپ نے فرمایا اگر یہ اشعار میں پہلے سنتا تو اسے ہرگز قتل نہ کرواتا۔ کعب بن زہیر کا خون آپ نے ہدر فرما دیا تھا لیکن جب انھوں نے حاضرِ خدمت ہو کر اپنا مشہور قصیدہ بانت سعاد عرض کیا تو نہ صرف ان کا گناہ معاف کیا بلکہ چادر مبارک بھی عطا فرمائی۔

جب عبداللہ بن زبعری۔ عمرو بن العاص اور ابوسفیان نے مسلمانوں کی ہجو کہنا شروع کی تو آپ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔ کیا جن لوگوں نے اسلام کی مدد اسلحہ سے کی ہے وہ زبان سے اُس کی مدافعت نہیں کر سکتے۔ اس پر حضرت حسان نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسجد نبوی میں ان کے لئے منبر بچھایا جاتا تھا رسولِ مقبول فرمایا کرتے تھے کہ تمھاری ہجو ان کے لئے تیر سے زیادہ کارگر ہے۔

شعبی سے مروی ہے کہ حسان بن ثابت نے جناب رسالت مآب کے پاس حاضر ہو کر عرض کی کہ ابوسفیان نے آپ کی ہجو کی ہے اور نوفل بن حارث اور دیگر کفار قریش نے اس کی مدد کی ہے اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ان سب کی ہجو کہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرے اور ان کے درمیان فرق کیسے کرو گے کیوں کہ ہم خاندانی لحاظ سے ایک ہیں۔ حسان نے کہا کہ میں آپ کو ان سے اس طرح جدا کروں گا جس طرح بال آٹے سے نکال لیتے ہیں۔ آپ نے انھیں ہجو کہنے کی اجازت دی۔

ایک دفعہ آپ نے نزولِ باراں کے لئے دعا مانگی۔ جب بارش نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا اگر ابوطالب زندہ ہوتے تو اس وقت خوش ہوتے۔ پھر آپ نے فرمایا کوئی ان کے اشعار سنائے۔ حضرت علی نے فرمایا کہ شاید آپ کی مراد ابوطالب کے ان اشعار سے ہے اور پھر اشعار پڑھنے شروع کئے۔

وَابیض یُستسقی الغمام بوجھہ ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

یلوذُ بہ الھُلّاک من آل ھاشم فھم عندہ فی نعمۃٍ و فواضل

یہ قصیدہ ابوطالب کا ہے جس میں سو سے زیادہ اشعار ہیں اور جناب رسولِ مقبول کی تعریف سے

پُر ہے۔

ان آثار و دلائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ جناب رسولِ مقبولؐ نے بذاتِ خود کوئی شعر موزوں نہیں کیا۔ تاہم آپ عمدہ اشعار کو پسند فرماتے۔ اگر کوئی شعر پسند آجاتا تو شاعر کو دعائے نیک دیتے۔ چنانچہ نابغہ جعدی کو آپ نے دعا دی تھی۔ لا فضّ اللّٰہ فاک۔ تیرے منہ کو شکستگی لاحق نہ ہو۔

یہ سب کچھ اس وہم کے ازالہ کے لئے عرض کیا گیا کہ شاید اسلام مطلقاً شعر کو نہیں چاہتا اور شاعری اسلام کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آغازِ اسلام میں شاعری کی مقبولیت و محبوبیت تدریجی طور پر کم ہوتی گئی اور خطابت اس کا مقام حاصل کرتی گئی۔ کیوں کہ اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے خطابت شاعری سے کہیں زیادہ مفید ہے۔

ان ہی احوال و ظروف کا تقاضا تھا کہ حضرت لبید نے جو اصحاب معلقات میں سے ہیں اسلام لانے کے بعد شاعری یک قلم چھوڑ دی۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کے اسلام کے بعد کا کلام سننا چاہا تو حضرتِ لبید نے سورۂ بقر لکھ بھیجی اور لکھا أبدلنی اللّٰہ ہذا فی الاسلام مکان الشعر۔ قرآن کی حد سے بڑھی ہوئی فصاحت و بلاغت اور معجزانہ اسلوب بیان نے کفار کو اس حد تک مبہوت کیا کہ کوئی آپ کو شاعر کہتا کوئی ساحر و کاہن بتاتا کہیں سے مجنوں کا لقب ملتا۔ لیکن جب توفیقِ ربانی سے یہ بات ان کے ذہن نشین ہو گئی کہ فی الواقع یہ کسی انسان کا کلام نہیں نہ وہ شعرِ شاعر ہے اور نہ سجع کاہن۔ دنیا کا بلیغ ترین انسان اس کے مانند ایک چھوٹی سی سورت بھی نہیں بنا سکتا تو وہ مسلمان ہوتے گئے۔ اب بجائے شعر و شاعری کے قرآن کی حفظ و تلاوت اور اس کے معانی و مطالب پر غور و فکر کرنے میں اپنا سارا وقت صرف کرنے لگے۔ البتہ شعر و شاعری کی اہمیت فہم قرآن و حدیث کے لئے ہمیشہ باقی رہی اور اس لئے شعر گوئی کے بجائے شعر فہمی اور ادب و عربیت کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے۔

اذا اعیاکم تفسیر آیۃ من کتاب اللّٰہ	جب تمھیں کسی آیت کی تفسیر میں دقت پیش آئے تو اس کا
فاطلبوہ فی الشعر فانہ دیوان العرب	مطلب شعر سے حل کرو کیوں کہ شعر عرب کا دیوان ہے۔

حضرت عمرؓ اشعارِ جاہلیت کے حفظ کرانے کے لئے اکثر رغبت دلایا کرتے تھے آپ فرماتے۔

اَرْوُوا مِنَ الشِّعرِ اَعَفَّہٗ عمدہ شعر پڑھا کرو۔

آپ نے تمام اضلاع میں یہ حکم بھیجا تھا۔ عَلّموا اولادکم العوم والفروسیۃ ورَوُّوْھُم ما سار من المَثَلِ وحسُنَ من الشِّعرِ۔ اپنی اولاد کو تیرنا اور شہسواری سکھاؤ۔ اور ضرب الامثال اور عمدہ شعر یاد کراؤ۔

لیکن یہ سب دلچسپیاں مذکورہ بالا غرض کے لئے تھیں اور اگر کوئی شاعر جادۂ اعتدال سے ذرا بھی منحرف ہوتا تو اسے سزا دیتے۔ تشبیب میں شریف عورتوں کا نام علانیہ لانا معیوب خیال نہیں کیا جاتا تھا آپ نے اس رسم کو یک دم مٹا دیا اور اس کے لئے سخت سزا مقرر کی۔ ہجو گوئی کو جرم قرار دیا اور حطیئہ مشہور ہجو گو کو اس جرم میں قید کیا۔

اسی ماحول میں حضرت حسان آنکھ کھولتے ہیں اور عجب یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاری کے برعکس ان کا سر چشمۂ شاعری خشک نہیں ہوتا۔ حالانکہ لبید جیسے شاعر اس پیشہ کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ حسان کا یہ کمال ہی کیا کم ہے کہ وہ جاہلیت میں بھی شاعر تھے اور مشرف باسلام ہونے کے بعد بھی اپنے اس شغل کو جاری رکھا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اپنی سابقہ روایات کے برقرار رکھنے میں کسی کی پرواہ نہ کی۔

ایک مرتبہ مسجد نبوی میں شعر پڑھنے لگے تو عمرؓ فاروق نے ٹوکا برملا کہا کہ میں تو اس وقت بھی شعر پڑھا کرتا تھا جب کہ آپ سے بہتر (نبی اکرم صلعم) مسجد میں تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔

یہ درست ہے کہ حسان کا اسلامی دور کا کلام جاہلیت کے تکلّف و تصنّع سے پاک ہے لیکن اس سے معیار کا گرنا کیسے لازم آیا۔ غیر مانوس الاستعمال اور غریب الفاظ کی بھرمار اصمعی ایسے لغوی کے لئے تو دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے مگر عام ذہنوں کے لئے بار اور تکلیف مالا یُطاق ہے۔ پس ان کا یہ الزام کہ حسان کی شاعری اسلامی دور میں جاہلیت کے معیار سے فروتر ہے کسی طرح قرینِ انصاف نہیں اور پھر یہ کہ شاعرانہ کذب بیانی اور مبالغہ آمیزی حسان کے نزدیک شعر کی عمدگی کا معیار نہیں بلکہ اس کی خوبی صداقت و سچائی میں ہے ۔

وللناس فیما یعشقون مذاھبُ۔

وہ نظامی کے ہم نوا نہیں جو اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

در شعر مپیچ و در فنِ او چوں اکذبِ اوست احسنِ او

بلکہ ان کا نقطۂ نظر جداگانہ ہے اور ان کی شاعری کو اسی آنکھ سے دیکھنا چاہئے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

وانّما الشعر لب المرء یعرضہ علی البریّۃ اِن کیساً وان حمقا

وانّ احسن بیتٍ انت قائلہ بیتٌ یقال اِذا انشدتہ صدقا

فرماتے ہیں شعر آدمی کی عقل کا نچوڑ ہے جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنی دانش مندی یا کم عقلی کا ثبوت دیتا ہے۔ تمھارا بہترین شعر وہ ہے کہ جب تو پڑھے تو سننے والا پکار اُٹھے کہ سچ کہا۔

علماءِ ادب کی نظر میں ان کے یہ اشعار عرب کی شاعری کا معیار ہیں۔ جس طرح فارسی شاعری علی العموم احسنِ اوست اکذبِ او کا مصداق ہے۔ اور حسان نے اپنے اس قائم کردہ معیار کا امکانی حد تک تتبع کیا ہے۔

مزید براں موقع اور محل کے اختلاف سے معیارِ بیان کا تبدیل ہونا ضروری ہے ہر جگہ ایک ہی انداز قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی جاہلی شاعر حسان ہو یا کوئی اور پیغمبر صلعم کی مدح گوئی اور مرثیہ خوانی میں کوئی نادر اور اچھوتا اسلوبِ بیان اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ مضمون آفرینی اور جدت داستانِ متاخرین کا حصہ ہے۔ ذرا اعشیٰ کو دیکھئے جو جاہلی دور کا معروف شاعر تھا اور اپنی شاعری اور خوش الحانی کے باعث "صناجۃ العرب" کہلاتا تھا۔ اس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ جس کی یہ تعریف کر دیا کرتا تھا معزز ہو جاتا تھا اور جس کی ہجو کہتا ہمیشہ کے لئے رسوا ہو جاتا۔ لوگ اس کی مدح کے آرزومند اور مذمت سے خائف رہتے۔

اس ضمن میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ محلق نامی عرب میں ایک مفلس اور گمنام شخص تھا۔ اس کی آٹھ نوجوان لڑکیاں تھیں مگر اس کی فاقہ مستی کی وجہ سے کوئی شخص ان سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اعشیٰ اس طرف کہیں آنکلا۔ محلق کی بیوی کو اس کی خبر جو پہنچی تو اس نے اپنے

خاوند کو اس کی دعوت کے لئے کہا۔ محلّق اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا۔ غربت کے باوجود اس کے لئے ایک ناقہ ذبح کی اور شراب سے تواضع کی۔ اعشیٰ نے محلّق کی اولاد کا حال دریافت کیا۔ کہا آٹھ لڑکیاں جوان ہو گئیں اور بر نصیب نہیں ہوتا۔ اعشیٰ نے کہا اچھا ہم اس کی فکر کریں گے تم مطمئن رہو۔ جب سُوق عکاظ کا وقت آیا تو اعشیٰ نے مجمع عام میں ایک قصیدہ محلّق کی مدح میں پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

لعمری لقد لاحت عیونٌ کثیرۃٌ　　　الی ضوء نارٍ فی یفاعٍ تُحرّق

تُشبُّ لمقرورین یصطلیانہا　　　وبات علی النار الندیٰ والمحلّق

قصیدہ ختم ہونے نہیں پایا تھا کہ محلّق کے ارد گرد لوگ جمع ہو گئے۔ اور اس کی تعظیم و تکریم کرنے لگے۔ شرفائے عرب نے آکر لڑکیوں سے شادی کے پیغام دیئے اور وہ جلد معزز خاندانوں میں بیاہی گئیں۔

عربی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اعشیٰ کا یہ قصیدہ فصاحت و بلاغت کے کس بلند ترین مقام پر واقع ہے۔

مگر یہی اعشیٰ جب رسول مقبول کی مدح میں قصیدہ کہتا ہے تو بایں ہمہ دعویٰ بلاغت نعتِ رسول کا حق ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اگرچہ ابوسفیان اس کا یہ قصیدہ کبھی منظرِ عام پر نہیں آنے دیتے بلکہ قریش کو کہتے ہیں۔ یاد رکھو اگر اعشیٰ محمد صلعم کے پاس پہنچ گیا اور اسلام لے آیا تو اپنے شعروں کے ذریعہ سے عرب میں آگ لگا دے گا۔ اس پر سب نے سو اونٹ جمع کر دیئے جن کو ابوسفیان نے اعشیٰ کے پاس بھجوا دیا اور اس طرح اس قصیدہ کی اشاعت سے باز رکھا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ کی مدح کرتے وقت اعشیٰ وہ بلند معیارِ بلاغت قائم نہ رکھ سکا جو محلّق کی ثنا خوانی میں اختیار کیا۔ ایسے نظر آتا ہے کہ اعشیٰ کی شاعری اس تمام جزالت و فخامت سے یکسر عاری ہو گئی جو اس کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اور مدحِ رسول میں وہ ایک عام شاعر کے معیار سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مگر ان دونوں قصائد کا فرق معلوم کرنے کے لئے عربی ادب کا ذوق سلیم چاہیئے ایک سطحی النظر شخص اس گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ فرزدق شاعر گھوڑے پر سوار تھا تو اس نے لبید

کا یہ شعر سنا ؎

وجلا السیول عن الطلول کانّها — زُبُرٌ تجِدّ متونها اقلامہا

گھوڑے سے اتر کر سجدہ ادا کیا۔ لوگوں نے کہا یہ کیا حماقت ہے؟ بولا سجداتِ قرآن کو تم جانتے ہو۔ سجدۂ شعر کو میں پہچانتا ہوں۔ یہاں بھی ایسا ہی ذوق درکار ہے۔ تاکہ دونوں قصائد کا باہمی فرق واضح ہو۔ مطلع یہ ہے ؎

الم تغتمض عیناک لیلۃ ارمدا — وبِتّ کما بات السلیم مُسَهّدا

مندرجہ بالا واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک ہی شاعر کا کلام موقع اور محل کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مثال اور سنئے۔ کعب بن زُہیر عربی کا مسلم شاعر ہے بلکہ بعض ادبار کے نزدیک اس کا پایہ اس کے والد زُہیر سے کسی طرح کم نہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے ؎

لو کنتُ اعجب من شیئٍ لاعجبنی — سعی الفتی وھو مخبوءٌ لہ القدر

یسعی الفتی لامورٍ لیس یدرکھا — فالنفس واحدۃ والھمّ مُنتَشِرٌ

والمرء ما عاش ممدودٌ لہ املٌ — لا تنتھی العین حتی ینتھی الاثر

جب یہی شاعر مدح رسول اللہ میں قصیدہ لکھتا ہے اور کس حال میں لکھتا ہے۔ جب اپنی سوء ادبی کی بنا پر اس کا خون ہدر کیا جاتا ہے اور اپنے گناہ کی معافی طلب کرنے کے لئے آتا ہے۔ مقام اس امر کا مقتضی تھا کہ انتہائی بلیغ الفاظ میں ثناخوانی کر کے آپ کی خوشنودی حاصل کرے گا۔ مگر چند اشعار کے سوا شاعر اس میں کوئی ندرت اور جدت پیدا نہیں کر سکا۔ جو اس کی مدح کو دیگر مادحین سے ممتاز کر دے۔ وہ کہتا ہے ؎

اُنبئتُ ان رسول اللہِ اوعدنی — والعفو عند رسول اللہ مامولٌ

مھلاً ھداک الذی اعطاک نافلۃَ — القرآن فیھا مواعیظٌ و تفصیلٌ

لا تاخُذَنّی باقوال الوشاۃ ولم — اذنب وقد کثُرت فی الاقاویلُ

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اور جاہلی شعراء سے تشبیہاتِ نادرہ اور اچھوتے استعارات کی توقع رکھنا عربی ادب کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ ایک اسلامی شاعر جس کے رگ و پے میں ایمان سرایت کر چکا ہو اور جو کذب و مبالغہ کو منافیِ ایمان سمجھتا ہو پیغمبر صلعم کی ثناخوانی میں ایسے غیر فطری مبالغہ اور دروغ بافی کے ارتکاب کو کبھی جائز نہیں سمجھتا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حسان بارگاہِ نبوی میں عقیدت کے پھول نذر کرتے وقت متاخرین ایسی جدت پیدا کریں اور لوازماتِ تہذیب و تمدن کے فقدان کے باوجود آپ کی مدح میں وہ اندازِ بیان اختیار کریں جو آیندہ زمانہ میں امام بُوصیری نے قصیدہ بردہ میں اور امیر الشعراء احمد شوقی نے اپنے مدحیہ قصیدہ میں اختیار کیا۔

ابواب شعر اور حضرت حسان حضرت حسان نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف سخن میں ان کے اشہبِ قلم نے اپنی جولانی و روانی کے جوہر دکھائے ہیں۔ مدح و ہجا فخر و حماسہ مرثیہ و تشبیب غرض جملہ ابوابِ شعر میں حسان کسی جاہلی شاعر سے پیچھے نہیں۔ مگر دورِ اسلام میں ان کی شاعری مدحِ رسول ہجوِ کفار اور نبی کریم اور شہدائے صحابہ کی مرثیہ گوئی میں محدود نظر آتی ہے۔ یہ مختصر مقالہ اپنے دامن میں اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ ان اسالیبِ کلام پر تفصیلی تبصرہ کیا جائے اور اسے مثالوں سے واضح کیا جائے۔ تاہم "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے پیشِ نظر اسے بالکل نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں چند مختصر اشارات سنئے!

مرثیہ رسول اللہ کی مرثیہ خوانی میں ان کے رقت آمیز اور درد بھرے الفاظ کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ قاری اپنے آنسو تھام نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت حمزہؓ جُنیبؓ اور شہدائے بدر و اُحد کی یاد میں وہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہیں کہ پڑھنے والا جگر تھام لیتا ہے رسول اللہ کے مرثیہ میں کہتے ہیں۔

كنت السواد لناظري فعمي عليك الناظر

من شاء بعدك فليمت فعليك كنت أُحاذر

ہجو کفار حضرت حسان کا اصل کارنامہ ان کا وہ ہجویہ کلام ہے جو شعرائے قریش کے جواب میں کہا گیا اور جس میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی طرف سے مدافعت کی گئی ہے اور جو ان کے دیوان کے بڑے حصہ

پر مشتمل ہے۔ عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن مالک انصاری نے بھی یہ خدمت ادا کی مگر اس باب میں حسان کی مساعی جمیلہ سب پر فوقیت لے گئیں۔ بارگاہِ رسالت سے ارشاد ہوا۔ قومک اشد علیہم من نضح النبال فی غلس الظلام (او کما قال)

ابوجہل کی ہجو میں کہتے ہیں ؎

لقد لعن الرحمن جمعاً یقودھم دعیّ بنی شجع لحرب محمدؐ

مشوم لعین کان قبل مامشخصاً یبین فیہ اللوم من کان یھتدی

فدلاھم فی الغیّ حتی تہافتوا وکان مضلاً امرہ غیر مرشد

حکمیات | حکمیات کے باب میں بھی حسان کا جوادِ قلم جاہلیت کے مشہور شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کی طرح اپنی جولانی دکھاتا ہے۔ ان کے حکم و مواعظ میں دقیق حکیمانہ نکات نہیں پائے جاتے بلکہ وہ سیدھے سادے الفاظ میں حکمت و اخلاق کی باتیں بیان کرتے ہیں جو انھوں نے زندگی کے طویل تجربات سے حاصل کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

إذا المرء لم یفخل ولم یلق نجدۃ مع القوم فلیقعد یصغر ویبعد

وانی لاغنی الناس عن متکلف یری الناس ضلالاً ولیس بمھتدی

اصون عرضی بمالی لا ادنسہ لا بارک اللہ بعد العرض فی المال

احتال للمال ان اودی فاجمعہ ولست للعرض ان اودی بمحتال

مدح رسول | حضرت حسان کا امتیازی وصف مدحِ رسول ہے جو انھیں دیگر اسلامی شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ طوطیٔ گلزارِ نبوت ہیں اور والہانہ انداز میں شانِ رسالت میں نغمے الاپنا اور نعتِ رسول میں چہچہانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے مدحیہ قصائد میں فلسفیانہ نکتہ سنجی اور متاخرین کے سے اچھوتے استعارات و تشبیہات نہیں بلکہ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ میں اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں عاشقِ رسول ہیں اور ان کا نعتیہ کلام گہرے جذباتِ محبت کی غمازی کرتا ہے۔ ان کے الفاظ تاثیر میں ڈوبے ہوئے اور بے پناہ جاذبیت کے حامل ہوتے ہیں۔

نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

واحسن منک لم ترقط عینی ۔ واجمل منک لم تلد النساء
خُلِقتَ مُبَرَّءً من کل عیب ۔ کانک قد خُلِقتَ کما تشاء

وَ شقّ لہ من اسمہ لیجلّہٗ ۔ فذو العرش محمودٌ وھذا محمدٗ
نبیٌّ اتانا بعد یاس و فترۃٍ ۔ من الرسُل والاوثان فی الارض تعبدُ
فامسیٰ سراجًا مستنیرًا وھادیاً ۔ یلوح کما لاح الصقیل المھنّدُ

ندوۃ المصنفین کی تازہ ترین عظیم الشّان کتاب

ترجمان السُّنّہ جلد سوم

یہ جلد پہلی دو جلدوں سے ضخامت میں بھی زیادہ ہے اور اس کے مباحث ومضامین بھی مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم ہیں ۔ اس میں مسئلہ قضا وقدر کے تمام بابوں کے علاوہ ، پوری کتاب الانبیاء بھی آگئی ہے جس میں وحی اور نبوت ورسالت کے ایک ایک گوشہ پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے اور تمام متعلق احادیث کو نئے نئے عنوانوں کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے ۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں کے حالات وواقعات صحیح اور مستند حدیثوں کی روشنی میں واضح کئے گئے ہیں ، خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی خصوصیات سے متعلق تمام بحثوں کو عجیب وغریب انداز سے اُجاگر کیا گیا ہے ۔

یہ عظیم الشان جلد کم وبیش پانچ سو حدیثوں کے ترجمے اور تشریح پر مشتمل ہے ۔ صفحات ۶۲۴ ، بڑی تقطیع ۔

قیمت غیر مجلد دس روپے آٹھ آنے ۔

مجلد بارہ روپے آٹھ آنے ۔

کچھ قاہرہ کے بارے میں

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق اُستاذ ادبیاتِ عربی دہلی یونیورسٹی)

(۲)

قاہرہ پر مغربی تمدن کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ یہاں ارمینی، اطالوی، یونانی، فرانسیسی اور برطانوی نسل کے بہت سے خوش حال تجارت پیشہ لوگ آباد ہیں جن کی تہذیب اور اقدار وہی ہیں جو اقوامِ یورپ کے ہیں، جو یورپ سے تجارت اور ثقافت کے بندھن میں بندھے ہیں، کئی پشتوں سے ان کے ساتھ رہن سہن کا اثر مسلمانوں کے رہن سہن اور اطوار پر گہرا پڑا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ کوئی ڈیڑھ سو برس تک فرانس اور برطانیہ کا مصر پر تسلط رہا اور اس دوران میں یہ دونوں ملک اپنی ثقافت اور اداروں کو مصر میں خوب رواج دیتے رہے۔ مغرب کا نیا اور طاقتور تمدن، آہستہ آہستہ مصر کے بوسیدہ تمدن کی جگہ لیتا رہا، شروع میں اس کو امراء اور رئیسوں نے اختیار کیا، پھر تعلیم یافتہ طبقہ نے اور اب عوام جوں جوں ان کی معاشی حالت بہتر ہوتی جا رہی ہے، اس کو اپنا رہے ہیں۔ آج قاہرہ یورپ کا ایک شہر معلوم ہوتا ہے اور مصری مسلمان جس طرح نیل پر فخر کرتا ہے اپنے شہر پر بھی فخر کرتا ہے۔ رنگ، روپ، لباس، رہن سہن کے طریقے، فنِ تعمیر، تجارت، شہر کی وضع قطع سب مغربی طرز پائے تمدن کی ہے، جو مسلمان ابھی یہ تمدن نہیں اپنا سکے ہیں اور ایسے بہت ہیں، اس کی وجہ اقتصادی بدحالی ہے، اس بدحالی کو دور کرنے کی آج کل لوگوں میں عام لگن ہے۔ ازہر کے تعلیم یافتہ بھی تیزی سے نئے تمدن کی طرف مائل ہیں، کچھ مجبور ہو کر اور کچھ رغبت سے۔ مؤتمرِ اسلامی کی لائبریری کے ایک ازہری جوان کلرک اپنا لباس یعنی جَلَّبِیَّہ پہن کر لائبریری آیا کرتے تھے کچھ عرصہ بعد وہ کوٹ پتلون اور ٹائی میں جلوہ افروز ہونے لگے۔ میں نے لائبریرین صاحب سے اس تبدیلی کا سبب معلوم کیا تو انھوں نے بتایا: ان کی شادی ہونے والی ہے، لڑکی کا اصرار ہے کہ جَلَّبِیَّہ اُتار کر

سوٹ پہنیں۔ واضح رہے کہ یہ لڑکی قاہرہ کی نہیں، گاؤں کی تھی! ترکی ٹوپی خال خال سن رسیدہ سروں پر نظر آتی ہے۔

قاہرہ کے اسکولوں کالجوں سے تعلیم یافتہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں جانتے ہیں اور یورپ کی دوسری زبانیں مثلاً اطالوی، یونانی، جرمن جاننے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں انگریزی و فرانسیسی زبانیں بیک وقت عربی نصاب کا لازمی جزر رہی ہیں، فرنیچ زبان اور ثقافت کو اہمیت حاصل رہی ہے، لیکن اب انگریزی کی طرف جو بین الاقوامی زبان ہے، توجہ بڑھ گئی ہے۔ مصر پر حملہ سے پہلے قاہرہ میں ایسے متعدد اسکول بھی تھے جہاں پڑھانے والے فرانسیسی یا برٹش ہوتے تھے، اور نصابِ تعلیم فرنیچ یا انگلش میں تھا۔ ان اسکولوں کی شہرت اچھی تھی، اس لئے اہلِ ستطاعت مسلمان اپنے بچوں اور بچیوں کو یہاں بھیجا کرتے تھے، مصر پر حملہ کے بعد یہ تحریک اٹھی کہ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کا بائیکاٹ کردیا جائے، لیکن حکومت نے فیاض دلی سے کام لیا اور کہا کہ ہماری لڑائی فرنیچ یا انگلش سے نہیں، فرانس اور برطانیہ کی ظالم حکومتوں سے ہے، بس اتنا ہوا کہ ان اسکولوں کو وزارتِ تعلیم نے اپنی نگرانی میں لے لیا، مصری استاد مقرر کردئے اور نصاب بدل دیا۔

یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ قاہرہ کے مسلمانوں میں نہ مذہبی تعصب ہے، نہ فقہی و مسلکی جھگڑے۔ گو قاہرہ کی آبادی کا کافی بڑا حصہ غیر مسلم ہے، اور یہ وہ حصہ ہے جس کے ہاتھ میں چند دن پہلے تک تجارت وصنعت کی باگ ڈور تھی، پھر بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں پر حسد تھا نہ اُن سے جلن، بلکہ وہ ان کے ساتھ شیر وشکر ہوکر رہتے اور اپنے اقتصادی ارتقار کے لئے ان کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کرتے۔ گذشتہ چند سالوں میں یعنی ملوکیت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں نے تجارت واقتصادیات کے میدان میں نمایاں ترقی کرلی ہے، مسلمانوں کے غیر مسلموں سے اچھے تعلقات کی وجہ متبادل ہے: مسلمان روادار بلکہ قدر دان ہیں اور غیر مسلم وفادار و مخلص۔ آپ قاہرہ کی مسجدوں میں ہوں یا سڑکوں اور بازاروں میں، آپ کو کسی فقہی یا مسلکی جھگڑے، یا مذہبی تشدد کا احساس نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خارجی مذہبیت یا فروعی امور کی بجائے داخلی تدین کو اہم سمجھنے لگے ہیں۔ نماز باجماعت کے وقت آپ مسجد میں دیکھیں گے کہ

اکثر نمازی پتلون پوش اور ننگے سر ہیں، ان کے ٹخنے ڈھکے ہیں اور اگر گرمی کا موسم ہے تو کہنیاں کھلی ہیں، لیکن کوئی ان پر اعتراض نہیں کرے گا، بہت سے نمازی اتنی زور سے آمین کہیں گے کہ ساری مسجد گونج اٹھے گی اور بہت سے زیرِ لب کہنے پر اکتفا کریں گے، صف کے کچھ لوگ ہاتھ باندھ کر نماز ادا کریں گے اور کچھ ہاتھ چھوڑ کر۔ لیکن کوئی کسی سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

قاہرہ کے مسلمان، ہندی مسلمانوں سے زیادہ روزہ نماز کے پابند ہیں، آپ کو یہ پڑھ کر تعجب ضرور ہوگا لیکن آپ اس بات کی تردید نہیں کر سکتے، میں شہر کے سب سے جدت زدہ حصے میں رہتا تھا یعنی زمالک جو سفارتوں کا مستقر ہے اور جہاں رہنے والے زیادہ تر غیر ملکی ہیں، میں اکثر دیکھتا کہ یہاں کے فٹ پاتھ پر چٹائیاں بچھی ہوئی ہیں اور با جماعت نماز ہو رہی ہے، اس میں شریک ہونے والے اکثر دکاندار یا وہ لوگ ہوتے جو اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر مسجد میں جو ذرا دور تھی نہیں جا سکتے تھے۔ قاہرہ کے جن جن اداروں میں میرا جانا ہوا مثلاً لائبریریاں، سرکاری دفاتر، کالج اور یونی ورسٹی، ان سب کے پاس یا ان کے حدود میں ایک آباد مسجد ضرور دیکھی، متعدد ایسے لوگوں کو گھر یا دفتر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا جن کی ظاہری ہیئت یا طرزِ معاشرت سے گمان ہوتا کہ وہ روزہ نماز سے بے پرواہ ہوں گے۔

رمضان قاہرہ میں بڑی دھوم سے منائے جاتے ہیں، یہ تو وثوق سے نہیں بتایا جا سکتا کہ کتنے فی صدی روزہ رکھتے ہوں گے لیکن یہ یقینی ہے کہ اکثر روزہ دار ہوتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ رمضان میں سارا قاہرہ رمضان زدہ نظر آتا ہے۔ سرکاری دفاتر اور دوسرے اداروں کے اوقاتِ کار کم ہو جاتے ہیں، ہوٹل اور قہوہ خانے جہاں عادۃً بڑی چہل پہل ہوتی ہے اُجڑ جاتے ہیں، روٹی بسکٹ کی دکانوں (بیکریوں) میں دن میں روٹی نہیں ملتی، افطار کے وقت ٹرامیں اور بسیں تقریباً خالی چلتی ہیں اور سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر جہاں کچھ دیر پہلے نبضِ زندگی تیز اور بھرپور تھی اچانک جمود طاری ہو جاتا ہے، اور یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ قاہرہ، قاہرہ نہیں رہا۔ ایک معزز مصری نے بتایا کہ مصر کے مسلمان طبعاً روزہ پسند واقع ہوئے ہیں، جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ روزہ رکھتے ہیں اور کچھ لوگ روزہ رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے بیوی بچے روزہ رکھتے ہیں اور دن کے وقت مطبخ ٹھنڈا رہتا ہے، لڑکیاں

اور عورتیں لڑکوں اور مردوں کی نسبت زیادہ روزہ رکھتی ہیں۔ یہ تصریح قاہرہ کی ایک اخباری تحقیق پر مبنی ہے۔ یوں تو میں نے قاہرہ کے بہت سے اپ ٹو ڈیٹ مسلمانوں کو شاہراہوں پر ہاتھ میں بڑے دانوں کی تسبیح لٹکائے چلتا پھرتا دیکھا، لیکن رمضان میں تسبیح لے کر سڑکوں اور دفتروں اور تعلیمی اداروں میں جانے کا چلن بہت بڑھ جاتا ہے، یہ منظر ایک ہندی کے لئے اتنا غیر متوقع ہوتا ہے کہ وہ حیران رہ جاتا ہے۔ ایک طرف شکل صورت، ہیئت سب ایک یوروپین کی اور دوسری طرف ہاتھ میں ایک موٹی سی تسبیح!

افطار کے گھنٹہ بھر بعد قاہرہ کی رگوں میں زندگی کا خون پھر تیزی اور تندی سے گردش کرنے لگتا ہے، نقل و حرکت، آمد و شد ایک بحرانی شان اختیار کر لیتے ہیں۔ جو ٹرامیں اور بسیں کچھ دیر پہلے خالی چل رہی تھیں اب کھچا کھچ بھر جاتی ہیں، پرائیویٹ موٹروں کی آمد و رفت بڑھ جاتی ہے، اس وقت لوگ دوست احباب، عزیز و اقارب سے ملنے نکلتے ہیں، تفریح گاہوں، چائے خانوں کو جاتے ہیں اور بہت سے مسجدوں میں جا کر عبادت کرتے ہیں، دن میں ملنے ملانے، سیر و تفریح کے مشاغل بالکل معطل رہتے ہیں۔

مصر پر پچھلے حملہ کے وقت وہاں کی حکومت، صحافت اور پبلک نے جس تحمل، رواداری اور یکجہتی کا ثبوت دیا وہ قابلِ داد ہے۔ ۲۹ یا ۳۰ اکتوبر کو اچانک ساڑھے نو بجے بلیک آؤٹ کا سائرن ہوا اور آناً فاناً ساری روشنیاں بجھ گئیں، ٹرامیں، موٹریں، بسیں جہاں تھیں رک گئیں اور سارا قاہرہ اندھیرے کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اگر کوئی دیا سلائی جلاتا یا دکان کا تالا کنجی ڈھونڈنے موم بتی روشن کرتا یا مائیں اپنے چھوٹے بچوں کی وحشت و گھبراہٹ دور کرنے کے لئے ٹارچ کھولتیں یا کوئی سگریٹ پیتا سڑک پر نظر آتا تو فوراً عوام اور فوجی پولیس "اطفاءُ النور" "اطفاءُ النور" (روشنی بجھاؤ) کے غیظ بھرے نعرے لگانا شروع کر دیتے۔ دن میں برابر توپوں اور مشین گنوں کی آوازیں آتیں اور تھوڑی دیر بعد خطرہ کا الارم ہوتا، لیکن قاہرہ کے عوام حسب معمول اپنے کاموں میں لگے رہتے، گھبراہٹ کسی چہرہ پر نظر نہ آتی، گویا سب اس زندگی کے عادی یا منتظر ہوں۔ دکانوں پر سب چیزیں حسب معمول ملتی رہیں، نہ ہورڈنگ کی گئی نہ بلیک مارکٹ ہوا، صحافت نے سنجیدگی کا دامن نہ چھوڑا، حملہ آوروں سے اگرچہ بڑا جرم سرزد ہوا تھا، تاہم اخباروں نے

نہ تو سب و شتم سے کام لیا اور نہ شیخی اور اشتعال بھرے مقالے لکھے بلکہ شائستگی اور متانت سے حملہ آوروں کے فعل کی مذمت کی، ان کی سازشوں، منصوبوں اور ریشہ کاریوں کا پول کھولا۔ "مقاومۃ الشعب" کے عنوان سے اس زمانہ میں ہر دن بہت سے پوسٹر سڑکوں اور بازاروں میں حکومت کی طرف سے بانٹے جاتے جن میں جنگ کی صورتِ حال اور حکومت کی پالیسی کا ذکر ہوتا یا قوم کے نام متحد اور تیار رہنے کی اپیل۔ ہر طرف دیواروں اور اعلان کے بورڈوں پر مصور پوسٹر نظر آتے جن میں "عد وان ثلاثی" سے مصریوں کے مقابلہ کی جھلکیاں ہوتیں، کسی کا عنوان ہوتا "سحقا للمعتدین" اور کسی کا "سنحارب جنبا الی جنب"۔ شہر کے پارکوں، چوراہوں اور ڈھب کی جگہوں پر خندقیں کھود دی گئیں جہاں مسلح فوج نے مورچے سنبھال لئے۔ مہیب شکل کے بہت بڑے بڑے یوغوسلاوی یا روسی ٹینک مناسب گوشوں میں بکھیر دیے گئے۔ قاہرہ کی آبادی پر کوئی بم نہیں گرا، بس ریڈیو اسٹیشن برباد کر دیا گیا، فوجی ہوائی اڈے پر کچھ ہوائی جہاز توڑ پھوڑ ڈالے گئے، بیرونی قاہرہ کی چند اسلحہ فیکٹریوں پر بھی بم باری ہوئی۔ پورٹ سعید کے ایک محلہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی جہاں مصریوں نے چھتوں اور فلیٹوں پر مشین گنیں نصب کر کے حملہ آوروں پر گولیاں برسائی تھیں۔ کئی دن تک رات کو پورٹ سعید کی جانب اُفق جگمگاتا نظر آیا جیسے بہت سی آتش بازی چھوٹ رہی ہو، باخبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ پیراچوٹ سے فوج اتاری جا رہی ہے اور ان کے اُترنے کے لئے میدان روشن کئے جا رہے ہیں۔ حملہ آور جمال عبدالناصر اور ان کی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے تھے، منصوبہ یہ تھا کہ پورٹ سعید پر قبضہ کر کے، اور جنگی اہمیت کے نقطوں کو برباد کر کے، بمباروں کی پایۂ تخت پر ہمہ وقت اڑان سے مصریوں میں ایسا ہراس پیدا کر دیا جائے کہ اندرونی بغاوت ہو جائے اور زمامِ کار ایک ایسی حکومت کے ہاتھ آ جائے جو حملہ آوروں کے مطالبے مان لے، اور تعمیم قناۃ منسوخ کر دے۔

قاہرہ میں کئی بڑی لائبریریاں ہیں: دار الکتب المصریہ (قومی لائبریری) (۲) معہد احیاء المخطوطات العربیہ (۳) کتب خانہ موتمر اسلامی (۴) کتب خانہ ازہر یونیورسٹی (۵) کتب خانہ قاہرہ یونیورسٹی (۶) فرانسسکن لائبریری۔ ان میں دار الکتب سب سے بڑا ہے، یہاں مخطوطات اور مطبوعاتِ عربی کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، صرف مخطوطات کی تعداد شاید ستر ہزار ہے، عربی کے علاوہ انگریزی، فرنچ اور فارسی ترکی کی بھی

بہت سی وہ کتابیں جن کا تعلق اسلام یا دنیائے اسلام سے ہے، موجود ہیں - دار الکتب میں ایک متحف بھی ہے، جہاں ہاتھ سے لکھی عربی فارسی کتابوں کے نہایت حسین اور قیمتی نمونے رکھے ہیں - ان کتابوں کا دبیز، چکنا، لطیف کاغذ، معجز نما تحریر، سونے چاندی کے پھول بوٹے اور رنگین نقش و نگار، دیکھ کر سلف کی متانتِ ذوق کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، سلاطین مصر و شام اور ان کے عہد کے چھوٹے، بڑے اور متوسط سائز کے بہت سے قرآن بھی متحف کو زینت دے رہے ہیں، جن کی صنعت گری دیکھنے والے کو مبہوت کردیتی ہے - متحف کے باہر منظر عام پر نواب بھوپال کا بھیجا ہوا شاید کوئی چار فٹ اونچا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا رنگوں اور نقش و نگار سے مزین قرآن شیشہ کے ایک کیس میں نیم باز رکھا ہے متحف میں کتابوں کے علاوہ سکے اور دوسرے نوادرات بھی ہیں - دار الکتب میں مطالعہ کا ایک تکلیف دہ اور لائق شکایت پہلو یہ ہے کہ وہاں کتابیں دیر میں ملتی ہیں، آپ فارم بھر کر دیں گے تو پندرہ منٹ سے پون گھنٹہ اور کبھی اس سے بھی زیادہ دیر تک آپ کو کتاب کا انتظار کرنا پڑے گا - معہد احیاء المخطوطات عرب لیگ کا ایک شعبہ ہے جس میں یورپ اور ایشیا کے کئی کتب خانوں سے مخطوطات کے مائکرو فلم لے کر جمع کئے گئے ہیں، ہندوستان سے بھی ہزاروں کتابوں کے مائکرو فلم گئے ہیں - اس علمی دولت کی ایک فہرست بھی چھپ کر تیار ہوگئی ہے - معہد کے مائکرو فلموں سے خصوصی اجازت کے بعد ہی استفادہ کیا جاسکتا ہے - چند نادر کتابوں کی طباعت کا کام یا منصوبہ شروع ہوگیا ہے، ان میں بلاذری کی مشہور تالیف انساب الاشراف بھی ہے - قاہرہ یونیورسٹی کی لائبریری میں ایک بڑا ریڈنگ روم ہے جہاں انگریزی و فرانسیسی مراجع کے علاوہ عربی کی مشہور اور اہم کتابیں مضمون وار کھلی لماریوں میں رکھی ہیں - لائبریری میں مخطوطات کا ایک چیدہ مجموعہ بھی ہے جن میں سے کچھ چھپ گئی ہیں اور کچھ عنقریب چھپیں گی - ازہر یونیورسٹی کے کتب خانہ میں فقہ، حدیث اور تفسیر کا اچھا مجموعہ محفوظ ہے - حافظ ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا کامل نسخہ میں نے سب سے پہلے اسی جگہ دیکھا، اس کا مائکرو فلم معہد نے لے لیا ہے - موتمر اسلامی کا کتب خانہ مرحوم احمد امین کی ذاتی کتابوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد کئی ہزار ہوگی اور جن کو ان کے وارثوں نے موتمر کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے - یہ وہی احمد امین ہیں جن کی

فجر الاسلام، ضحٰی الاسلام اور ظہر الاسلام سے اسلامی تاریخ و ثقافت کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اس کتب خانہ میں زیادہ تر پرانے ادیبوں، مورخوں، فلسفیوں، محدثوں، فقیہوں، جغرافیہ نویسوں کی کتابیں ہیں اور یہ وہ کتابیں ہیں جو ایک سنجیدہ طالب علم اور محقق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان میں اسلامیات سے متعلق انگریزی کتابوں کا بھی ایک جیدہ مجموعہ شامل ہے اور دو ڈھائی درجن مخطوطات بھی۔ ان سب کے علاوہ احمد امین کے کتب خانہ میں عصر جدید کی بہت سی تالیفات بھی ہیں جو مولفوں نے ان کو ہدیۃً پیش کی تھیں۔ موتمر کے اس کتب خانہ کی خوبی یہ ہے کہ سب کتابیں کھلی الماریوں میں رکھی ہیں اور آپ آسانی سے اپنی پسند کی کتاب خود نکال سکتے ہیں۔

قاہرہ کی عربی دو قسم کی ہے: ایک بول چال کی اور ایک تحریر کی۔ تحریر کی عربی گرامر اور لغت کے مقررہ اصول کی پابند ہے، بول چال کی عربی ان دونوں سے آزاد، اس کے علاوہ اس میں غیر عربی مثلاً قبطی، ترکی، یونانی، فرانسیسی اور انگریزی الفاظ، اور فقرے داخل ہو گئے ہیں۔ بول چال کی عربی میں اِزْ ىَّكْ کے معنی ہیں مزاج شریف۔ مَعْلِش، کے معنی ہیں مضائقہ نہیں یا درگذر کیجیے، اِزْ ىَّكْ کی جگہ کیف حالك اور معلش کی جگہ لا بأس کوئی نہیں کہتا۔ یہ دونوں کلمے غیر عربی، غالباً قبطی ہیں۔ بول چال کی عربی میں بہت سے عربی الفاظ کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، اس میں افعال اور خاص طور پر فعل امر غلط بولے جاتے ہیں اور تلفظ تو بیشتر اسماء کا بگڑ گیا ہے مثلاً زبدہ (مکھن) کی جگہ زِبدَہ، جُبن (پنیر) کی جگہ جِبنَہ، مِلح (نمک) کی جگہ مَلح، عُلبہ (ڈبا) کی جگہ عِلبہ، مِسطر (پیمانہ) کی جگہ مَسطر، تُرعہ (نہر یا) کی جگہ تِرعہ۔ بول چال کی عربی میں اگر کسی کو کہنا ہو: سیدھے چلے جایئے تو کہیں گے: رُح علی طول، اگر کہنا ہو مجھے نہیں معلوم تو کہیں گے: مُش عارف، مجھے علم نہ تھا کے لئے کہیں گے: ماعرفتش، سأعود کی جگہ کہتے ہیں حأعود، یاکل (وہ کھا رہا ہے) کی جگہ بیاکل۔ بھاڑ کی دکان کے بورڈ پر لکھا تھا: مَقلہ، مقلی کی جگہ، دوسرے پر تھا مرایات (آیئنے) مرایا کی جگہ۔ انگریزی کا گوافا (guava) امرود اور مودل، ماڈل کے لئے بولتے ہیں۔ متی تذھب کو کہیں گے

اِمتَ تذہب ۔ خمسۃ عشر کو کہتے ہیں: خمستعشر، تلتمائۃ کو کہیں گے: تلتمئہ یا تلتمیہ ۔ انا مریض کی جگہ کہتے ہیں انا عیان، انت غضبان کے لئے کہیں گے انت زعلان پُل کے لئے جسر یا قنطرہ کوئی نہیں کہے گا بلکہ کوبری (یونانی) اور قید خانہ کے لئے محبس کی جگہ لیمان (یونانی) بولیں گے ۔ قاہرہ میں قاف کو آف پڑھتے ہیں، ہمیشہ قُل (کہو) کو اُل اور قُدّام (سامنے) کو اُدّام بولیں گے، اسی طرح جیم کو گاف کہیں گے، جُمہور کو گمھور، جَبَل کو گَبَل ۔ کتاب لاؤ ۔ گیب الکتاب ۔ جیع بالکتاب کی جگہ ۔ ازہر یونیورسٹی کے عالم اور استاد بھی یہی عربی بولتے ہیں ۔ شکل صورت اور لباس میں چاہے آپ مصریوں سے کتنے ہی مشابہ ہوں اگر آپ نے صحیح اور خالص عربی بولی تو فوراً سمجھ لیا جائے گا کہ آپ اجنبی ہیں ۔ بول چال کی عربی کتابوں میں بھی داخل ہوتی جارہی ہے خاص طور سے ناول اور افسانہ میں گانے اور گیت وہی مقبول ہوتے ہیں جو عامی زبان اور لہجے میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں ۔ تقریریں زیادہ تر ادبی عربی میں ہوتی ہیں لیکن میں نے ایسی تقریریں بھی سُنیں جن میں عامی زبان اور لہجہ کی کھچڑی تھی ۔ تحریری عربی جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا صرف ونحو اور آدابِ لغت کی پابند ہے، یورپی زبانوں سے اُس کے اسلوبِ بیان کے سانچے بنے ہیں، جس سے اُس میں وضاحت وسلاست اور ایک نئی دل کشی پیدا ہو گئی ہے ۔

• مصر میں لڑکیاں، لڑکوں سے زیادہ پیدا ہوتی ہیں، یعنی عورتیں مصر کی آدھی آبادی سے زیادہ ہیں، ملوکیت کے خاتمہ کے بعد اقتصادی بہتری اور صنعتی ترقی کا دور شروع ہو گیا ہے، روزگار کی نئی نئی راہیں کھل رہی ہیں، پڑھے لکھے اور لائق مردوں کی مانگ بڑھتی جارہی ہے، مصر کے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ساری قوم کے معاشی ارتقاء کے لئے صرف مردوں کی تعداد اور محنت کافی نہیں ہے، عورتوں کو بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہیئے، عورتوں میں چوں کہ تعلیم بڑھ رہی ہے وہ معاشی اصلاح کے کاموں میں حصہ لینے کی اہل ہوتی جارہی ہیں، چنانچہ گذشتہ چند سالوں میں حکومت کے دفتروں، تجارتی اداروں، پوسٹ آفسوں، بنکوں وغیرہ میں عورتوں کو نوکریاں ملنے لگی ہیں ۔ میرے قیام کے زمانہ میں بس کنڈکٹری جیسی پُرمشقت خدمت پر بھی عورتیں مامور ہونے لگیں ۔ جو عورتیں مرد کے میدانِ عمل میں

آنا پسند نہیں کرتیں، وہ بھی اب مجبور ہو رہی ہیں کہ خود یا ان کی بچیاں کمائیں، وجہ یہ ہے کہ صنعتی ترقی کے ساتھ گرانی بڑھ رہی ہے اور تعلیم کے ساتھ معیارِ زندگی اونچا ہو رہا ہے اور شوہر، باپ یا بھائی کی کمائی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوتی۔

مصر میں لڑکیوں کی شادی والدین کے لئے ایسا پریشان کن مسئلہ نہیں جیسا ہندوستان میں ہے، وہاں والدین کو جہیز پر روپیہ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ ہمارے ملک میں مہر، ایک کلمۂ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، نکاح کے رجسٹر کے باہر اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ لاکھوں کا مہر باندھ دیا جاتا ہے یہ کہہ کر کہ کون لیتا ہے اور کون دیتا ہے۔ مصر میں مہر کے معاملہ میں اسلامی قانون پر پوری طرح عملدرآمد ہے، یعنی رخصت سے پہلے عملاً ادا کر دیا جاتا ہے، مہر کی رقم لڑکی کا جہیز بنانے پر صرف ہوتی ہے۔ مہر عادۃً رخصت سے بہت پہلے لڑکی والوں کو دے دیا جاتا ہے، وہ لڑکے کی حیثیت کو سامنے رکھ کر ایک فلیٹ کرایہ پر لیتے ہیں، پھر اس کے لئے سامان خریدتے ہیں جیسے فرنیچر، برتن، الماریاں، لڑکی کے چند اچھے سوٹ بھی اس روپیے سے بنوا دئے جاتے ہیں۔ رخصت ہو کر دلھن اپنی پسند سے مرتب کئے اور سجائے ہوئے اس نئے گھر میں چلی جاتی ہے۔ ایک مصری دوست جب یہاں کی شادی اور مہر کی بات کر چکے تو انھوں نے ہندی مسلمانوں کی شادی بیاہ کے بارے میں مجھ سے پوچھا اور جب میں نے بتایا کہ ہندوستان میں سارا جہیز لڑکی کے والدین کو اپنے پاس سے خریدنا پڑتا ہے اور "مہر" کی رقم شادی کے وقت ادا نہیں کی جاتی تو وہ حیران ہوئے اور بولے "تب تو والدین کی کمر ٹوٹ جاتی ہوگی!"

مکمل لغات القرآن

جلد ششم

"مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ" ندوۃ المصنفین کی مشہور و معروف اور مایۂ ناز معیاری کتاب ہے، قرآن کریم کے معانی و مطالب سمجھنے کے لئے اُردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت شائع نہیں ہوئی، الحمد للہ کہ اس اہم و عظیم الشان کتاب کی آخری جلد بھی پریس سے آگئی، اس جلد میں ن سے ی تک تمام الفاظ آگئے ہیں، صفحات ۳۲۴ قیمت غیر مجلد چار روپے آٹھ آنے مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

تاریخی حقائق

(از مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی دار العلوم دیوبند)

اس وقت میرے سامنے حضرت سید گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ہزار سال پہلے" ہے، اس کتاب کے پڑھتے وقت بعض تاریخی حقائق پر نشان لگاتا گیا تھا، آج انہی واقعات میں چند حاضر خدمت ہیں، (ظفیر صدیقی)

ابن حوقل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہزار سال پہلے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود، کس خودداری کے ساتھ رہتے تھے، اور اپنے اعمال واخلاق کی وجہ سے حکمراں طبقے پر کیسے چھائے ہوئے تھے،

بلھرا کے علاقہ میں تھوڑے سے مسلمان بھی آباد تھے، مگر ان کے کردار کا اثر یہ تھا۔

"ان مسلمانوں پر بلھرا کی طرف سے اس زمانہ میں وہی آدمی حاکم ہوسکتا تھا جو مسلمان ہو"[1]

اور یہ کوئی بلھرا ہی کی خصوصیت نہ تھی، ابن حوقل نے لکھا ہے

"اور یہی حال ... میں نے بہت سے ان ممالک میں پایا جن پر کفر کا غلبہ ہے، مثلاً خزانہ، سریر، لان، غانہ کوغہ وغیرہ"[2]

مسلمان جب تک مسلمان تھے تو ان کا یہی حال تھا، جہاں رہے مسلمان بن کر رہے، قوانینِ اسلام ہر جگہ برقرار رکھا، مگر آہ اب تو مسلمان، نام کے مسلمان بنتے جا رہے ہیں، پھر اسی اعتبار سے کمزوری، بزدلی اور مرعوبیت کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

ایک دن وہ بھی تھا کہ غیر اسلامی حکومتوں کے علاقوں میں آباد تھے مگر وقار اور دینی جاہ وجلال کا حال یہ تھا کہ۔

"مسلمان ان تمام علاقوں میں کسی حکم اور فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جب تک ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو، ان پر حدود، اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے، خواہ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو"[3]

دیکھ رہے ہیں انتہائی اقلیت میں ہیں، گنے چنے افراد ہیں مگر حال کیا ہے؟ کہ اپنے مذہبی م

---

[1] ہزار سال پہلے ص۱۰ حوالہ ابن حوقل ص۲۲۷ [2] ایضاً ص۱۰۱ [3] ایضاً حوالہ ابن حوقل ص۲۲۳

دوسرے کی حکمرانی قبول نہیں کر رہے ہیں، اور ان کے خلوص اور ان کے اعمال واخلاق کا یہ عالم ہے کہ حکمراں طبقہ بھی ان کے اس مطالبہ کو ماننے پر مجبور ہے۔

کیا ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کے لئے اس میں کوئی سبق نہیں ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر اپنی آزاد حکومت سے اپنے اس حق کا مطالبہ کرنا چاہیے، غریق رحمت کرے اللہ تعالیٰ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن کو اپنی زندگی بھر اسی کی دھن رہی، کاش وہ زندہ ہوتے، تو اس آزاد بھارت میں مسلمانوں کے پرسنل لا کا یہ حشر نہ ہوتا،

ابن حوقل نے یہ بھی لکھا ہے

"بلہرا کے علاقہ میں مسلمانوں کی مسجدیں بھی ہیں، جن میں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے، اور دوسری نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں، نماز کے لئے میناروں پر اذان بھی ہوتی ہے اور تکبیر و تحلیل اعلان کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔"[1]

اللہ اکبر اسلامی کردار کا یہ عالم تھا، دینی معاملہ میں مداہنت کا نام و نشان تک نہ تھا، اب تو مسلمانوں میں مداہنت کا مرض پھیل پڑا ہے، تو وہ اذان ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں، اور اسی آزاد بھارت میں سیکڑوں دیہات ایسے ہیں، جہاں برادرانِ وطن اذان پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

عجائب الہند کے مصنف ابن شہریار نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے افسر کا نام "ہنرمن" ہوا کرتا تھا اور اسے قاضی کی حیثیت حاصل تھی، اس عہدہ پر مسلمان کے سوا کوئی دوسرا بحال کسی حال میں نہیں ہو سکتا تھا، اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے

"ہندوستانی قوانین کی رو سے کسی جرم کی خواہ کچھ بھی سزا مقرر ہو، لیکن مسلمان جب اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے تو ان کو "ہنرمن" (قاضی) کے سپرد کر دیا جاتا تھا، تاکہ اسلامی قوانین کی رو سے ان پر حکم لگائے۔"[2]

اس کو نقل کر کے خود سید گیلانی تحریر فرماتے ہیں

"کیا زمانہ کا انقلاب ہے کہ جس زمانہ میں مسلمان ہندوستان میں انگلیوں پر بھی بمشکل گنے جا سکتے تھے، اس وقت تو انہوں نے اس ملک میں یہ اختیار اور اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ مسلمانوں پر مسلمانوں ہی کی حکومت قائم ہوگی، اور

---

[1] ایضاً ص۱۳ [2] ایضاً ص۱۴ بحوالہ عجائب الہند ص۱۶۱

مسلمانوں پر ان کے دین ہی کا قانون نافذ ہوگا، لیکن آج جب ان کی تعداد اسی ملک میں کروڑوں سے بھی متجاوز ہو چکی ہے اس مسئلہ کے خیال کو بھی اپنے دماغ میں لانے کی جرأت نہیں کر سکتے، دوسروں سے منوانا تو دور کی بات ہے، ... یہی طے ہونا مشکل ہے کہ اس قسم کے اختیارات کا مطالبہ حکومت کے سامنے مسلمانوں کو پیش کرنا بھی چاہئے یا نہیں"

مگر کیسے عرض کروں کہ یہ سب نتیجہ تھا دینی غیرت و حمیت اور اسلامی اخوت و محبت کا، ان میں کا ایک ایک فرد اخلاق و اعمال کا مجسمہ اور خلوص و وفا کا پیکر تھا، جن کو دیکھ کر فرشتے بھی شرما جاتے تھے اس سلسلہ میں خود ابن حوقل کی چشم دید گواہی ملاحظہ فرمائیے، وہ لکھتا ہے

"ان ہی علاقوں میں سے بعض علاقوں میں ایسے مسلمانوں سے بھی میری ملاقات ہوئی ہے، جن کی پارسائی اور اخلاقی برتری کا یہ حال ہے کہ اپنے مقدمات میں غیر مسلم طبقات کے افراد بھی عموماً ان کو اپنا گواہ مقرر کر کے حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور مقدمہ کا فریق ثانی بھی عموماً ان کی شہادت کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے، کبھی کسی خاص گواہ کی گواہی پر فریق ثانی کو اگر اعتراض بھی ہوتا ہے، تو اس کی جگہ گواہی میں پھر مسلمان ہی کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اسی کے بیان پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے"[1]

کاش مسلمان اپنے ان کھوئے ہوئے اخلاق و اعمال کو بروئے کار لاتے اور پھر صحابہ کرام کے نقش قدم پر مٹنے کا جذبہ پیدا کر لیتے، جو ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا،

خدا گواہ ہے کہ آج بھی اگر مسلمان پکا مسلمان بن جاتے تو دنیا ان کے قدم پر سر جھکا دے، یہ غلط ہے آج حالات سازگار نہیں ہیں، سب کچھ ہے، آہ مسلمان ہی، وہ مسلمان باقی نہ رہے جیسا ان کو رہنا چاہئے تھا، خدا بھلا کرے ان مسلمانوں کا، جنھوں نے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ انگریزوں سے لڑنے کے لئے انگریز بننا ضروری ہے اور ہندوؤں سے حقوق حاصل کرنے کے لئے ہندو جیسا، مگر یہ نہ سوچا کہ مسلمان کی تمام تر ترقی اسلام کی کامل پیروی میں مضمر ہے۔

یہ دعویٰ نہیں حقیقت ہے کہ مسلمان اسی وقت باعظمت ہو سکتا ہے، جب وہ پکا سچا مسلمان بن جائے اسی لئے ہماری ہر آن دعا ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۱۵۱ بحوالہ ابن حوقل ص ۳۲۲

بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو سینوں میں اُجالا کر، دل صورتِ مینا دے

عجائب الہند ہی کے حوالہ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ کولم ملی میں ایک موذن تھا جو اذان دیا کرتا تھا، اس کے جھاڑ پھونک کے لوگ بڑے قائل تھے، ناگ سانپ کے زہر کے ازالہ میں اس کو کمال حاصل تھا، شاید باید اس سلسلہ میں اس کا جھاڑ پھونک خطا کرتا ہو،

اس واقعہ کو پیش کرکے بتانا ہے کہ دیکھئے دیندار مسلمانوں سے غیروں کو بھی کس قدر سچی عقیدت تھی یہ تو خیر عوام کا حال تھا، لیکن سلیمان تاجر کا بیان ہے

"بلھرا کا راجہ اس ملک کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور تمام راجگان ہند اس کے فضل و شرف کو مانتے ہیں اگرچہ ہندوستان کا ہر راجہ اپنے اپنے علاقہ کا مستقل حکمراں ہے، لیکن بلھرا کی سیادت سب ہی تسلیم کرتے ہیں"

مگر با ایں ہمہ مسلمانوں سے اس خاندان کو کیسی عقیدت تھی، سلیمان کا بیان ہے

"بلھرا کی حکومت والوں کا خیال ہے کہ ان کی حکومت کی مدت اور ان کی عمر کی درازی کا سبب یہ ہے کہ عرب یعنی مسلمانوں سے وہ محبت کرتے ہیں[1]"

آپ نے سنا، یہ تھی عقیدت مسلمانوں سے، حکمراں طبقہ کو، سوچئے کیا یہ عقیدت کسی دنیاوی جاہ و جلال کی وجہ سے تھی؟ نہیں محض اس وجہ سے کہ اُس وقت کے مسلمان، مسلمان تھے، نام کے مسلمان نہیں تھے، جس پر نگاہ ڈال دی، مالامال ہو گیا، ان کے اعمال و اخلاق پاکیزہ تھے، کردار بلند تھے، اور خدا سے ہر وقت لرزہ براندام رہا کرتے تھے۔

اس مادی دنیا میں ایمان داروں کی بڑی کمی ہے اگر آج بھی مسلمان، صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو آپ یقین کریں، باوجود محکوم اور اقلیت میں ہونے کے ساری دنیا پر بھاری ہو جائیں۔

سلیمان تاجر نے چین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"شہر خانفو چین کے مسلمان تاجروں کا مرکزی مقام تھا، یہاں بھی چین کے بادشاہ نے مسلمانوں پر حکومت اور ان کے متعلق فصل خصومات کے اختیارات کو ایک مسلمان ہی کے سپرد کر رکھا ہے، عید کے

---

[1] ہزار سال پہلے ص۱۸ بحوالہ سلیمان ص۷۰۔

دن مسلمانوں کو وہی نماز پڑھاتا ہے اور خطبہ پڑھتا ہے، اور مسلمانوں کے خلیفہ کے لئے دعا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور اللہ کی کتاب کے مطابق اور اسلامی قوانین کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہے[1]"

حضرت سید گیلانی اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں اور آج کل کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے

"جنھوں نے یورپ سے سیاست کا علم سیکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سیاست کا علم صرف ان ہی کی ذات قدسی صفات میں منحصر ہے، ان کو سننا چاہئے کہ وہی عید کی نماز اور جنازوں کی نماز پڑھانے والے، مسجد کے ملانے، بے تیغ و تفنگ اقلیت کی انتہائی شکلوں میں بھی وہ سب کچھ حاصل کر لیتے تھے، جسے آج سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا"

بزرگ بن شہریار نے لکھا ہے کہ ان ملکوں کے بادشاہ کے سامنے بیٹھنے کے خاص آداب تھے، جن کی پابندی ہر ایک کو کرنی پڑتی تھی، خلاف ورزی کی صورت سزا کے مستوجب ٹھہرتے تھے، مگر مسلمانوں کو اس سلسلہ میں آزاد رکھا گیا تھا، خود ابن شہریار ہی کا بیان ہے

"اس وقت تک یہ دستور چلا آرہا ہے، کہ غیر مسلم راجگان کے سامنے مسلمان جس طرح چاہیں بیٹھ سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے سوا دوسرے لوگ مذکورہ بالا قاعدے کے مطابق بیٹھنے پر مجبور ہیں، جس کا نام بریسلا ہے، نشست کے اس طریقہ کے خلاف راجہ کے سامنے اگر کوئی بیٹھنے کی جرأت کرے، تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے[2]"

سچ ہے جو خدا کے احکام کی بجا آوری کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے، اس سے کسی اور کے قانون کی پابندی کا بوجھ اٹھا لیا جاتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہیں وہ مسلمان جو اقلیت میں ہیں، کمزور ہیں، محکوم ہیں، مگر ــــ الحمد للہ ذلیل نہیں، بے وقعت نہیں، اور کسی حکمراں طبقہ کی نگاہ میں کمتر نہیں۔

کاش آج کا مسلمان سوچتا کہ دنیا میں اس کی بے وقعتی کا سبب کیا ہے؟ یہ غلط ہے کہ مسلمان کمزور اور اقلیت میں ہیں، تاریخ شاہد ہے کہ باایں ہمہ یہ باوقار زندگی کے مالک رہے ہیں، دعا کی جائے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل		اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

یہ تو آپ نے محکوم مسلمانوں کے حالات ملاحظہ فرمائے، اب ذرا حاکموں کا حال بھی سن لیجئے کہ یہ کس حالت میں تھے، اور کس نظر سے دیکھے جاتے تھے، ابن حوقل نے آرمینیہ کے حالات لکھتے ہوئے

---

[1] ایضاً صـ۱۹ بحوالہ السلیمان صـ۱۳	[2] ہزار سال پہلے ص ۷۱

بیان کیا ہے

"اس علاقہ میں زیادہ تر عیسائی آباد ہیں، یہ وہ لوگ ہیں، جن میں بنی امیہ و بنی عباس والوں ہی کے زمانہ سے کچھ معاہدات ہو گئے ہیں، اور ان ہی معاہدات کی بنیاد پر یہ اپنے وطن پر قابض ہیں، البتہ معاہدات کی رو سے جو مطالبات ان کے ذمے عائد کئے گئے ہیں ادا کرتے ہیں"[1]

سب کچھ ہوتے کے باوجود معاہدہ کی خلاف ورزی کی جرأت کبھی نہیں ہوئی، بس جو مطالبات معاہدات میں مذکور تھے، وہ ملتے رہنا چاہئے، پھر ملک گیری کی کوئی معمولی حرص بھی نہیں ہوتی تھی، اور یہی نہیں ابن حوقل نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے

"۳۲۵ھ تک یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ان سے جو معاہدہ کیا گیا ہے، اور جن جن باتوں کی ذمہ داری لی گئی ہے، ان کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا سن تک میں نے دیکھا کہ اس علاقہ کے غلاموں کو بغداد میں نہیں خریدا جاتا، اور نہ کوئی ان کی خریداری کو جائز سمجھتا ہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ ان سے عقدِ ذمہ کا معاہدہ ہے"[2]

اسے کہتے ہیں معاہدہ کا پاس، اسی آئین دوستی کا نتیجہ تھا کہ ساری دنیا مسلمانوں پر اعتماد کرنے پر مجبور تھی، قوت مسلمانوں کو بہکایا نہیں کرتی تھی بلکہ آئینِ اسلام پر چلنے میں ممد و معاون ہوا کرتی تھی۔

ابن حوقل خراسانی مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے

"جہاد کرنے میں ان خراسانی مسلمانوں سے اپنی طاقت و قوت اور جوش کے لحاظ سے اسلامی ممالک میں کوئی ملک ان کے جوڑ کا نہیں ہے"[3]

یہ تھا جوشِ جہاد، اس زمانہ کے مسلمانوں میں، پھر اللہ تعالیٰ اس قوم کو عزت و وقار اور شان و شوکت سے کیوں نہیں نوازتا، قاعدہ ہے جس قوم میں جہاد کی ایسی اسپرٹ ہوگی، وہ عظمت و وقار سے زندگی گذارے گی۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک زمانہ ایسا آئے گا جب ساری

---

[1] ہزار سال پہلے ص ۲۷۸ [2] ایضاً ص ۲۷۸ بحوالہ ابن حوقل ص ۲۹۵

دنیا مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے گی، جس طرح کھانے والے کھاتے وقت گوشت کے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں، صحابۂ کرام نے پوچھا کیوں ایسا ہوگا یا رسول اللہ؟ کیا وہ تعداد میں بہت کم ہوجائینگے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، وہ نسبتاً تعداد میں بہت زیادہ ہوں گے، مگر ان میں دو مہلک مرض پیدا ہوجائیں گے، پوچھا گیا، وہ کیا؟ آپ نے فرمایا زندگی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ محبت، اور موت سے ناگواری۔

شاید یہی زمانہ ہمارا یہ دور ہے، کہ مسلمان باایں ہمہ بزدل، دوں ہمت اور کم زور ہورہے ہیں، جس کا حسرت ناک انجام یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ مسلمان کہیں بھی باعزت زندگی کا مالک نہیں رہا، دن رات اس کی ذلت وخواری کسی نہ کسی نہج سے بڑھتی جارہی ہے۔

خراسانی مسلمانوں کے ذوقِ حج کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن حوقل رقمطراز ہے

"ان میں جن لوگوں کا حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے ان کا بھی حال یہ ہے کہ باوجود اتنی بعد مسافت کے حج کا انتہائی ذوق ان لوگوں پر غالب ہے، صحرار کے قطع کرنے میں ان سے زیادہ جری کوئی نہیں[۱]"

ایک طرف جوشِ جہاد سے مسلح تھے، تو دوسری طرف ذوقِ حج کا یہ عالم تھا، کہ صحرار راستہ میں حائل ہیں، آج کی سی سہولت میسر نہیں، پیدل یا اونٹ وغیرہ پر سفر کرکے مکہ معظمہ پہنچ رہے ہیں، اور بیت اللہ کی زیارت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اب یہ ذوق باقی کہاں رہا؟ جانے والے آج بھی جاتے ہیں، مگر دلوں میں وہ امنگ، وہ اخلاص ووفا جو چاہئے کہاں باقی ہے۔

ابن حوقل ہندوستان کے ساحلی علاقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے

"ان شہروں میں جامع مسجدیں پائی جاتی ہیں اور مسلمان اسلامی احکام کی پابندی علانیہ کرتے ہیں[۲]"

آگے شراب وغیرہ کا تذکرکے لکھتا ہے

---

[۱] ایضاً صفحہ ۲۷ [۲] ایضاً صفحہ ۲۴۳

"خدا کی قسم اس کو نہیں جانتا اور نہ اس کو دیکھا ہے اور نہ اس سے واقف ہوں کہ وہ ہے کیا چیز، اور اس کا مزہ کیسا ہے[۱]"

یہ تھا شریعت پر عمل پیرا ہونے کا دینی جذبہ، کہ نہ عوام احکام کی پابندی سے بیگانہ ہیں نہ خواص، ابن حوقل جیسا سیاح قسم کھا کر کہتا ہے کہ شراب سے وہ قطعاً واقف نہیں،

اندازہ لگائیے اس زمانہ کے مسلمانوں کی احکام کی پابندی کا کیا عالم تھا، اب شراب سرمایہ دار اور با اقتدار مسلمانوں کے لئے جزو زندگی کی حیثیت میں ہے، عموماً بڑا شاعر، بڑا عہدے دار، بڑا مالدار اور بڑا سیاح ان خرافات میں زندگی برباد کر رہا ہے، الا ماشاء اللہ، ہاں غریب مسلمان اب بھی بحمد اللہ اس گناہ سے کسی نہ کسی طرح محفوظ ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔

اب ایک سرسری نظر مسلمان حکومتوں کی صنعت وغیرہ پر بھی ڈال لیجئے، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ہزار سال پہلے مسلمان حکومتوں کی بیداری کا کیا حال تھا

کابل کا تذکرہ جہاں کیا، وہاں لکھتا ہے

"کابل سے بہترین سوتی کپڑے باہر بھیجے جاتے ہیں، منیات (ایک قسم کا کپڑا) بنتے ہیں جو چین بھی جاتے ہیں اور خراسان کی طرف بھی روانہ ہوتے ہیں، سندھ اور اس کے ملحقہ علاقوں میں بھی بھیجے جاتے ہیں[۲]"

ملاحظہ فرمایا آج سے ہزار سال پہلے مسلمانوں کا کتنا اچھا حال تھا، کابل سے اونی نہیں سوتی کپڑوں کی غیر ملکوں میں سپلائی ہوتی تھی، آج ان ممالک اسلامیہ میں چلے جائیے اور کپڑوں کو اٹھا کر دیکھئے کہ ان کے بازاروں میں کیا ہوتا ہے تو کسی پر میڈ ان مانچسٹر، اور کسی پر میڈ ان لنکاشائر، لکھا ہوا نظر آئے گا، میڈ ان کابل دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں گی، مگر نظر نہ آئے گا، پھر ہمارے اسلاف دنیا میں با اقتدار کیوں نہیں ہوتے، اور ہم ان کے مقابلے میں مصیبت زدوں کی صف میں کیوں نظر نہیں آئیں۔

اسی طرح ابن حوقل نے ایرانی شہروں میں سے ایک شہر بصنی کے متعلق لکھا ہے

"بصنی میں دری پردے بنے جاتے ہیں، جو روئے زمین میں مشہور ہیں، ان پردوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے "عمل بصنی"[۳]"

---

[۱] ایضاً ... ہزار سال پہلے ص ۲۶۱ بحوالہ ابن حوقل ص ۳۲۸ [۳] ایضاً ص ۲۶۲ بحوالہ ص ۱۷۵

اسلامی ملکوں کے باب میں یہ شہادت ایک مسلمان سیاح کی ہے، اور وہ چشم دید گواہی جس میں شک و شبہ کی کہیں سے کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

کاش مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ پڑھتے اور سوچتے کہ ہم کیا تھے کیا ہو گئے، پھر ایک نئے امنگ و ولولہ کے ساتھ اپنی پچھلی تاریخ دہرانے کی جدّوجہد کرتے، ان کا کام محض عزم وارادہ ہے، پورا کرنے والا خدا ہے، اور ارادہ کے بعد وہ پورا ضرور کرتا ہے۔

ممالک اسلامیہ میں جو کپڑے تیار ہوا کرتے تھے، وہ بہت مضبوط اور پائدار ہوا کرتے تھے۔ عدن، یمن اور ایران کے شہروں کی مصنوعات کا جہاں تذکرہ کیا ہے وہاں لکھا ہے

"شہروں میں ایسے کپڑے بنے جاتے تھے کہ ان کی بقا کی مدّت پانچ برس سے بیس برس تک ہوتی تھی"[1]

اندازہ کیجئے کتنے پائدار اور مضبوط کپڑے تیار ہوا کرتے تھے، گویا گھٹیا درجہ کا کپڑا بھی کم از کم پانچ سال ضرور چلتا تھا۔

ویذاری کپڑا جو سمرقند سے چھ میل کی دوری پر ویذار نامی قصبہ میں تیار ہوتا تھا اور امیر، وزیر، قاضی، فوجی اور سارے دوسرے افراد شوق سے پہنا کرتے تھے، اس ویذاری کپڑے کے متعلق ابن حوقل نے اپنا ذاتی تجربہ لکھا ہے

"میں نے خود ایک سے زائد کپڑے اس کے پانچ پانچ سال تک استعمال کئے ہیں"

اب تو اتنے مضبوط کپڑے تیار بھی نہیں ہوتے، نمائشی تو ضرور ہوتے ہیں، مگر پائدار قطعاً نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ آدمی کا کپڑوں پر کافی صرفہ ہوتا ہے، ہر دوسرے تیسرے مہینے بچوں کے کپڑے بوسیدہ ہو کے بے کار ہو جاتے ہیں، کسی نے بڑی احتیاط برتی تو چھ آٹھ ماہ تک، لیکن پانچ سال اور ان میں جتنا تفاوت ہے ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے۔

مسلمانوں نے علم و فن کی جو قدر افزائی کی وہ انہی کا حصہ ہے جاحظ جو تیسری صدی ہجری کا ایک ادیب ہے خود اس کا بیان ہے

"میں نے کتاب الحیوان لکھ کر عبد الملک الزیات کی خدمت میں ہدیہ کی، تو اس کے صلہ میں پانچ ہزار اشرفیاں اس نے مجھے بھیجیں، پھر میں نے اپنی کتاب "البیان والتبیین" احمد بن ابی داؤد کے دربار میں پیش کی، اس نے بھی اسی وقت پانچ ہزار اشرفی سے میری ہمت افزائی کی، پھر کتاب الزرع والنخل لکھ کر

[1] ایضاً ص۲۵ بحوالہ ص۲۲۳

میں نے ابراہیم بن عباس الصولی کے پاس بھیجی، جواب میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں روانہ کیں[۱]"

یہ تھی علم نوازی، امرائے اسلام کی، اور یہ تھی حوصلہ افزائی اربابِ فضل و کمال کی، پھر علم و فن کو ترقی کیوں نصیب نہ ہوتی، ہوئی اور خوب ہوئی۔

ابن حوقل نے مسجدوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں اس زمانہ کی علمی دلچسپی کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہرات کی مسجدوں کا تذکرہ کرنے کے بعد رقم طراز ہے۔

"وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مسجدوں میں ایک بڑا گروہ علماء اور فقہاء کا مقیم ہے اور جیسے شام یا مسلمانوں کی سرحدی چوکیوں کی مسجدوں کا حال ہے وہی حال ان کا بھی ہے یعنی ان علماء سے استفادہ کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے[۲]"

گویا مسجدوں سے دار العلوم کا کام بھی چلا کرتا تھا اور طلبہ کا ہجوم رہا کرتا ہے۔ اندازِ بیان شاہد ہے کہ مسلمانوں میں علم دوستی کا نشہ تھا۔

ہرات کی طرح بلخ شہر کی پہلے تعریف کرتا ہے، پھر اس شہر کی خوش نمائی کو بیان کرتا ہے اور اخیر میں لکھتا ہے۔

"اس شہر کے باشندوں پر عموماً علم و ادب کا ذوق غالب ہے غور و فکر اور دقیق علوم کے مسائل سے انھیں بڑی دلچسپی ہے، یہاں سے بڑے بڑے علماء اٹھے ہیں[۳]"

اب تو بجائے علم و فن کے کھیل تماشہ کا ذوق غالب ہوتا جا رہا ہے، سنیما تھیٹر کی کثرت ہے کلب گھروں کی بہتات ہے، اور وہ تمام برائیاں جن سے اسلام نے سختی کے ساتھ روکا ہے لوگوں میں پیدا ہوتی جا رہی ہیں، اور حیرت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اس تنزل پر ذرہ برابر افسوس بھی نہیں۔

حکومت گئی، شان و شوکت گئی، دینی وقار گیا، اور حد یہ ہے کہ علم و فن کی محبت بھی جا رہی ہے، ایک سیلاب آیا اور مسلمانوں کی یہ ساری چیزیں اس کی رو میں بہہ گئیں، اور بہتی جا رہی ہیں، یہاں پہنچ کر علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آ رہا ہے، جو انھوں نے نوجوانانِ مسلم کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے، اس کے اخیر میں فرماتے ہیں

حکومت کا کیا رونا کہ وہ اک عارضی شئی تھی — نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی — جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنیؔ روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشہ کن — کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

ابن حوقل جس دور کا تذکرہ کر رہا ہے، اس دور میں مسلمانوں کے بچہ بچہ میں علمی ذوق موجزن تھا، مزدور اور قلی چلتے پھرتے علمی مسائل پر گفتگو کرتے نظر آتے تھے، خود اسی کا اپنا بیان ہے کہ خوزستان کے شہروں میں

---

[۱] ہزار سال پہلے صفحہ ۲۳ [۲] ایضاً صفحہ ۲۲۷ بحوالہ ابن حوقل صفحہ ۳۲۵ [۳] ایضاً صفحہ ۲۲۶ بحوالہ ابن حوقل صفحہ ۳۳۶

یہ نظارہ اس کی آنکھوں نے دیکھا

"میں نے ایک حمّال (قلی) کو گذرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے سر پر... بھاری بوجھ لدا ہوا تھا اور ایک دوسرا حمال بھی اس کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا، اور دونوں "التاویل" (قرآنی آیات کی تفسیر) اور علم کلام کے حقائق و مسائل جھگڑتے جا رہے تھے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان دونوں پر جو بوجھ لدے ہوتے تھے اپنے خیالات کے مقابلہ میں ان کی کوئی پرواہ ان کو نہیں ہے[1]"

ملاحظہ فرمایا، ایک دور وہ تھا، کہ قلی تک علمی مسائل وحقائق پر چلتے پھرتے مباحثہ کرتے نظر آرہے تھے اور ایک یہ ہمارا دور ہے کہ علماء تک کو علمی مسائل سے طبعی ذوق نہیں ہے، یوں فرائض کی حد تک پڑھتے پڑھاتے ہیں، مگر درسگاہ سے باہر کی دنیا میں کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہی وہ حضرات ہیں جن کو معلمین کا درجہ حاصل ہے جہاں دیکھیے شکوہ، غیبت، چغلخوری، حسد اور بغض وکینہ کی گفتگو جاری ہے، بڑا کمال دیکھنے میں آئے گا تو یہ کہ اخباری خبروں پر تبصرہ ہو رہا ہے، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔

جہاں اکابر کا یہ حال ہو، اصاغر کو کون پوچھتا ہے، الناس علیٰ دین ملوکھم طلبہ بھی ذوقِ علم سے قطعاً محروم نظر آئیں گے۔

اسلاف بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھ گئے، آج کوئی ان کا پڑھنے والا نہیں ہے، جہاں کتابیں ہیں کیڑوں کی نذر ہو رہی ہیں، علماء کرام کا بڑا عیب یہ ہے کہ با ایں ہمہ بے ذوقی ہر ایک اپنی جگہ یہ یقین کیے بیٹھا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی عالم کسی عالم کی عزت کرنے کو ایک لمحہ کے لئے آمادہ نہیں۔

آہ کس طرح عرض کروں کہ علم وفن سے اس بے رغبتی پر دل کس قدر رکھتا ہے، مگر اس سے ہوتا کیا ہے۔ کاش اہلِ علم اور اربابِ فضل وکمال خواب سے چونکتے اور اپنے فرائض کا احساس پیدا کرتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب تے نکمے ہیں، نہیں اپنے دوسرے طبقہ سے بہر حال غنیمت ہیں، مگر بیداری کی ضرورت ہے اور جو بیدار ہیں ان میں چستی کا انتظار ہے۔

"مسلمانوں نے رفاہِ عام کے کاموں کی طرف جتنی کافی توجہ دی، بلکہ کہنا چاہئے، جس دور کی باتیں ہو رہی ہیں اس دور میں مسلمان ان کاموں کو اپنا پہلا فریضہ سمجھتے تھے، ذاتی کاموں سے زیادہ ان کو رفاہ عام کے کاموں کا خیال رہتا تھا، ابن حوقل نے لکھا ہے کہ دریائے دجلہ کے انتہائی دہانہ پر ہزار بلّہ کے پاس ایک ایسا گرداب عظیم تھا جہاں جہاز ڈوب جایا کرتے تھے، ہارون رشید کی اہلیہ محترمہ زبیدہ نے اسے پٹوا دیا لکھا ہے۔

"زبیدہ نے اس گرداب کو پہلے کشتیوں کے ذریعے قابو میں لانے کا حکم دیا اور آخر میں مسلسل پتھر کی چٹانوں کو ڈال ڈال کر اس کو بھروا دیا، اور اب بحری سفر کے مسافر اس گرداب کی آفت سے محفوظ ہو گئے[2]"

کیا اب بھی حکمراں طبقہ میں یہ جذبہ باقی رہا؟ کون نہیں جانتا کہ اب دوسرے لوگوں کی طرح مسلمان حکمراں طبقہ میں بھی ذاتی منفعت کا خیال زیادہ پرورش پانے لگا ہے، اپنے معمولی نفع کے آگے رفاہِ عام کے کام کو پیچھے ڈال دیتے ہیں، اگر کوئی راستہ ایسا ہے جس سے حکمراں طبقہ کو جماعتی یا انفرادی طور پر گذرنا پڑتا ہے، تو اسے دیکھیے پختہ، صاف ستھرے اور ہر طرح اچھے نظر پڑیں گے، بخلاف اس کے عام گذرگاہ جن سے ان کو واسطہ نہیں جس حالت میں بھی ہوں، ان کو توجہ نہیں ہوگی۔

---

[1] ہزار سال پہلے ص۲۱۴ [2] ایضاً ص۲۱۵ بحوالہ ابن حوقل ص۱۹۰

ادبیات

مرثیۃ شیخ الاسلام العارف باللہ شیخ العصر مولانا حسین احمد المدنی

از

(استاذ الفاضل مولانا الشیخ محمد یوسف بنوری مدیر دار العلوم الاسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی)

حار الفؤاد و دمع العين قد سكبا　　اذ جاء نا نبأ للعقل مستلبا

نعى الامام الذي فاق الانام علىً　　من لا نظير له في الدهر قد ذهبا

خطب عظيم دها الاسلام زعزعه　　رزء كبير فما للصبر مجتلبا

قضى الحياة الذي تحيى القلوب به　　قضى الحياة ملاذ القوم والنجبا

من كان يطفي لهيب النار لحظته　　من كان يسلي عميد القلب مضطربا

من كان يروي غليل الوجد نبوته　　من كان يشفي عليلا هائما دصبا

من كان يملي مريض العشق صحبته　　من كان يحيي ظلام الليل اذ وقبا

من كان يتلو كتاب الله في دلج　　من كان يسهر للتهجد منتصبا

حسين احمد غيث القوم نجعتهم　　في ارض هند معين الفيض قد نضبا

حنادس الزيغ من ارشاده محيت　　والشمس تكشف من اشراقها الحجبا

منابر الوعظ من تذكيره حليت　　من فيضه قد جلا الاوهام والريبا

معاهد العلم من تدريسه نضرت　　والغيث ينبت بالفيضان مجتدبا

مرابع الرشد من ارشاده عمرت　　والبدر يجلو الدجى من كل ما احتجبا

محافل الساسة الاخيار زينها　　بالفكر للدين في رفع اللوا رغبا

اين الجبين الذي سيما السجود به　　كانه البدر اذ يبدو وفوا عجبا

اين العظيم الذي في الدهر همته　　تعلقت بالثريا جاوز القطبا

اين الكمال الذي تحي الجبال به　　اين الجمال الذي يعلو به شهبا

من للمفاخر او من للمآثر او　　من للمكارم والاخلاق منتدبا

من للشريعة او من للطريقة او　　من للحقيقة والعرفان منتسبا

من للنزاهة او من للتقى مثلا　　حلو الشمائل بالاخلاص محتسبا

من للطائف والتاريخ راوية　　من للمواعظ والارشاد منتصبا

من للسياسة او من للقيادة او　　من للهداية فينا حائز رتبا

اوصافه الغر اضحت في الورى مثلا　　تلك المآثر قد شاعت فلا كذبا

فالصبر والعزم والتقوى وهمته　　من يستطيع لامثال لها طلبا

کم من مُصنّادہرٍ خاض غمرتھا — کم من لیالٍ لہا قد بات مضطربا
اضحت مغانیہ بعد الانس موحشۃ — قد ضاق روض المنی من بعد ما رحبا
شیخ عجائبہ لم تبق فی سمر — ولا عجائب شخص بعدہ عجبا
تلک الحدیقۃ للعرفان قد ذبلت — فکل من جاء بعد الشیخ قد تعبا
تکدرت بعدہ الدنیا وساکنہا — فالعین عبریٰ واضحی القلب منتحبا
والنفس فی عمد الروح فی مکہ — والطرف فی سہد والصبر قد نہبا
یا قلب دع ھذہ الدنیا وبہجتہا — فما قضی لاحد شوقا ولا اُربا
اللّٰہ یبقی دواماً سرمداً ابداً — والکل یفنی بہا والموت قد قربا
یا رب انزل علیہ صوب غادیۃ — من فیض رحمتک الہطلاء والسُحبا
وارزقہ فی جنت الفردوس منزلۃ — علیاء قد جاوزت من کل ما حُتسبا
ثم الصلوٰۃ علی خیر الوریٰ ابداً — ما ناح طیر بغصن البان وانتحبا

نالۂ دل

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کی وفات سے متاثر ہو کر

(جناب اثم مظفر نگری)

بساطِ عشق برہم ہو چکی کر لے فغاں ساقی — صدائے قلقلِ مینا ہے شورِ الاماں ساقی
نجوں آشفتہ پیمانے ہیں شیشے سرگراں ساقی — ہے بیزار نشاطِ بزم مے پیرِ مغاں ساقی
بڑھا ہے اپنی حد سے ظلم مرگِ ناگہاں ساقی — عجب اک داستانِ غم ہے رودادِ جہاں ساقی
چمن میں پھول اور صحرا میں کانٹے وقفِ ماتم ہیں — صبا کی ہو چکی ہے مضمحل نبضِ جواں ساقی
نہیں آتی وہ گلبانگِ سحر اب راہِ منزل سے — جو تھی تبلیغ منزل کارواں در کارواں ساقی
ٹپکتا ہے رگِ ہر گل سے خونِ حسرتِ بلبل — بہاروں پر مسلط ہو چکا دورِ خزاں ساقی
کوئی اب نے رسِ حکمت ئے گا کیوں کر دفترِ گل سے — ہوا رخصت چمن سے علم و فن کا رازداں ساقی
نہیں ممکن کہ پھر تنظیم آئینِ محبت ہو — ہوا ہے اس طرح برہم نظامِ عاشقاں ساقی
ملے کیا ذوقِ نظارہ کو تسکیں جلوۂ گل سے — کہ موجِ رنگ و بو ہے موجِ برقِ آشیاں ساقی
ہوا ہے بند پھر محفل میں دورِ بادۂ عرفاں — خمارِ غم سے مستانِ ازل ہیں سرگراں ساقی
ٹھکانا اب کہاں آوارگانِ کوچۂ غم کا — گیا وہ جس کا دل تھا عشق کا دارالاماں ساقی
کیا کرتا تھا اہلِ دل کی مہمانی جو خوش ہو کر — سرِ جنت ہے وہ اب قدسیوں کا میہماں ساقی
وہی تو ایک یکہ تازِ میدانِ سیاست تھا — نہ تھا کوئی بھی اس منزل میں اس کا ہم عناں ساقی
فضاؤں میں حرم اور دیر کی آج اس کا ماتم ہے — جسے کہتی تھی دنیا قبلۂ روحانیاں ساقی

نہ پوچھ احوالِ ہم آشفتگانِ کوئے وحشت کا — پگھلتا جاتا ہے سوزِ غم سے مغزِ استخواں ساقی

جہاں برہم نہ کیوں ہوتا حسین احمد کی رحلت سے
انھیں حاصل تھا آخر رتبۂ قطبِ زماں ساقی

"رموزِ تواریخ مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ"

۱۹۵۷ عیسوی

"از حقیر ناچیز محمد حسن بدرؔ سنبھلی فاضلِ دیوبند"

۱۹۵۷ عیسوی

"رحلۃ العصر اسیرِ مالٹا"
۱۳۷۷ ہجری

"عالم الاسرار شیخ مولانا حسین احمد مدنیؒ"
۱۹۵۷ عیسوی

"آہ فخرِ آفاق مولانا حسین احمد"
۱۳۷۷ ہجری

"آہ شیخِ بے بدل مولانا حسین احمد مدنیؒ"
۱۳۷۷ ہجری

"شیخِ جنّت مقام مولانا حسین احمد مدنیؒ"
۱۹۵۷ عیسوی

"وداعِ چراغِ محمدؐ"
۱۳۷۷ ہجری

"بہارِ دین آخر شد"
۱۳۷۷ ہجری

"سیدنا مولانا حسین احمد مدنیؒ بدار القرار رفت"
۱۹۵۷ عیسوی

"آہ شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد قدس اللہ سرہٗ"
۱۹۵۷ عیسوی

"اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون ، انّہٗ ھو التوّاب الرحیم"
۱۳۷۷ ہجری

"قطعاتِ عشرتِ جاوید مولانا سیّد حسین احمد"

۵۸۰ + ۷۷ ہجری ۱۳

۱۹۵۷ عیسوی

حضرتِ شیخ چلے سوئے رفیقِ اعلیٰ — بے پس و پیش روانہ ہوئے "لبیک" کہی
بدرؔ نے چاہا کہ "تاریخِ خجستہ" ہو جائے — آئی آواز کہ لکھ "سالِ خجستہ ہجری"

۱۳۷۷ ہجری

بفردوس شد حضرت شیخ جہاں
بنزدِ رسولؐ "سراجاً منیرا"

چہ خوش گفت اے بیدار! رضوانِ جنت
"کما حقہ فاز فوزاً عظیما"

۷۷ ھجری ۱۳

"از فقیر محمد حسن بیدار سنبھلی فاضل دیوبند"

۵۸ عیسوی ۱۹

تاریخہائے وفات

از

(مولانا محمد ادریس نسیم دہلوی)

بسم اللہ الاول الباسط التوّاب الرحمٰن الرحیم

قطعۂ سال وصال ولیِ پاک شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ

۵۷ ع ۱۹

حیطۂ ہر مصرع مزین بتاریخ

۵۷ ع ۱۹

حضرت حسین احمد ولی اللہ و میر
۵۷ ع ۱۹
او محترم، بحر العلوم و کارساز
۷۷ ھج ۱۳

او پیکر حلم و صفا، شیخ الحدیث
۵۷ ع ۱۹
او قوتِ دل، شیریں زباں، مہماں نواز
۷۷ ھج ۱۳

عیسیٰ صفت، فخر زمن، محبوب رب
۵۷ ع ۱۹
شمس الہدیٰ، مردانہ دل، ہم سرفراز
۷۷ ھج ۱۳

او راہبر، او مقتدا، او گنج فضل
۵۷ ع ۱۹
او مظہر الوانِ دیں، او دل گداز
۷۷ ھج ۱۳

اُف! کرد از دنیائے تیرہ دل سفر
۷۷ ھج ۱۳

راقمہ نسیم صدیقی تاریخ گو
۵۷ ع ۱۹

تبصرے

روحِ سخن | از نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مرحوم مرتبہ علی احمد و مشتاق صاحبان جلیلی، فرزندانِ جلیل مطبوعہ قیمہ پریس بمبئی تقطیع خورد، ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہوئی۔ قیمت چار روپیے، پتہ: اے آر نلیانی اینڈ سنز ۸۰ پاکٹ کانفیشن ۲۹۳ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳۔

روحِ سخن جانشینِ امیر مینائی لکھنوی جناب جلیل کا آخری دیوان ہے جس کو مرحوم کے لائق صاحبزادوں علی احمد اور مشتاق صاحبان نے دل پذیر ترتیب کے ساتھ خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ جلیل ہمارے دور کے سنجیدہ، کہنہ مشق، پختہ کلام، سہل نگار اور عام شاعری کے بگڑے ہوئے تیوروں سے لڑنے والے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے فن کو بے علمی اور کم سواری کی آندھیوں سے احتیاط و بصیرت کے ساتھ بچائے رکھا اور آخر وقت تک اپنے مقام پر جمے رہے۔ مرحوم کا پہلا دیوان "جانِ سخن" ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ دوسرا اور آخری مجموعہ نکلا ہے۔ "روحِ سخن" کو دو دوروں پر تقسیم کیا گیا ہے، دورِ اول میں غزل گوئی کا قدیم انداز نمایاں ہے اور دورِ دوم میں جدید رنگ نکھرا ہوا ہے۔ دونوں رنگ پختہ اور لائقِ دید ہیں، شروع میں ترقی پسند ادیب و شاعر سردار جعفری کا دیباچہ ہے جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ ہے، اسی کے ساتھ مرحوم کے صاحبزادے مشتاق صاحب کا تعارف بھی شامل ہے جس میں انھوں نے "روحِ سخن" کی تاریخ اور خصوصیات بیان کی ہیں، اس کے بعد جلیل کی ایک قلمی تحریر کا عکس اور ان کی زندگی کی آخری غزل دی گئی ہے، جس کا ایک ایک شعر موتیوں سے تولنے کے قابل ہے، فرماتے ہیں

کدھر چلے ہیں مرے اشک رواں نہیں معلوم　　بھٹک رہا ہے کہاں کارواں نہیں معلوم
اٹھا دیا تو ہے لنگر ہوا کے جھونکوں میں　　کدھر سفینہ ہے ساحل کہاں نہیں معلوم
ہماری بے خودیِ شوق کا یہ عالم ہے　　کہ آشیاں میں ہیں اور آشیاں نہیں معلوم
ترانہ کش بھی ہزاروں ہیں نالہ کش بھی ہزار　　مجھی سے کیوں ہے چمن بدگماں نہیں معلوم

پورا مجموعہ ۱۲۰ غزلوں پر مشتمل ہے اور ادب و شعر کے پاکیزہ مذاق کا مرقع، دیوان کی آخری غزل کا آخری شعر بھی سنتے جائیے۔

جی میں آتا ہے کہ لکھّے کو مقدر کے جلیل　　میں مٹا دوں در جاناں پہ جبیں گھس گھس کے

بُرہان

جلد ۴۰ شمارہ ۲

فروری ۱۹۵۸ء مطابق رجب المرجب ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

گذشتہ ماہ جنوری کی ۱۸ ار اور ۱۹ ار کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے زیر انتظام مشہور عرب مورخ المسعودی کا جشن ہزار سالہ بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ یہ اجتماع اس اعتبار سے بین الاقوامی تھا کہ ملک کے علمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے نمائندوں کے علاوہ امریکہ۔ روس۔ دول متحدۂ یورپ۔ ایران۔ لبنان وغیرہ کے فضلا نے بھی شرکت کی اور اجتماع کی کارروائیوں میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا۔ جناب اے۔ اے۔ فیضی وائس چانسلر کشمیر و جموں یونیورسٹی نے خطبۂ افتتاحیہ میں یونیورسٹی کے نظم و نسق اور اس میں علومِ اسلامیہ کی تعلیم سے متعلق جو خیالات ظاہر کئے اگرچہ ان سب سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا لیکن بعض باتیں بڑے کام اور تجربہ کی کہیں۔ دوسرے دن کی نشستوں میں المسعودی پر جو مقالات پڑھے گئے ان کو معیاری اور محققانہ نہیں کہا جا سکتا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چند مہینوں میں المسعودی جیسے غیر معمولی مورخ اور جغرافیہ داں پر کوئی سیر حاصل تحقیقی مقالہ تیار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم امید ہے کہ شعبہ کی طرف سے المسعودی پر مقالات کا جو مجموعہ شائع ہوگا وہ ٹھوس مقالات و مضامین پر مشتمل ہوگا اور وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے علمی دنیا کے لئے ایک وقیع تحفہ ہوگا۔

پروگرام کے مطابق تیسرے روز یعنی ۲۰ جنوری کو علوم و فنونِ اسلامیہ کی کانفرنس ہوئی جس میں اس پر بحث ہوئی کہ ”اسلامیات“ کی تعلیم سے کیا مراد ہے۔ اور اس کے حدودِ اربعہ کیا ہیں؟ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب صدر شعبہ نے بحث کا آغاز کیا اور اس میں ملکی اور غیر ملکی فضلاء نے دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں اگرچہ فیصلہ تو کچھ نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مختلف نقطہائے نظر سامنے آگئے اور ایک کمیٹی اس غرض کے لئے بن گئی ہے کہ وہ شعبۂ اسلامیات

کے لئے نصاب اور اُس کے متعلقہ امور پر غور وخوض کر کے اپنی سفارشات پیش کرے گی نیز یہ بھی طے پایا کہ ملک میں اسلامیات کا ذوق عام کرنے اور اُس سے دل چسپی پیدا کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً علوم وفنونِ اسلامیہ کی کانفرنس ملک کے مختلف گوشوں میں منعقد کی جائے

اس طرح تین دن تک یونیورسٹی میں خوب چہل پہل رہی - ان اجتماعات کی ہر چیز سے ایک خاص سلیقہ اور حسنِ ترتیب و انتظام کا رنگ نمایاں تھا پھر لنچ - ڈنر اور عصرانہ کے انتظامات اس قدر شاندار اور پُر تکلف کہ انھیں دیکھ کر جاگیر داری عہد میں مسلمانوں کی تہذیب کی یاد تازہ ہوتی تھی -

---

اس مرتبہ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یونیورسٹی کے طلبار میں علماً وعملاً اسلامیات کا ذوق بہت ترقی کر گیا ہے وہ ان مباحث میں بڑی دل چسپی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں اور اُن مسائل و معاملات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے ہیں جو موجودہ بین الاقوامی اور ملکی سیاسیات کے اسلامی تہذیب وکلچر پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں - خاص راقم الحروف کی تقریر کے لئے طلبار نے دو جلسے منعقد کئے پہلی تقریر "اسلامی تہذیب" پر ۱۹ر جنوری کو مغرب کے بعد وقار الملک ہال میں ہوئی اور دوسری تقریر ۲۰ر کو اسلام اور امنِ عالم کے موضوع پر اسی وقت یونین ہال میں ہوئی - ان دونوں تقریروں میں بعض اساتذہ کے علاوہ طلبار کافی تعداد میں موجود تھے اور انھوں نے بڑی خاموشی اور توجہ کے ساتھ تقریریں سنیں - اسلامیات کی طرف طلبا کا جو رجحان اور میلان بڑھ رہا ہے غالباً یہ اس کا اثر ہے کہ مسجد میں نماز کے وقت جتنے طلبا اس مرتبہ نظر آتے تھے پہلے نہیں آتے تھے اور پھر جتنے طلبار کے چہروں کو اس مرتبہ ڈاڑھی کے ساتھ دیکھا ہے اتنے کبھی نظر نہیں آئے - یہ سب طلبار جب کسی تقریب سے یک جا ہوتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں علی گڈھ کے بجائے دیوبند یا ندوہ میں بیٹھا ہوا ہوں - طلبار میں یہ تدریجی ذہنی

انقلاب یونیورسٹی کے اور خود ہند میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے بڑی فالِ نیک اور بہت خوش آیند ہے۔

یہ بات بڑی امید افزا ہے کہ دلی میں اردو کانفرنس ایسے زمانہ میں منعقد ہو رہی ہے جب کہ ہوا بہت کچھ ساز گار ہو گئی ہے اور اردو کے طبعی حقوق و مطالبات پر لوگوں نے بے تعصبی اور ایمانداری سے غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ ملک کے سنجیدہ اربابِ فکر و نظر کی بھاری اکثریت اردو کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے اور ان میں اُس کا طبعی حق دلانے کا جذبہ روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ غالباً یہ پہلی اردو کانفرنس ہے جس کو وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو خطاب فرمائیں گے اور اس کا افتتاح کریں گے لیکن یہ وقت جوش سے زیادہ ہوش سے کام کرنے کا ہے۔ اردو تحریک کا مقصد صرف اردو کا طبعی حق منوانا ہے۔ ہندی کی مخالفت کرنا نہیں۔ ہندی کے ساتھ یوں بھی اُردو کا رشتہ ناتہ بہت پرانا اور مضبوط ہے، اور لسانی حیثیت سے دونوں ایک ہی ماں کا دودھ پی کر بڑھیں اور جوان ہوئی ہیں اس لئے کانفرنس کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ آج کل ملک کے بعض حصوں میں ہندی کی جو معاندانہ مخالفت ہو رہی ہے اُس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے، اور اشارۃً و کنایۃً بھی اُس کے ساتھ ہمدردی ظاہر نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ ضرورت ہے کہ اردو زبان کی ترقی اور اُس کی حفاظت کے لئے ایک ایسا وسیع اور ہمہ گیر پروگرام ملک کے سامنے پیش کیا جائے کہ زبان اور اُس کے ادب میں اس وقت جو انجماد و سکون پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہو اور اُس کی رگوں میں زندگی کا نیا خون تیزی کے ساتھ دوڑنے لگے۔ یقین ہے کہ یہ کانفرنس اُردو کی تحریک میں ایک نیا مگر نہایت مؤثر و کامیاب موڑ ثابت ہوگی۔

حضرت ابوبکر کے سرکاری خطوط

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق اُستاذ ادبیات عربی دہلی یونی ورسٹی)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابتہ ماہ نومبر ۱۹۵۸ء)

(۴)

۲۴ - یزید بن ابی سفیان کے نام

جس طرح ابوعبیدہ کے جاسوسوں نے قیصر روم کی جنگی تیاریوں سے ان کو مطلع کیا۔ اسی طرح یزید کے جاسوسوں نے قیصر کی نقل و حرکت اور عسکری مساعی سے ان کو بھی باخبر رکھا۔ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ یزید ابن ابی سفیان شام کے مورچہ پر ابوبکر صدیق کے پہلے سالار تھے۔ وہ اس وقت کہاں تھے؟ ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتے، ازدی نے ان کے میدانِ عمل سے ہمیں بالکل بے خبر رکھا ہے۔ غالب قرینہ ہے کہ وہ اس وقت دریائے اُردن[1] کے مشرقی گندم خیز علاقہ کی تسخیر میں مصروف تھے۔ آئی ہوئی خبروں کی بنیاد پر انھوں نے مرکز کو جو رپورٹ بھیجی اُس میں تھا:

"شاہِ روم کو ہماری چڑھائی کی جب خبر ہوئی تو خدا نے اُس کے دل میں ایسا رُعب ڈالا کہ وہ (فلسطین چھوڑ کر) انطاکیہ چلا گیا، اس نے اپنی فوج کے رومی سالاروں کو شام کے مرکزی شہروں پر کمانڈر مقرر کیا ہے اور ان کو ہم سے لڑنے کا حکم دے دیا ہے، وہ لڑائی کے لئے تیار ہو گئے ہیں، شام کے اُن رئیسوں نے جن سے ہم نے معاہدے کئے ہیں، خبر دی ہے کہ ہرقل نے اپنی بیرونِ شام قلمرو سے بھی فوجیں بلائی ہیں جو بڑی تعداد اور پورے سازوسامان سے آرہی ہیں، اب بتائیے آپ کا کیا حکم ہے، اپنی رائے سے مطلع کیجئے تاکہ ہم اس کے مطابق عمل کریں" (فتوح الشام ازدی ص۲۵)

---

[1] بوحیرۂ طبریہ کو بحرمیت سے ملاتا ہے، دیکھئے نقشہ

ابوبکر صدیق کا جواب :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ شاہِ روم کے دل میں مسلمان نوجوں کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ (فلسطین، دمشق اور حلب سے بھاگتا ہوا) انطاکیہ چلا گیا۔ جب ہم رسول اللہ کے ساتھ تھے تو خدا نے جس کے ہم سپاس گذار ہیں ایک طرف مشرکوں کے دلوں میں رُعب ڈال کر اور دوسری طرف ملائکۂ کرام بھیج کر ہماری مدد فرمائی۔ جس دین کے قیام کے لئے اللہ نے رُعب و ہیبت سے کل ہماری مدد کی، اسی دین کی آج بھی ہم دعوت دے رہے ہیں۔ تمہارے رب کی قسم! اللہ مسلمانوں کا انجام مجرموں کا سا نہیں کرے گا اور جو لوگ کہتے ہیں "سوائے اللہ واحد کے کوئی دوسرا معبود نہیں" ان کا مقدر ان لوگوں کا سا نہ ہوگا جو اللہ کے ساتھ دوسرے خداؤں کی عبادت کرتے ہیں، اور کئی کئی خداؤں کے قائل ہیں۔ جب تم شاہ روم کی فوج سے مقابل ہو تو ان پر ٹوٹ پڑنا اور خوب لڑنا۔ اللہ ہرگز تمہاری مدد سے ہاتھ نہیں اُٹھائے گا۔ اُس تبارک و تعالیٰ نے ہم کو خبر دی ہے کہ چھوٹی فوج اس کے کرم سے بڑی فوج پر غالب آجاتی ہے: بہر حال میں تمہارے پاس پے در پے رسد بھیجوں گا، اتنی کہ تمہاری ضرورت رفع ہو جائے گی اور تم فردِ واحد تک کی کمی محسوس نہیں کروگے ان شاء اللہ، والسلام علیک ورحمۃ اللہ" (فتوح الشام ازدی صفحہ ۲۶)

یزید کا اور اس سے پہلے ابو عُبیدہ بن جراح کا مراسلہ پڑھ کر ابو بکر صدیق کے دل میں نہ تو خوف پیدا ہوا اور نہ اُن کے "عزم تسخیر" میں کوئی کمزوری آئی۔ ان کو یقین تھا کہ شام فتح ہوگا اور رسول اللہ کی پیش گوئی پوری ہو کر رہے گی۔ انھوں نے فوجی فراہمی کی کوشش تیز تر کر دی۔ تینوں سالاروں کے شام روانہ ہونے کے بعد یمن سے برابر چھوٹی بڑی ٹولیاں اور قبائلی رئیس مع ماتحت قبائل کے مدینہ آتے رہے تھے جن کو ابو بکر صدیق ان سالاروں سے ضم ہونے بھیج دیتے تھے، نو واردوں کا کچھ حصہ تو سالاروں سے جا ملا تھا

اور کچھ ابھی راستہ میں تھا۔ یزید اور ابو عُبَیدہ کے مذکورہ بالا مراسلوں کے بعد ابو بکر صدیق نے جہاں جہاں امید تھی اپنے افسروں کو فوری خط لکھے اور فوجیں طلب کیں۔ عربستان کے انسانی سوتے کچھ تو پہلے ہی کھل چکے تھے اور کچھ نئے اب کھل گئے۔ چند ہفتوں میں مدینہ کے باہر ایک رعب دار کیمپ بن گیا مکّہ کے بہت سے قُرَشی اور مقتدر اشخاص بھی اسلام کے لئے قربانی دینے آ گئے، ابو بکر صدیق نے اس نئی فوج کا کمانڈر عمرو بن عاص کو مقرر کیا۔ اس وقت شام کے مورچوں پر تین سالار تھے: ابو عبیدہ جابیہ میں (دمشق کی عملداری) یزید بن ابی سفیان غالباً اُردن کے علاقہ میں، اور شرحبیل بن حسنہ، ان کے میدانِ عمل سے ہم بالکل ناواقف ہیں، جنگِ اَجنادین[1] سے پہلے اَزدی نے اُن کو بُصریٰ[2] میں بتایا ہے، جو جابیہ کے جنوب میں ایک سرسبز اور زراعت سے بھرپور ضلع کا صدر مقام تھا۔ عمرو شام کے جغرافیہ اور حالات سے واقف تھے، مشکلات اور خطروں پر فتح پانے کی ان میں خاص صلاحیت تھی، فکر و نظر کے مالک بھی تھے ان کو فوج کے ساتھ جابیہ بھیج دیا گیا جو اس وقت شام میں مسلمانوں کا سب سے اہم اور بڑا کیمپ تھا۔ عمرو کے آنے سے ابو عبیدہ اور اُن کے ساتھیوں کو بڑی تقویت ہوئی۔

۳۔ ابو عُبَیدہ بن جرّاح کے نام

مدینہ سے مسلمان سالاروں کو مدد بھیجنے کی خبر سارے شام میں پھیل گئی اور مخبروں نے رسد کے اعداد و شمار اتنے بڑھا چڑھا کر بیان کئے کہ شام کے فوجی حلقوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا، فوراً قیصر کے پاس سفیر دوڑائے گئے اور رسد طلب کی گئی۔ قیصر نے حوصلہ افزا جواب دیا جس کے آخری الفاظ تھے:

"اتنی فوجیں بھیجوں گا کہ زمین پر ان کا سمانا مشکل ہو جائے گا" مسلمان سمجھے تھے کہ ان کو بس شام کی مقامی فوجوں سے لڑنا ہوگا، پر جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ آسیا صغریٰ، آرمینیہ اور قسطنطنیہ کی فوجوں سے نمٹنا ہے تو وہ گھبرائے۔ بڑے سالار ابو عبیدہ نے مرکز کو یہ رپورٹ بھیجی:

میرے جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ بیرونِ شام کی امدادی فوج کے پہلے دستے شاہِ روم کے پاس

---

[1] دیکھئے نقشہ [2] دیکھئے نقشہ۔

پہنچ چکے ہیں، نیز یہ کہ شام کے بڑے شہروں کے سالاروں نے "رسد" کے لئے اس کے پاس سفیر بھیجے ہیں اور اس نے ان کو لکھا ہے:

"تمھارے ایک بڑے شہر کی آبادی کل عرب فوجوں کی تعداد سے زیادہ ہے، ڈرو مت، لڑنے نکل جاؤ، تمھارے پیچھے پیچھے رسد بھی آتی ہے" یہ خبریں ہم کو موصول ہوئی ہیں۔ مسلمان لڑنے سے گھبرا رہے ہیں....." (فتوح الشام ازدی ص۳۷)

ابوبکر صدیق کا جواب:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تمھارا خط آیا جس میں تم نے لکھا ہے کہ دشمن کی فوجیں تم سے لڑنے روانہ کردی گئی ہیں[1]، نیز یہ کہ ان کے بادشاہ نے اتنا بڑا لشکر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے "جس کا زمین پر سمانا مشکل ہوجائے گا"۔ خدا کی قسم، تمھاری وہاں موجودگی سے زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود اس پر اور اس کی فوجوں پر تنگ ہوگئی ہے! بخدا مجھے تو یہ امید ہے کہ تم عنقریب شاہِ روم کو اس جگہ سے نکال باہر کروگے جہاں وہ اس وقت مقیم ہے (یعنی انطاکیہ) تم اپنے رسالے دیہاتوں اور مزروعہ بستیوں میں پھیلا دو اور شامی فوجوں کو غلہ اور چارہ سے محروم کرکے ان کی زندگی وبال کردو۔ بڑے شہروں کا محاصرہ اس وقت تک نہ کرنا جب تک میرا حکم نہ آئے، اگر دشمن تم سے لڑنے بڑھے تو تم بھی لڑنے بڑھو اور خدا سے دعا کرو کہ ان پر غلبہ عطا کرے۔ ان کے پاس جتنی رسد آئے گی میں اتنی یا اس سے دُگنی رسد بھیجوں گا۔ خدا کا شکر ہے نہ تو تمھاری تعداد کم ہے، اور نہ تم کمزور ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا پھر تم ان سے لڑتے کیوں گھبراتے ہو، اللہ ضرور تم کو فتح عطا کرے گا اور دشمن پر غالب کرے گا، ولمتلمس منکم النشکر لینظر کیف تعلون (؟) عمرو کے ساتھ اچھا طرزِ عمل رکھنا میں نے ان کو سمجھا دیا ہے کہ صحیح مشورہ دینے سے دریغ نہ کریں، وہ تجربہ کار

---

[1] ابوعبیدہ کی رپورٹ میں روانگی کی نہیں بلکہ تیاری کی خبر ہے۔

اور صائب رائے آدمی ہیں۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ۔" (فتوح الشام ازدی ص۲۲)

۴۴۔ خالد بن ولید کے نام

مذکورہ بالا خط وکتابت اور سالارانِ شام کی رپورٹوں کو اس بڑی جنگ کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے جو اجنادین کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے ابھی پڑھا کہ ابو بکر صدیق نے ابو عُبیدہ اور یزید بن ابی سفیان کے تازہ ترین خطوط کے زیر اثر عمرو بن عاص کی قیادت میں خاصی فوج بھیجی تھی، آپ نے یہ بھی پڑھا کہ اس سے پہلے مرکز کی طرف سے دستے اور مسلح جتھے برابر شام کو جاتے اور وہاں کی فوجوں میں ضم ہوتے رہے تھے، سب ملا کر اسلامی فوج کی تعداد بیس بائیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ گو ابو عبیدہ بن جراح کو عمرو بن عاص اور ان کے ساتھ آئی ڈھائی ہزار فوج سے کافی تقویت ہوئی پھر بھی وہ اور دوسرے سالار اپنی طاقت کی طرف سے مطمئن نہ تھے اور ان کی فوج کے حوصلے تو یقیناً پست تھے جیسا کہ ابو عبیدہ کی مرکز کو بھیجی رپورٹ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے: "وانفس المسلمین لینۃ بقتالھم" (ازدی ص۳۱)

مسلمانوں کی دہشت کے کئی سبب تھے: شام کے مقامی جاسوسوں اور معاہد امراء نے مسلمانوں کے سامنے قیصر کی عسکری تیاریوں کی خبریں ایسی بڑھا چڑھا کر پیش کی تھیں کہ ان کے دل دہل گئے تھے، ان کو بتایا گیا تھا کہ رومی فوج میں صرف اہلِ شام کے علاوہ قیصر کی بیرونِ شام قلمرو۔ جزیرہ، ایشیا صغریٰ، آرمینیہ اور یورپ سے طلب کی ہوئی فوجیں بھی شامل ہیں اور ان کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے۔ ان خبروں کے پس منظر میں وہ دو شکستیں تھیں جو مسلمانوں کو شام کے مورچہ پر ہو چکی تھیں، ایک رسول اللہ کے آخر عہد میں جب اُن کے بھیجے ہوئے دستوں کو موتہ کے مقام پر قیصر کی فوج نے بُری طرح پسپا کیا تھا اور دوسرے خالد بن سعید کی حالیہ تباہی جس میں ان کے صاحبزادے اور بہت سے مسلمان کام آئے اور وہ خود بال بال بچے تھے۔ ابو بکر صدیق کو محاذِ شام کے مسلمانوں کی اس دہشت کا علم تھا، جہاں تک فوجی طاقت بڑھانے کا سوال تھا وہ جو کچھ ان کے بس میں تھا کر رہے تھے اور اب تک بیس بائیس ہزار فوج شام کے مورچہ پر بھیج چکے تھے۔ اتنی بڑی جمعیت اسلام میں پہلے

کبھی محاذِ واحد پر جمع نہیں ہوئی تھی، لیکن "تعداد فوج" کو ان کی میزان فتح و شکست میں وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو مجاہدینِ اسلام کے جذبۂ سرفروشی اور خود اعتمادی کو تھی، اس لئے انھوں نے مناسب سمجھا کہ ایک ایسے شخص کو سالارِ اعلیٰ مقرر کریں جو فوجی سمجھ بوجھ کے ساتھ سرفروشی اور خود اعتمادی کے نشہ میں سرشار ہو، ان کی نظرِ خالد بن ولید پر پڑی، یہ خالد جب سے اسلام لائے دسیوں جنگوں میں قائد رہ چکے تھے، اور کبھی ان کا جھنڈا نیچا نہیں ہوا تھا، یہ دشمن کی کثرت اور اپنی قلت کو خاطر میں نہ لاتے تھے، بلکہ ان کے جوہر ایسے موقعوں پر اور زیادہ کھلتے جہاں ان کی طاقت فریقِ ثانی سے نمایاں طور پر کم ہوتی، ان کی تلوار ہی میں جادو نہ تھا، ان کی شخصیت بھی کمال کی تھی، ان کے جھنڈے تلے آکر ان کے ماتحتوں میں بھی کچھ ویسی ہی لگن اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی جس سے خود ان کا سینہ گرم رہتا۔ ہمارے بعض مورخ بتاتے ہیں کہ ابوبکر صدیق کے پہلے سالارِ شام خالد بن سعید کو مرج الصّفر[1] (دمشق کی جنوبی عملداری) میں زک دے کر رومیوں نے فخر سے کہا تھا: "بخدا ہم ابوبکر کی ایسی خبر لیں گے کہ وہ ہمارے ملک پر ترکتازی کرنا بھول جائیں گے۔" اس کے بعد وہ بڑے پیمانہ پر فوجی تیاری کرنے لگے اور ان کا ارادہ غالباً یہ تھا کہ مدینہ پر فوج کشی کر کے اسلامی حکومت کی جڑیں کاٹ دیں۔ کچھ عرصہ بعد خالد کو شامی فوجوں کا سالارِ اعلیٰ مقرر کر کے ابوبکر صدیق کے حوصلے اتنے بلند ہوئے کہ وہ بولے: "بخدا میں خالد سے رومیوں کو ایسی مار لگواؤں گا کہ ان کے شیطانی وسوسے پراگندہ ہو جائیں گے۔" (تہذیب ابن عساکر، مصر، ۱/۱۳۶) خالد اس وقت عراق کے مورچہ پر سرحدی رئیسوں کو صلح اور جزیہ کے ذریعہ مسخر کر کے عراق کی باقاعدہ فتوحات کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے کہ ابوبکر صدیق کا یہ ارجنٹ مراسلہ موصول ہوا:

"واضح ہو کہ جب تم کو میرا یہ خط ملے تو ان لوگوں کو چھوڑ کر جو تمھارے عراق پہنچنے سے پہلے وہاں موجود تھے، چل دو، اور اپنی فوج کے ان مردانِ کار کو ساتھ لے کر جو یمامہ میں تمھارے ہمرکاب تھے، یا یمامہ سے عراق کے سفر میں تم سے آملے تھے یا حجاز سے تمھارے پاس آگئے تھے، بعجلت تمام شام کا رُخ کرو اور ابوعبیدہ

[1] مرج الصّفر، دمشق سے بیس میل جنوب میں ایک میدان تھا۔ تاریخ عرب، ہٹی ص ۱۵۰

اور ان کی فوجوں سے مل جاؤ، وہاں پہنچ کر ساری فوج کے سالارِ اعلیٰ تم ہوگے،
والسلام علیکم۔" (فتوح الشام ازدی ص۵۷-۵۸ وتہذیب ابن عساکر ۱/۱۳۸)

۴۵- ابو عبیدہ بن جراح کے نام

جب ابوبکر صدیق نے ابو عبیدہ کو افواجِ شام کی سپہ سالاری سے معزول کر کے خالد بن ولید کو اس عہدہ پر مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو عمر فاروق نے اس کی مخالفت کی۔ ہمارے مورخوں نے اس مخالفت کے کئی سبب بیان کئے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ خالد اور عمر فاروق میں جو قریبی رشتہ دار تھے لڑکپن سے چشمک تھی، دوسری روایت یہ ہے کہ خالد نے ابوبکر صدیق کے عہدِ خلافت میں عمر فاروق کی شان میں ایسے لفظ کہے جن سے ان کو دکھ ہوا اور وہ خالد سے ناراض ہو گئے، تیسرا قول ہے کہ عمر فاروق کی خالد سے برہمی کا سبب مالک بن نُویرہ کا افسوسناک قضیہ تھا، مالک جن کو خالد نے اسلام سے باغی سمجھ کر قتل کرا دیا تھا، اور جن کو عمر فاروق ثقہ شاہدوں کی شہادت کی بنا پر مسلمان باور کرتے تھے، چوتھا قول یہ ہے کہ عمر فاروق کو خالد کی بے باک تلوار اور مسرفانہ فیاضی ناگوار تھی۔ ان سب کے علاوہ مخالفت کا ایک اور وزنی سبب یہ تھا کہ خالد نو مسلم تھا اور ابو عبیدہ قدیم الاسلام، عمر فاروق کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ایک نو آزمودہ مسلم کو ایک پرانے اور اسلام کی ابتدائی آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والے صحابی، پختہ کار مجاہد اور مدبر پر فوقیت حاصل ہو۔ ابوبکر صدیق جو عمر فاروق کی بات بہت کم ٹالتے تھے، خالد کے معاملہ میں ان سے اتفاق رائے نہ کر سکے، ان کے سامنے اس وقت نئے یا پرانے مسلمان کا مسئلہ نہ تھا، نہ زیادہ اور کم خدمات کا، نہ سیرت کے اعتبار سے بڑھیا گھٹیا کا، انھوں نے خالد کو صرف اس اعتبار سے ترجیح دی کہ وہ ایک طرف لڑائی کے فن اور لڑائی کے تجربہ میں دوسرے سالاروں سے گوئے سبقت لے گئے تھے اور دوسری طرف خود اعتمادی کے زیور سے زیادہ آراستہ تھے۔ ابو عبیدہ کی معزولی کے فرمان کا مضمون یہ تھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ واضح ہو کہ میں نے شام میں رومیوں سے لڑائی کی

کمانِ اعلیٰ خالد کو دے دی ہے، تم اُن کی مخالفت نہ کرنا، ان کی بات ماننا اور ان کی رائے پر عمل کرنا۔ میں نے یہ جانتے ہوئے کہ تم خالد سے بہتر ہو ان کو تمھارا افسرِ اعلیٰ بنا دیا ہے، میرا خیال ہے کہ ان کو جنگی معاملات کی تم سے زیادہ سمجھ بوجھ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہمیں اور تمھیں سیدھے راستے پر گامزن رکھے، والسلام علیک ورحمۃ اللہ۔" (ازدی صلا)

ربیع الاول ۱۳ھ میں خالد اپنا نیا عہدہ سنبھالنے عراق سے شام روانہ ہوئے۔ عراق سے نکل کر سرحد شام میں جب داخل ہوئے تو انھوں نے ایک مراسلہ شام کے مسلمانوں کو اور دوسرا ابو عبیدہ بن جراح کو بھیجا۔ مسلمانوں کو لکھا تھا "میں آپ کا سالارِ اعلیٰ مقرر کیا گیا ہوں اور بہت جلد آپ سے آملوں گا، خاطر جمع رکھئے اور بالکل نہ گھبرائیے، خدا کا وعدہ عنقریب پورا ہونے والا ہے۔" خالد نو مسلم تھے یعنی فتح مکہ (۸ھ) سے کچھ پہلے مسلمان ہوئے، اس کے برخلاف ابو عبیدہ مہاجرین اولین اور رسول اللہ کے عزیز ترین ساتھیوں میں سے تھے، ان کی خدمات جنگ و امن دونوں میں شاندار تھیں، عادات و اطوار پسندیدہ تھے۔ رسول اللہ کے صحابہ میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا، عمر فاروق ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ خالد کو اس خیال سے غیرت سی آئی کہ وہ افسر اور ابو عبیدہ جیسی بھاری بھرکم شخصیت کے صحابی ان کے ماتحت ہوں، اس احساس کے زیرِ اثر انھوں نے ابو عبیدہ کو جو پُر انکسار اور معذرت آمیز خط لکھا وہ پڑھنے اور داد دیجئے:-

"بسم اللہ الرحمن الرحیم: ابو عبیدہ بن جراح کی خدمت میں خالد بن ولید کی طرف سے، سلام علیک میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ خدا سے التجا ہے کہ خوف کے دن (قیامت) مجھے اور آپ کو دوزخ کی سزا سے امان میں رکھے اور دنیا میں آزمائشوں اور مصیبتوں سے۔ خلیفہ رسول اللہ (ابوبکر) کا فرمان موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ شام جا کر وہاں کی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لوں۔ بخدا میں نے نہ تو اس عہدہ کی درخواست کی نہ اس کی خواہش، اور نہ اُن سے اس باب میں کوئی خط و کتابت۔ آپ پر خدا کی رحمت (میرے سالارِ اعلیٰ ہونے کے باوجود) آپ کی حیثیت وہی رہے گی جو تھی، آپ کے کسی حکم کو ٹالا نہ جائے گا، نہ آپ کی رائے اور مشورہ کو نظر انداز کیا جائے گا اور نہ آپ کی صلاح بغیر کوئی فیصلہ ہوگا، آپ مسلمانوں کی ایک برگزیدہ شخصیت ہیں، نہ تو آپ کے فضل سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ آپ کی رائے سے بے پروائی برتنا ممکن ہے، م

م خدا سے دعا ہے کہ ہمیں اور آپ کو [illegible] تک پہنچائے اور مجھے اور آپ کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے، والسلام علیک ورحمۃ اللہ۔" (فتوح الشام ازدی ص۸۲)

اسلامی صنائع لطیفہ اور یورپی صنائع پران کا اثر

از

(اے - ایچ - کرسٹی)

مترجمہ

(جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت، لکچرر، کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، گلبرگہ)

[ذیل کا مقالہ مشہور انگریزی کتاب "لگیسی آف اسلام" کے مقالہ "اسلامک مائنز آرٹس" کا ترجمہ ہے]

جب اسلام کی ڈرامائی توسیع شروع ہوئی تو مغرب میں اس کا گزر ایسے راستے سے ہوا جہاں آرٹ قدیم اور غیر ترقی یافتہ حالت میں تھا۔ مغرب میں اس کی اشاعت کے ساتھ ہی بحر الکاہل کے ساحل پر بسے ہوئے شہروں میں آرٹ کی ایک نئی شکل کی تخم ریزی مقدر ہو گئی۔ عرب میں جس طرح کا آرٹ موجود تھا وہ یا تو قدیم زمانے کی بے جان باقیات تھی یا یہ آرٹ ایک طرح کی نقالی تھی۔ یہ نقالی ایک طرح بیرونی ملکوں کا پرتو تھا جو بعض مقامات پران کے عروج سے پڑا تھا۔ عرب کے ان شاداب علاقوں میں بھی کسی نمایاں خصوصیت کا حامل کوئی مقامی آرٹ پیدا نہ ہوا جہاں مقیم آبادی پھلتی پھولتی تھی۔ یہاں کے حالات ان حالات سے بالکل مختلف تھے جو صحرا کے بدویوں کو انجماد کی حالت میں سب سے الگ تھلگ رکھتے تھے۔ اسلامی آرٹ کو اس کا روحانی مزاج عرب سے ملا لیکن اس کا مادی ڈھانچہ کہیں اور تیار ہوا۔ یہ ڈھانچا ایسے ملکوں میں تیار ہوا جہاں آرٹ کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔

نصرانیت نے شام اور مصر کے اس وحشی (Pagan) آرٹ میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں جو اس کے ظہور کے وقت ان ملکوں میں مروج تھا۔ مختلف عوامل نے جو یا تو اس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے یا بیرونی تسلط کے درآمد کردہ اور ترقی دادہ تھے، حیات تازہ پائی اور ان عوامل نے آپس میں گھل مل کر ایک واضح اور مسحور کن حسین آرٹ کو جنم دیا۔ دجلہ اور فرات کے آگے اور ہی طرح کا چلن تھا۔ ایرانیوں کو اپنے اشکانی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر کے ان کی جگہ اپنی قومی ساسانی سلطنت قایم کئے

کچھ صدیاں بیت چکی تھیں اور ان کی شاندار قومی نہضت کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان کا آرٹ ایک قدیم چیز تھی۔ ایرانی ذہانت و ثقافت پر سکندر کے حملے کے دنوں سے یونانی آرٹ کی اور بعد میں وسط ایشیا کی درآمدات کی چھاپ لگ چکی تھی۔ اب یہ آرٹ بڑی آب و تاب اور بڑی توانائی کے ساتھ پروان چڑھ رہا تھا۔ ان ہی دو ثقافتوں کے درمیان جو ایک دوسرے کی متباین اور یکساں طور پر مسلمانوں کو ناپسند تھیں، بتدریج اسلامی آرٹ وجود میں آیا۔

قرونِ وسطیٰ میں آرٹ کی اولین غرض و غایت دینی افکار کی شرح و تعبیر تھی۔ ہم جبلی طور پر قرونِ وسطیٰ کے آرٹ کی بڑی بڑی طرزوں کو ان عقائد سے شناخت کرتے ہیں جو ان کی تکوین کا باعث ہوئے۔ اب چاہے ان کی تشکیل اور فنی عمل میں بعض عوامل انہیں آپس میں ایک ہی توارث کے رشتہ میں باندھ دیں، ان کی صورت گری قدیم الایام میں مذہبی اثرات کے تحت ہی ہوئی تھی۔ نصرانی آرٹ بنیادی طور پر دین کو باعظمت بنانے کا وسیلہ تھا۔ اس کا مشن ہمیشہ صاف اور واضح رہا اور اس نے تصویر اور صورت کے تمام موزوں ذرائع سے کام لیا۔ اور ان پڑھ جاہلوں سے لے کر عالموں کے لئے یکساں طور پر قابلِ فہم رہا۔ لیکن اس کی نفیس بت گری عربوں کو محض بت پرستی دکھائی دی چونکہ ان کے پاس آرٹ کی کوئی روایات نہ تھیں اس لئے انھوں نے آرٹ کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور غیر ترقی یافتہ قدیم اقوام کی طرح اسے سحر سے وابستہ کیا۔ اس کے سوا زہد و تقویٰ کے پہلے پہلے جوش میں انھیں عیش کوشی خاص طور پر ناپسند رہی۔ بت پرستوں کے دین کی خاص چیز ہونے کی وجہ سے یہ ایک شیطانی چیز تھی۔ اس سے مسلمان کو دور کا بھی واسطہ نہ ہونا چاہیے تھا۔ ایرانی آرٹ کا شکوہ اور ایرانی صناعوں کی یہی خصوصیت جو بہت جلد اسلامی آرٹ پر گہرا اثر ڈالنے والی تھی پہلے پہل اپنی مخصوص مشرکانہ علامتوں کی وجہ سے عربوں کو ناپسند رہی۔

اسلامی آرٹ کی ابتدا مسجد سے ہوئی۔ یہیں وہ دن کی پوری روشنی میں پیدا ہوا اور عوام کے زیر سرپرستی کھلی فضا میں پھلا پھولا۔ اولین مسجدیں سیدھی سادی عمارتیں تھیں جن میں عمارتی حسن کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ یہ مسجدیں صرف عبادت اور وعظ ہی کے لئے بنائی گئی تھیں پہلے تو ان میں سرے سے

کوئی فرنیچر ہی نہ ہوتا تھا اور جب فرنیچر آیا بھی تو وہ حد درجہ سادہ ہوتا تھا۔ اور اس میں ہر طرح کی بدعت پر مذہبی تنقید ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ مصر میں پہلی بار منبر نصب کیا گیا۔ لیکن جب اس کی اطلاع خلیفہ عمرؓ کو ملی تو انھوں نے اس کے توڑ دینے کا حکم دیا کیوں کہ اس سے خطیب کو اپنے بھائیوں پر بے وجہ تفوق و برتری حاصل ہو جاتی تھی۔ کعبہ کی سمت بتانے کے لئے جب پہلی محراب بنائی گئی تو اس پر سخت اعتراض کیا گیا کیوں کہ یہ نصرانی طاق سے بہت زیادہ مشابہت ظاہر کرتی تھی اور جو بے شبہ اسی کی نقل تھی۔ لیکن جلد ہی سادگی کو مٹانے والی ایسی نسل پیدا ہو گئی جس نے مسجد کے نقراور کافروں کے کلیسا کی امارت کا تقابل کرنا شروع کیا۔ بتدریج منبر اور محراب ایسی عمارتوں کی سب سے بڑی زینت بن گئے جو اپنے نقشے کی دل کشی اور آرائش و زیبائش میں تنوع کے لحاظ سے فن عمارت سازی کی فتوحات میں شمار کی جاتی ہیں۔

جیسے جیسے اسلام اور آگے پھیلتا گیا غیر قوموں سے اتصال نے آرٹ کے بارے میں مسلمانوں کے ذہنی تصور میں وسعت پیدا کی۔ اور دین نے جو دائمی حد بندیاں قائم کر رکھی تھیں اس کے اندر رہتے ہوئے آرٹ کی نو بنو مثالی طرزیں ایجاد کیں۔ نئے ثقافتی عنصر نے جو بالکلیہ غیر مذہبی قسم کا تھا، دینی تفوق کے مقابلے میں اپنا سکہ جمانا شروع کیا۔ جب غیروں کی رسموں نے حاکموں کو، جو اب دین کے اٹل ستون نہ رہے تھے، متاثر کرنا شروع کیا تو محلوں میں زہد و تقویٰ کی جھلک ہلکی سے ہلکی ہونے لگی۔ اس طرح ایسا آرٹ جو بہت زیادہ مذہبی قسم کا نہ تھا، پھلنے پھولنے لگا جب شائستہ اور مہذب حکمرانوں نے خوبصورت کتابوں، گل کار کپڑوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا اعلیٰ ذوق پیدا کر لیا۔ اس طرح کا ذوق جو شاہوں کو تو زیب دیتا تھا لیکن رسول اللہ (صلعم) کے جانشینوں کے شایان شان نہ تھا۔

امراء کے طبقے میں جب حاکموں کے نفیس ذوق کی اتباع کرنے والے پیدا ہو گئے اور ایسے لوگوں کی کثرت ہوتی گئی جو اپنے سے بہتر لوگوں کی تقلید کرتے ہیں تو ایک نمایاں درباری آرٹ عالم وجود میں آ گیا۔ اس آرٹ نے صناعوں کو تو فائدہ پہنچایا لیکن دینداروں کا دل کافی دکھایا۔

اولیں خلفاء کے عہد میں طبقۂ امراء کی سی عوام سے دوری ناممکن تھی۔ ان خلفاء نے سماجی

مساوات کو ناقابلِ شکست اصول کی حیثیت سے نافذ رکھا۔ وہ اس اصول پر قائم رہے کہ ہر شخص ضرورت پر حاکم تک پہنچ سکتا ہے اور حاکم کی طرزِ زندگی اس کا گھر اور اس کے اعمال سب ایسے ہونے چاہئیں کہ ان پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے۔ لیکن جیسے جیسے عیش کوش حاکم طبقے نے اپنے آپ کو عوامی زندگی سے الگ کرنا شروع کیا تو قصرِ شاہی بھی روک ٹوک کا ایک الگ تھلگ مقام بن گیا جہاں کی زندگی کا چلن کچھ اور ہی تھا۔ بنی امیہ ہی کے عہد میں ایک غیر مذہبی درباری آرٹ عالم وجود میں آچکا تھا۔ اس بات کی تصدیق ان نفیس دیواری تصویروں سے ہوتی ہے جو بحیرۂ مردار کے مشرق میں واقع صحرا میں ایک شکستہ شکارگاہ کی عمارت کے اندر ابھی تک باقی چلی آرہی ہیں[1]۔ ان دیواری تصویروں میں نہایت نفاست کے ساتھ ملی جلی یونانی اور مشرقی طرز میں شکلیں بنائی گئی ہیں۔ خیال ہے یہ عمارت خلیفہ ولید اول نے ۷۱۲ء اور ۷۱۵ء کے درمیان تعمیر کرائی تھی۔ درباری آرٹ ایک مستند روایت کا درجہ حاصل کر چکا تھا جب عباسیوں نے دمشق کی بجائے بغداد کو اپنا دار الحکومت قرار دیا جو ۷۶۶ء تک عملاً پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ دار الحکومت کی یہ تبدیلی اسلامی آرٹ میں ایک عہد آفریں دور کی نشاندہی کرتی ہے کیوں کہ اس کے بعد سے اس کے ارتقاء میں ایرانی اثر سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔

یہاں ہمارا مقصد اسلامی آرٹ کے ارتقاء کا قدم بہ قدم جائزہ لینا ہے بلکہ اس کی بعض مستقل ترقیوں کا مختصر سا خاکہ پیش کرنا ہے اور بعض خاص اہم پیداواروں پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا ہے تاکہ یہ دکھایا جا سکے کہ یہ پیداواریں نصرانی یورپ کی ہم عصر اور بعد کی ترقی پر کس درجہ اثر انداز ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں یہاں صرف صنائع لطیفہ ہی سے بحث ہے۔ یعنی صرف ایسے صناعوں کے کام سے بحث ہے جو ایک عمارت کے بن جانے کے بعد جس غرض کے لئے وہ عمارت بنائی گئی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر اس کو ہر قسم کی ضروریات اور آسائشوں سے مزین کرنے کے لئے طلب کئے جاتے تھے۔

---

[1] اس تزئین کاری کے رنگین نقشے آلی موزیل (Alois Musil) نے اپنی کتاب "قصر عمرا" (Kuseje Amra) مطبوعہ ویانا، ۱۹۰۷ء میں دیئے ہیں۔

مسلمان بہت جلد عظیم تعمیر کار بن گئے۔ ان کے ذہن کی جولانی نے بہت جلد تعمیر کاری کے اٹل اصولوں اور فنی باریکیوں کا درک کر لیا۔ انسانی شکلوں کی صورت گری کی مذہبی مخالفت کی وجہ سے مجسمہ سازی میں تو کسی طرح کی ترقی نہ ہو سکی، لیکن پتھر، لکڑی اور دوسرے مادوں میں نقاشی کاروں نے اپنی غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ دیواری تصویر کاری قدیم زمانے ہی سے موجود دکھائی دیتی ہے، تاہم مصوری ہمارے زمانے کی نام نہاد "چھوٹے پیمانے کی تصویر کاری"، چھوٹی چھوٹی تصویروں، قلمی کتابوں میں مرقع کاری وغیرہ تک محدود ہو گئی۔ یہ چیزیں اگرچہ ماہرانہ فنی مہارت کا اور رنگ کے گہرے احساس کا اظہار کرتی ہیں پھر بھی ان میں بعض ایسی صفات کی کمی نظر آتی ہے جو قرون وسطی کے یورپ کے بعض شاہکاروں میں، جو ایسے ہی حالات میں عالم وجود میں آئے تھے، دکھائی دیتی ہیں۔ مسلمانوں میں غیر معمولی مہارت رکھنے والے عظیم تعمیر کاروں کی کمی نظر نہیں آتی لیکن ان میں مصوری اور بت گری کے میدان کے ایسے ہی عظیم شہسواروں کی تلاش لاحاصل دکھائی دیتی ہے۔

اگرچہ مسلمان فنِ تعمیر کے تنہا استثنا کے سوا صنائع لطیفہ میں مغربی کارناموں کے مقابلے میں ناکام رہے، تاہم جن فنون میں ان کی ذہانت کو پوری پوری آزادی ملی، اور جو کارنامے ان فنون میں انھوں نے دکھائے قرونِ وسطیٰ میں ان کی نظیر کہیں ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی۔ اسلام بہت سی قدیم صنعتی روایتوں کا راست وارث تھا جو مغرب کے لئے نامعلوم تھیں جس طرح مسلمان عالموں نے قدیم علم کے ایک بڑے حصہ کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا ہے کچھ اسی طرح مسلمان صناعوں نے مشرق میں مروج فنون کے "کارگاہی عمل" کو محفوظ رکھا، اس کو ترقی دی اور دوسرے ملکوں میں اسے پھیلایا۔ یہ روایت یا تو سرے سے یورپ تک پہنچ نہ سکی تھی یا اگر قدیم زمانوں میں یورپ اس سے واقف بھی تھا تو وہ قرونِ وسطیٰ کے عہدِ طوفان و انتشار میں مردہ ہو چکی تھی۔

اس قدیم مہارت کو نئے سرے سے ترقی دینے میں اسلامی آرٹ نے ایک ایسی خصوصیت پیدا کر لی جو اتنی نمایاں ہے کہ اس کو آسانی کے ساتھ قدرتی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے۔ ہر چیز چاہے

وہ عام یا رسمی استعمال کے لئے بنائی گئی ہو، اسے آرائش و زیبائش سے اتنا جاندار بنایا جاتا، اتنی مہارت سے اس کی نقشہ کشی ہوتی اور اس خوبی سے اس کا اظہار ہوتا کہ نقش و نگار اصلی و قدرتی معلوم ہوتے۔ یہ نقش و نگار مصنوعی تزئین کاری کی جگہ ان نقوش سے مشابہ نظر آتے ہیں جن سے قدرت نے ذی حیات مخلوقات کو مزین کیا ہے۔ نقشوں کے لئے جو شکلیں اختیار کی گئی ہیں وہ اگرچہ واضح طور پر بدیسی ہیں لیکن یورپی روایت سے اتنی زیادہ دور ہیں کہ اس سے مطابقت باقی نہ رہے۔ ان کی غرابت دل کش اور رومان انگیز ہے۔ ان کے عوامل ترکیبی بڑی چابک دستی کے ساتھ آپس میں ملائے گئے ہیں۔ یہ سب آپس میں مل کر وہ اثر پیدا کرتے ہیں کہ ہمیں ان کے مادی ڈھانچوں کے پیچھے کسی جاندار قوت کے کار فرما ہونے کا یقین سا ہونے لگتا ہے۔ یہ تزئین کاری سیدھی سادی شکلوں کو سنوارنے اور خالی جگہوں کو پُر کرنے کی تدبیر نہ تھی بلکہ یہ نفیس کاری گری کا لازمی حصہ تھا جس کے بغیر مصنوعہ شے نامکمل رہتی ہے۔ مشرق کی فکر پرور آنکھ کے لئے نقش و نگار کا متوازن رقص اتنی ہی فرحت بخش ضرورت ہے جتنی کہ کوئی نغمہ مغربی کان کے لئے ضروری ہے۔ مشرقی صناعوں کے لئے تزئینی نقوش اتنے پُر کشش بن گئے تھے کہ وہ ان نقوش کے مسائل کے گہرے مطالعہ اور اس کے عمل میں ایسے خطوط پر باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے جن کو عصر حاضر کے صناع بھی ملحوظ رکھتے ہیں، اپنے آپ کو مستقل طور پر وقف رکھتے تھے۔ اسلامی آرٹ کا سرسری سا جائزہ بھی یہ بتا دے گا کہ تزئینی نقش و نگار ہی وہ نمایاں فروعی صنعت ہے جسے مسلم ذہانت نے پروان چڑھایا ہے۔

اگرچہ مذہبی قوانین نے مسلمان فن کاروں کو اپنی صنعت میں انسانی شکلوں یا ذی حیات مخلوق کو پیش کرنے سے قطعی طور پر منع کر دیا تھا، اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تزئین کاری میں یہ چیزیں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ایک خاص فرقے ہی نے اس بات کی اجازت نہیں دی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ کسی بھی حالت میں مسجد میں ان چیزوں کو روا نہیں رکھا جاتا۔ جن چیزوں کو ان شکلوں سے مزین کیا جاتا ہے ان کا وجود ہی فوراً اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے کہ یہ چیزیں غیر مذہبی کاموں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ عالمی منشا و مرضی کے لئے بہت سخت

نظم و ضبط کے رشتوں کو توڑنے کی بدعنوانیوں کو وسیع القلب حضرات تو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن سخت گیر لوگوں کے لئے یہ باتیں ہمیشہ الجھن کا باعث ہوتی ہیں جو کسی بھی لمحے خشم ناک احتجاج کے لئے اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں ہمارے عجائب گھروں اور نوادرات کے مجموعوں میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ شوریدہ سرانہ فروگذاشتوں کی اصلاح عاجلانہ ضرب یا کھرچ کر کس طرح کی گئی ہے۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ راست روی کے جوش نے کسی نہ کسی وقت دست سرزنش کو بلند ہونے پر مجبور کیا ہے۔

اسلامی تزئین کاری کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت عربی کتبات کا استعمال ہے۔ قرآن کی آیتیں یا کسی شاعر کا برمحل شعر، کوئی کلمہ تہنیت، یا دعائیہ کلمہ اکثر کسی حاشیے، یا گگری کے اطراف لکھا جاتا ہے یا خوبصورت ستونوں کی کارنس پر طغرے میں بنایا جاتا ہے۔ اکثر قیمتی چیزیں ان کے کسی امیر مالک کے نام اور ان کے خطابات سے مزین ملتی ہیں جو ان کی ساخت کے سنہ اور اس کے مقامِ ساخت کی طرف پُرلطف اشارہ کرتی ہیں۔ کبھی کبھار کہیں کسی ماہر صناع نے اپنے دستخط بھی ثبت کئے ہیں اور اس شہر کا نام جہاں وہ چیز بنی ہے اور اس کی تکمیل کی تاریخ لکھ دی ہے تو اس چیز کے بارے میں ہمیں ٹھیک ٹھیک معلومات بھی حاصل ہو گئی ہیں۔

اسلامی آرٹ کو عربوں کا واحد عطیہ، عربی رسم خط، جہاں کہیں بھی پھیلا ہے، عام طور پر اسلامی برتری یا اس کے اثر کی نشانی مانا گیا ہے۔ قرآن جس رسم خط میں لکھا گیا ہے وہ پورے مسلم ممالک میں مقدس مانا جاتا رہا ان ملکوں کے خطاط اس کے دل کش حروف کو خوبصورت سے خوبصورت بنانے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ماہر خطاطوں کی نسلوں کی نسلیں اتنی کامیابی اور حسن قبول کے ساتھ اپنا کام کرتی رہی ہیں کہ نہ صرف دل کش قلم میں لکھی ہوئی کتاب ہی ایک بے بہا خزانہ مانی گئی بلکہ کسی ماہر خطاط کا لکھا ہوا معمولی پرزہ بھی نوادرات جمع کرنے والے کے لئے بہت بڑی چیز ہو گئی۔

یورپی صناع عربی رسم خط کے حروف سے بتدریج آشنا ہوئے ہیں۔ اکثر صورتوں میں وہ انھیں ترچھ

نہ سکتے تھے اور اس ناواقفیت کا قدیم ترین ثبوت مرسیا (Mercia) کے بادشاہ اوفا (Offa) (۷۵۷ء -- ۷۹۶ء) کے ایک طلائی سکہ سے ملتا ہے جو اب برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ سکہ مسلمانوں کے دینار سے بہت مشابہ ہے لیکن عربی عبارت کے درمیان "ملک اوفا" (Offa Rex) کے الفاظ داخل کئے ہیں۔ اور انھیں اتنے مکمل طریقے پر لکھا گیا ہے کہ اصل سکے کی تاریخ (۱۵۷ھ ۷۷۴ء) اور اسلامی کلمہ دونوں اس کی نقل میں صاف دکھائی دیتے ہیں اس کے بعد اس قسم کا کوئی اور سکہ نہیں ملتا۔ لیکن یہ سکہ خود ہی اس حقیقت کی یادداشت ہے کہ اسلامی دارالضربوں سے مضروب ہو کر نکلنے والے سکے کتنی دور دور تک استعمال ہوتے تھے۔ اسی عجائب گھر میں مسلم صناعی سے مغرب کے اتصال کی ایک اور مثال دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ آئرستان کی بنی ہوئی کانسی کی قلمی دار صلیب ہے۔ اس کا زمانہ تقریباً نویں صدی کا ہے۔ اس صلیب کے وسط میں شیشے کی ایک تختی نصب ہے۔ اس پر خط کوفی میں عربی کلمہ "بسم اللہ" لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکے اور صلیب دونوں کے بنانے والوں کو اس اجنبی تحریر کے معنی کا بالکل علم نہ تھا جس کو وہ نقل یا اختیار کر رہے تھے۔ کیوں کہ اتنے واضح اسلامی کتبات کو جانتے بوجھتے کسی نصرانی بادشاہ کے سکے یا مقدس نصرانی نشان پر ہرگز ثبت نہ کیا جا سکتا تھا۔

اس کے بعد سے عربی حروف کی پٹیاں جو اکثر اتنی خام کاری کے ساتھ بنائی جاتی تھیں کہ ان کا پڑھنا ممکن نہ ہوتا، اور اسلامی ذرائع سے حاصل کی ہوئی تزئینی تفصیلات یورپ کے نصرانی ملکوں کی مختلف صنعتوں میں کثرت سے داخل ہونے لگیں۔ مقدس مقامات کا شوق زیارت، بالکلیۃ اسلام سے ورثے میں پائے ہوئے علم کی پیاس، اور دوسری دلچسپیاں بہت سے سیاحوں کو اسلامی ملکوں میں کھینچ لاتی تھیں۔ یہاں سے وہ اسلامی صنعت کاری کے بے مثال نمونے لے کر لوٹتے تھے اور مسلمانوں کی شان و شوکت کی جو داستانیں وہ سناتے تھے یہ چیزیں ان کی تصدیق کرتی تھیں۔

جہاں گشت فدائیانِ علم مسلم درس گاہوں میں وہ علوم حاصل کرتے تھے جو ان کے ملکوں میں نامعلوم و ناپید تھے۔ اپنے ساتھ جو چیزیں لے کر وہ لوٹے ان میں سب سے اہم چیز اسطرلاب تھی۔ اسطرلاب ایک ہیئتی آلہ ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا قدیم یونانیوں کے سر ہے۔ اسکندریہ کے ماہر جغرافیہ بطلیموس

نے اس میں کچھ اضافے کئے اور مسلمانوں نے اس کو مکمل کیا۔ یہ آلہ دسویں صدی کے لگ بھگ یورپ پہنچا ہے۔ مشرق میں اس کا بڑا مقصد استعمال نماز کے اوقات اور سمتِ کعبہ کا تعین تھا۔ اس کے سوا اس آلے سے اور بھی کام لئے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک استعمال وہ ہے جو الف لیلہ کی درازی کی کہانی میں بیان ہوا ہے۔ اس کہانی میں چرب زبان حجام اپنے الجھے ہوئے گاہک کو اسطرلاب کے ذریعہ حجامت کا وقتِ مسعود تلاش کر کے پریشان کرتا ہے۔ علم نجوم کے ساتھ وابستگی نے اسطرلاب اور اس کے استعمال میں ماہر لوگوں کو پورے قرونِ وسطیٰ میں غیر معمولی شہرت بخش دی تھی۔ اس عہد میں عام عقیدہ یہی تھا کہ نجوم اور ہیئت دونوں ہم معنی لفظ ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے زبردست عالم جربرٹ اوفرنی (Gerbert of Auvergne) جو سلوسٹر ثانی (Sylvester II) کے نام سے ۹۹۹ء میں پوپ بنا، علم ہیئت کا زبردست ماہر تھا۔ اسی علم کی وجہ سے اس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ قیام قرطبہ کے زمانے میں وہ شیطان سے ربط ضبط رکھتا تھا۔ ملمسبری کے ولیم (William of Malmesbury) نے یہ کہتے ہوئے کہ "جربرٹ، اسطرلاب کے استعمال میں بطلیموس سے بھی بڑھ گیا تھا اور اس نے ریاضیاتی علوم کو ارض گال میں زندہ کیا جہاں وہ ایک عرصۂ دراز سے فراموش شدہ تھے، جربرٹ کی ساحرانہ صلاحیت کی طرف بُرے الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر کے سائنس کی ایک دلچسپ یادگار فلارنس میں محفوظ ہے۔ یہ ایک اسطرلاب ہے جو روما کے عرض البلد پر بنایا گیا ہے۔ بعض ماہروں کا خیال ہے کہ یہ اسطرلاب پاپائے روم سلوسٹر ثانی کی ملک رہ چکا ہے۔

قدیم ترین تاریخ کا حامل اسطرلاب آکسفورڈ میں ہے۔ یہ اسطرلاب ۹۸۴ء کا بنا ہوا ہے اور احمد اور محمود نامی دو استادوں کا مشترک کارنامہ ہے جو ابراہیم اسطرلابی اصفہانی کے بیٹے تھے۔ برٹش میوزیم میں جو اسطرلاب ہیں ان میں ایک اسطرلاب انگلستان کا بنا ہوا ہے جس پر ۱۲۶۰ء کندہ ہے مرٹن کالج لبریری میں ایک آلہ ہے جو مشہور انگریز شاعر چاسر سے وابستہ ہے۔ چاسر نے اپنے نوعمر بیٹے کے لئے اسطرلاب پر ایک رسالہ لکھا تھا۔

ملاحوں کے لئے اسطرلاب ایک بیش قرار آلہ تھا۔ بحری مشاہدات کے لئے اس کا استعمال
مغرب میں سترہویں صدی تک جاری رہا جب کہ دوسری نئی ایجادوں نے اس کی جگہ لے لی ایک
نفیس اسطرلاب آرٹ کا ایک دل کش نمونہ ہوتا ہے۔ حیرت انگیز احتیاط کے ساتھ اس کو بنایا
جاتا اور بڑی مہارت کے ساتھ اس پر کندہ کاری ہوتی ہے۔ اس کو جس شکل کا بنایا جاتا تھا اس میں
صدیوں تک کوئی اہم تغیر نہ ہوا۔ ایک اسطرلاب جو بمقام طلیطلہ ۱۰۶۶ء میں ابراہیم بن سعید کی
نگرانی میں بنا تھا اب میڈرڈ کے آثارِ قدیمہ کے عجائب گھر میں رکھا ہے۔ اسی شکل کا لیکن نازک گل کاری
سے مزین ایک اور اسطرلاب ۱۷۱۵ء میں مشہور ایرانی استاد عبد الحمید نے بنایا تھا اور اب لندن
کے وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں محفوظ ہے ان دونوں اسطرلابوں کا آپس میں مقابلہ بڑی دلچسپ
چیز ہے۔

ابتدائی اسلامی دھاتی کام کے بہت سے نمونوں میں جو ہم تک پہنچ سکے ہیں، ایک صندوقچہ
ہے جو جیرونا (Gerona) کے کلیسا میں رکھا ہوا ہے۔ یہ صندوقچہ لکڑی کا بنا ہوا ہے اور
اس پر چاندی کا چمک دار پتر منڈھا ہوا ہے۔ اور اس پر بیل بوٹوں کے نقش و نگار بنے ہوئے
ہیں۔ اس صندوقچے پر ایک کتبہ بھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس صندوقچے کو بدر اور طریف نامی
دو صناعوں نے بنایا ہے اور خلیفہ الحکم ثانی (۹۶۱ء — ۹۷۶ء) کے ایک درباری کے لئے
بنایا گیا تھا کہ وہ اسے ولی عہد ہشام کے نذر کر سکے جو اپنے باپ کے انتقال کے بعد قرطبہ میں
خلیفہ ہوا۔ یہ صندوقچہ چاندی کے کام کے ان چند نمونوں میں سے ایک ہے جو ہمارے زمانے
تک باقی چلے آئے ہیں۔ اگرچہ مذہبی حیثیت سے اس دنیا میں سونے چاندی کا برتنا منع تھا، اور
دوسری دنیا میں جنت کی نعمت سے سرفراز ہونے والوں ہی کے لئے یہ حق محفوظ تھا، اس پر بھی
سونے چاندی کی رکابیاں خلفاء کے محلوں میں کسی طرح ممنوع نہ تھیں۔

مصری تاریخیں قدرے تفصیل کے ساتھ اس خزانے کا حال بیان کرتی ہیں جو قاہرہ میں فاطمی
خلفاء نے جمع کر رکھا تھا۔ ان خلفاء کی ترک فوج نے ۱۰۶۷ء میں جو بغاوت کی تھی اس میں اس

خزانے کا بڑا حصہ غایب ہوگیا۔ محلوں میں جو نوادرات ان کی تعمیر سے لے کر اس وقت تک جمع ہوتے چلے آئے تھے، ان کی ایک فہرست مورخ المقریزی نے قدیم خزانوں سے مرتب کی ہے جو اس کے عہد تک بھی باقی چلے آرہے تھے۔ یہ فہرست ہمیں ان نفیس اشیاء کے تصور میں مدد دیتی ہے جو دربارِ شاہی کے طلا رکار بنا رہے تھے۔ یہ ایک طویل دستاویز ہے جس میں کاروبا نا صحت کے ساتھ مختلف اشیار کی تفصیل بیان کی گئی ہے جیسے سونے چاندی کی دواتیں، شطرنج کے مہرے، ہتیاروں کے دستے، نرگس اور بنفشہ رکھنے کے گل دستے، سونے کی چڑیاں اور بیر جن میں قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں اتنی زیادہ تعداد میں تھیں کہ اگر ہم ہزاروں کے ان اعداد صحیح ہیں سے جو پُرجوش اعداد نگاروں نے کثرت سے جمع کئے ہیں، سینکڑوں کے اعداد کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی ما بقی اعداد کچھ کم متحیر کن نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں فاطمیوں کی چار دانگ عالم میں مشہور دولت کی ایک ہم عصر نے بھی پوری گواہی دی ہے۔ مشہور ایرانی سیاح ناصر خسرو نے قصر کے ایک عہدہ دار کی عنایت سے ۱۰۴۷ء میں ایوانِ شاہی کی سیر کی تھی۔ اسے بارھویں کمرے میں داخل ہونے کے لئے یکے بعد دیگرے گیارہ کمروں میں سے گذرنا پڑا۔ ان میں سے ہر کمرہ شان و شکوہ میں پچھلے کمرے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ بارھویں کمرے میں تختِ خلافت رکھا تھا۔ یہ عظیم الشان تخت سونے کا تھا۔ اس کو شکار کے مناظر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اور ان کے بیچ بیچ میں نفیس کتبات دیئے گئے تھے۔ تخت کو چاندی کے تین زینے دے کر اُٹھایا گیا تھا۔ اس کے سامنے سونے کی ایک حیرت انگیز جال دار جعفری بنی ہوئی تھی جس کا حُسن بیان سے باہر تھا۔[۱]

اسلامی دور کے سونے اور چاندی کے کام کے ابتدائی نمونے اب ناپید ہیں۔ اس دور کا جو کچھ کام اب باقی ہے وہ کانسے، پیتل اور تانبے کے برتن اور فرنیچر ہے جو خوش حال مسلمان استعمال کرتے تھے۔ ان ہی چیزوں سے اسلامی دھاتی کام کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ پیسا (Pisa) کے کلیسا کامپو سانتو (Campo Santo) میں "براق"[۲] کا ایک بڑا مجسمہ رکھا ہے۔ یہ مجسمہ اس قسم کے

---

[۱] ملاحظہ ہو سفر نامہ، سفرنامہ کا فرانسیسی ترجمہ، مترجمہ و مرتبہ چارلس شفر۔ پیرس ۱۸۸۱ء

[۲] Griffin ایک خیالی پرندہ ہے جس کا سر اور بازو عقاب کے سے اور باقی سارا جسم شیر کا سا بنایا جاتا ہے اردو میں اس کے مترادف کوئی لفظ نہ ملا میں نے اس کا ترجمہ "براق" کیا ہے۔ مترجم۔

مجسموں کا ایک مثالی نمونہ ہے جو عام طور پر چھوٹے پرندوں اور درندوں کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں اور اکثر فواروں کا جز یا پانی پینے کے برتن ہوتے ہیں۔ بعد کے یورپی نام نہاد "اکوانل" برتنوں (Aquamaniles پانی کا برتن) نے اپنی عجیب و غریب شکل ان ہی سے حاصل کی ہے۔ پیسا کے اس حملہ آور "براق" کا جسم کندہ کی ہوئی گل کاریوں سے پٹا ہوا ہے۔ اس کا انداز ایک لاڈلے یا نوجانور کا سا ہے اس کی گردن اور بازوؤں پر نفیس نایروں کے نقش بنے ہوتے ہیں۔ پیٹھ پر چیست پہنائے ہوتے کپڑے کا نمونہ بنا ہے جس پر گول بلوں کے نقش و نگار بنے ہیں۔ اس کے حاشیے پر خطِ کوفی میں ایک کتبہ ہے اور حاشیہ کی پیٹی سینے کے اطراف چلی گئی ہے۔ رانوں پر نکلتے طغرے بنے ہیں۔ ان کے اندر مرغولے دار حاشیوں میں شیروں اور بازوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ کتبے کے اندر ایک شعر درج ہے جس میں اس کے مالک کی مدح کی گئی ہے۔ اس شعر سے نہ تو کانسی کے اس شاندار مجسمہ کی اصل کا کچھ پتہ چلتا ہے اور نہ اس کے بننے کی تاریخ ہی معلوم ہوتی ہے۔ تمام ممکنہ قیاسات کی رو سے یہ باقیات گیارہویں صدی میں کسی فاطمی محل سے لائی گئی ہے۔

منبت کاری یا ابھرواں کام میں نقش و نگار بنانے کے سوا دھاتوں کی تزئین کے اور طریقے بھی مسلمان صناع استعمال کرتے تھے۔ وہ سونے اور چاندی میں جڑاؤ کام کے بھی بڑے ماہر تھے۔ یہ کام کئی طرح سے ہوتا ہے اور یورپ میں عام طور پر (Damascening) کہلاتا ہے۔ یورپ نے یہ کام دمشق سے وابستہ کر رکھا تھا اور اسی کی نسبت سے یہ اصطلاح گھڑلی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام دمشق میں ضرور ہوتا تھا، لیکن یہاں ایجاد نہیں ہوا تھا۔ نفیس ترین اور قدیم ترین نمونوں میں نقوش دھات کی زمین میں کندہ کئے گئے ہیں اور نالی کو سونے اور چاندی سے پاٹ دیا گیا ہے اور اکثر دونوں دھاتیں ایک ہی چیز کے بنانے میں استعمال کی گئی ہیں۔ خالی جگہوں کو ایک سیاہ مصطگی آمیزے سے بھر کر نقش و نگار کی تابناکی کو اور بڑھایا گیا ہے اور بعض صورتوں میں تزئین کاری کا یہی ایک واحد طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔

دھات میں مرصع کاری کا اسلامی کام بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں اپنے بامِ عروج

پر پہنچا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ دو سو سال تک باقی رہا۔ اس طرح کے کام کا ایک مثالی نمونہ جو موجودہ نمونوں میں سب سے بہترین ہے، پیتل کی ایک صراحی ہے جو برٹش میوزیم میں رکھی ہوئی ہے یہ صراحی سر سے پیر تک چاندی میں بنے ہوئے نقش و نگار سے پٹی ہوئی ہے۔ اس کے دس پہلو اور گردن افقی طور پر حلقوں میں بانٹے گئے ہیں اور ان حلقوں کے اندر مختلف قسم کی شکلیں اور نمونے بنائے گئے ہیں۔ اس کی سطح کے ہر حصہ کو جاندار صورتوں، ہندسی شکلوں، گل بوٹوں اور کتبوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ پیندے کے پاس پردوں کے لئے استعمال ہونے والے منقش کپڑے جیسی گتھی ہوئی گل کاری ملتی ہے جس کے آخر میں آڑی ترچھی نما جھالر دی گئی ہے اور اسی پر پورا نقشہ آکر ختم ہوتا ہے۔ مرصع کار چاندی کی وہ چھوٹی چھوٹی تختیاں جن کے اندر جانداروں کی شکلیں بنائی گئی ہیں بہت دل کش بنائی گئی ہیں اور ان کے اندر ایسی تفصیلات جیسے چہروں کے خد و خال، ہاتھ، منقش کپڑوں کی سلوٹیں وغیرہ بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ اس صراحی کی گردن کے اطراف جو کتبہ ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ اسے موصل میں شجاع ابن منفر[1] نے ۱۲۳۲ء میں بنایا تھا۔

یہ صراحی ایک ایسے دبستاں کی نمائندگی کرتی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ موصل میں کہیں باہر سے آکر پھلنے پھولنے لگا تھا۔ یہ شہر قدیم زرخیز حاصل تانبے کی کانوں سے قریبی اتصال رکھتا تھا اس میں ایسے صناع بھرے پڑے تھے جو ہر قسم کی خوبصورت چیزیں بنانے کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ اور خاص طور پر دسترخوان پر استعمال ہونے والے تانبے کے برتن بنانے والوں کا تو کوئی جواب نہ تھا۔ م۔ ریناڈ (M. Reinaud) نے تیرہویں صدی کے ایک مصنف کی جو عبارت نقل کی ہے اس سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہی تکنیک اور اسی قسم کی تزئین کاری اس سے بھی پہلے زمانے میں ان علاقوں میں ملی ہے جو موصل کے شمال اور مشرق میں واقع ہیں۔ اس سے

---

[1] م۔ ریناڈ جس نے ۱۸۲۶ء میں پہلی بار یہ کتبہ پڑھا یہی نام دیا ہے۔ لیکن م۔ میاں کس نان برچم نے اس پر جو تظر ثانی کی اس میں بنانے والے کی ابنیت "منفر" کی جگہ "منخ" دی ہے۔ ملاحظہ ہو:
Notes d. Archeologie in Journal Asiatique, XI e. Serie Paris, 1904

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دلبستاں کا تعلق آرمینیا اور ایران سے رہا ہے جس کی ابھی تک پوری وضاحت نہیں ہو سکی ہے۔ بعد کے زمانے کی بنی ہوئی چیزوں کا فنی عمل اور ان کی تزئین کاری کے بعض عناصر دوسری صدی عیسوی کی یونانی روایات سے اپنا رشتہ ثابت کرتے ہیں۔ اس لئے یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ مسلمانوں نے ایک ایسے آرٹ کو ترقی دی اور اسے سنوارا جو قدیم الایام سے ان علاقوں میں رائج چلا آرہا تھا۔

اس دلبستاں کا اثر بڑی تیزی سے شام کے ذریعہ مصر تک پھیل گیا کیوں کہ مغلوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے آبادی کے انتقال کا سلسلہ بندھ گیا تھا۔ عراق کے شہر ویراں ہو گئے تھے اور ان کے صناع منتشر ہو گئے تھے۔ چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو نے جب بغداد کو فتح کر لیا اور خلیفہ مستعصم کو مار ڈالا تو ۱۲۵۸ء میں عباسی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

برٹش میوزیم میں پیتل کا بنا ہوا ایک قلم دان محفوظ ہے۔ اس پر سونے اور چاندی کی مرصع کاری کی گئی ہے۔ اس کے مالک محمد بن سنقر البغدادی کا نام بھی اس پر کندہ ہے۔ لیکن یہ قلمدان محمد بن سنقر کے اجداد کے شہر میں نہ بنا ہوگا کیوں کہ اس پر ۱۲۸۱ء کی تاریخ کندہ ہے۔ اس زمانے میں تو بغداد کے رہنے والے بالکلیہ دیہاتی لوگ تھے جو اس کے کھنڈروں میں بس گئے تھے۔ یہ قلم دان اپنی شکل و صورت اور کاری گری کے لحاظ سے نہایت درجہ حسین چیز ہے اور اس لحاظ سے مذکورہ صراحی سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے ڈھکن پر سب سے نمایاں تزئین کاری بارہ بروج فلکیہ کے نقش ہیں۔ چار چار برج ایک ایک دائرے کے اندر اکٹھے دکھائے گئے ہیں۔ اس طرح تین دائرے بنائے گئے ہیں۔ ڈھکن کے اندر کی طرف دائروں کی ایک قطار ہے۔ ان دائروں میں ہیئتی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ وسطی دائرے میں شعاع دار انسانی چہرے والا سورج ہے۔ اس کے دونوں بازوؤں پر جو بیٹھی ہوئی شکلیں بنائی گئی ہیں ان میں چاند ہے۔ عطارد قلم اور کاغذ لئے بیٹھا ہے۔ زہرہ کو عود بجاتے دکھایا گیا ہے۔ مریخ کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں کٹا ہوا سر ہے۔ مشتری مسندِ عدالت پر متمکن ہے اور زحل ایک ہاتھ میں عصا اور ایک میں کیسہ لئے بیٹھا ہے۔ یہ تمام شکلیں عقب میں

حد درجہ گل کاری زمین دے کر بنائی گئی ہیں اور آخر میں نہایت نازک نقشے کا حاشیہ دیا گیا ہے۔ یہ قلم دان اس طرح کی بہت سی نفیس چیزوں کا ایک نہایت ہی نفیس نمونہ ہے۔ اپنی اصلی حالت میں ان قلم دانوں کو دواتوں، ریت اور گوند کی ڈبیوں اور واسطے قلم رکھنے کے لئے مستطیل خانوں سے اس طرح آراستہ کیا جاتا تھا جیسا کہ ذیل کے نقشے میں دکھایا گیا ہے۔
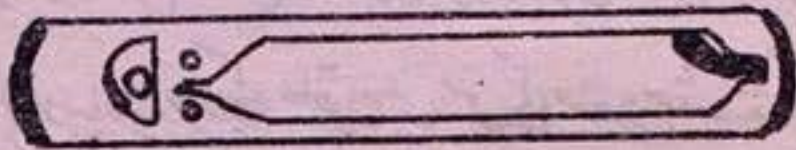
جیسے جیسے مرصع کاری کا آرٹ جنوب کی طرف پھیلتا گیا اس کی آرائش میں تبدیلی ہوتی گئی۔ اور چودہویں صدی میں اپنی ایک خاص طرز لیا ہوا ایک دوسرا دبستان وجود میں آیا جس کا مرکز قاہرہ تھا۔ زنجیری پٹیوں کے درمیان وقفہ وقفہ سے جو حلقے بنائے جاتے تھے ان میں نازک گل کاری کے حاشیے دیئے جانے لگے اور کتبے جن کی حیثیت پہلے کم و بیش ذیلی تھی، سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے۔ برٹش میوزیم میں چودھویں صدی عیسوی کے مصر کا بنا ہوا پیتل کا ایک طشت رکھا ہے جس پر چاندی کی مرصع کاری کی گئی ہے۔ یہ حاشیہ دار حلقے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ یہ بڑا طشت سلطان مصر محمد ابن قلاؤن کے لئے بنایا گیا تھا جس نے دو وقفوں کے ساتھ ۱۲۹۳ء سے لے کر ۱۳۴۱ء تک مصر پر حکومت کی ہے۔

یہ دو مثالیں ان بہت سی دل کش اشیاء کا تھوڑا بہت اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں اور بیشتر حیرت انگیز حد تک ثابت و سالم حالت میں اب تک باقی چلی آتی ہیں۔ ان میں صراحیاں ہیں، طشت ہیں اور دوسرے طرح طرح کے خوبصورت برتن ہیں، اور جیسا کہ ان پر کندہ ناموں اور خطابوں سے معلوم ہوتا ہے یہ چیزیں کبھی سلاطین و امراء کے ضیافتی دسترخوانوں کی زینت بڑھایا کرتی تھیں۔

جواہر دانوں، قلم دانوں، شمع دانوں، عود دانوں اور گل دانوں اور گھریلو استعمال کی ایسی ہی بہت سی چیزوں کی تفصیل یہاں ممکن نہیں جو کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ تیرہویں اور چودھویں میں مرصع کاری کا یہ کام بہت پسند کیا جاتا تھا امراء مشہور استادوں کے نفیس نمونوں کے بڑے شوق سے طالب رہتے تھے اور ان میں سے اکثر کے پاس خاص ان کے لئے بنائی ہوئی چیزیں ہوتی تھیں۔ برٹش میوزیم اور وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کے ساتھ دلچسپ تاریخی روایات وابستہ ہیں اور ان میں کی بیشتر چیزیں ایسی ہیں جن کے حسن و خوبی کی نظیر ڈھونڈے سے کہیں اور نہ مل سکے گی۔

قدامہ بن جعفر الکاتب

(نقد الشعر طبع جدید)

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی لکچرر اسلامی تاریخ مدرسۂ عالیہ - کلکتہ)

تمہید | کتاب نقد الشعر کو ادبیاتِ عرب کے حلقوں میں اس کی منفرد حیثیت کی وجہ سے ہر دور میں شہرت و مقبولیت حاصل رہی ہے۔ قدامہ بن جعفر سے پیشتر عربی ادب کے نمایندہ اہلِ قلم اس میں شک نہیں کہ اپنے فن کے مختلف شعبوں پر ہزاروں صفحات لکھ چکے تھے لیکن انتقاد کا شعبہ ان میں سے بعض تجدد پسند اشخاص کی توجہ کے باوجود نظم و ضبط سے عاری رہا۔ عرب روایات سے یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ جس طرح شاعری ان کی فطرت میں ودیعت تھی اس کی پرکھ کا ملکہ بھی ان کی طبیعت میں موجود تھا جس سے عرب خواتین بھی مستفیض تھیں، ام جندب طائیہ[1] اور ماویہ[2] کے نام مثال کے لئے کافی ہوں گے۔ دورِ اول کے ادبار سے ایسی روایتیں محفوظ ہیں جن سے ان کی انتقادی صلاحیتوں کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے پاس ذوق و وجدان کے علاوہ نقدِ کلام کے لئے کوئی خاص آلہ نہ تھا۔ ایک موقع پر یونس یا خلف الاحمر سے کسی نے سوال کیا تھا کہ

"بم تعرف الشعر الجید من الردیء[3] | تم کیسے اچھے اور بُرے اشعار کو پہچان لیتے ہو؟ جواب دیا

فقال بالتشقلة۔" | "تشقلہ" کے ذریعہ (یعنی جیسے کھرے اور کھوٹے سکوں کی پہچان تول سے ہوجاتی ہے۔

طبقۂ قدیم کے ادبار کی ناقدانہ صلاحیتوں کی پختگی تو مسلّم ہے لیکن ان کے پاس نقدِ کلام کے وہ اصول نہیں

---

[1] امرؤ القیس اور علقمہ بن عبدہ معروف بہ الفحل کی شعری مسابقت میں یہی حکم مانی گئی تھی، واقعہ کی تفصیل کے لئے دیکھو (الشعر والشعراء ص۵۵ طبع مصر ۱۹۳۲ء) شرح دیوان امرئ القیس از وزیر ابی بکر عاصم بن ایوب (ص۵۵ مصر ۱۳۲۳ھ) الاغانی ج ۷/ ۱۴۱ (۲) دیکھو امالی للزجاجی ص۶۵ مع حاشیہ الاغانی ج ۱۶/ ۱۰۱ [3] الجمہرۃ: ابن درید ج ۳/ ۳۴۴، المزہر السیوطی: ج ۱/ ۱۶۴ (مصر ۱۳۲۵ھ)۔

تھے جن کو علمی میزان کا درجہ حاصل ہوتا۔ اصمعی، جمحی، ابن قتیبہ، ثعلب اور ابن المعتز کی ناتمام کوششوں کے مقابلہ میں قدامہ بن جعفر الکاتب کی تالیف نمایاں طور پر ایک خاص نظامِ فکر کے ماتحت نظر آتی ہے جس کے ذریعہ پہلی دفعہ عربی ادب کے شعبۂ انتقاد کا معیار قائم ہوتا ہے۔ قدامہ ایک درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف ہے اور ان میں سے بعض کتابیں نقد الشعر سے بھی کچھ بڑھ کر تھیں تاہم اسے جو زندگیِ جاوید حاصل ہوئی اس میں نقد الشعر سے زیادہ شاید کسی اور کتاب کا حصہ نہیں ہے۔

نقد الشعر پہلی دفعہ ۱۳۰۲ھ میں مطبع الجوائب استنبول سے شائع ہوئی تھی۔ مطبوعات کی دنیا میں قدامہ کی پہلی کتاب یہی تھی۔ اس کے بعد ۱۳۰۶ھ میں اس کی اہم کتاب۔ "الخراج وصناعۃ الکتابۃ" کا منتخب حصہ مشہور مستشرق دخویہ (de Goeje) نے ابن خرداذبہ کی کتاب المسالک والممالک کے اخیر میں مطبعہ میسو بریل لیدن سے شائع کیا تھا۔ یہ انتخاب کتاب الخراج وصناعۃ الکتابہ کی دوسری جلد سے کیا گیا تھا جس کا منفرد نسخہ استامبول کے کتب خانہ کوپرولو میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد جواہر الالفاظ اور نقد النثر دو کتابیں علی الترتیب ۱۳۵۱ھ اور ۱۳۵۹ھ میں قدامہ کی نسبت سے شائع کی گئیں، اول الذکر کی نسبت قدامہ کی طرف غالباً صحیح ہے۔ لیکن نقد النثر کو اس کی تالیف قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے آیندہ اس مسئلہ کی وضاحت حسبِ موقعہ ہوگی۔

الجوائب کی اشاعت کے بعد کتاب نقد الشعر دو بار مصر میں (۱۳۵۲ھ و ۱۳۶۲ھ) اور دو بار لکھنؤ میں طبع ہوئی۔ لیکن یہ سب اشاعتیں الجوائبی نسخہ کی نقل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ غرض یہ کتاب فنی اہمیت کے باوجود جس حد تک محتاجِ خدمت تھی اس کی نوبت ہی نہ آسکی تھی۔ یا جن لوگوں نے اس کی شرح و تصحیح کی طرف توجہ کی ہوگی ان کی کوشش کا نتیجہ منظرِ عام پر نہ آسکا تھا چنانچہ استاذ عبدالرحمن کاشغری مدظلہٗ نے اس کی باضابطہ شرح و تصحیح دو ضخیم جلدوں میں کی تھی اور اس کا نام محک النقد[1] رکھا یہ کارنامہ ادبی حلقوں میں بڑا ہی جلیل و وقیع ثابت ہوتا لیکن اس کی اشاعت کا موقعہ استاذ محترم کو اب تک نہیں ملا ہے۔ متقدمین میں سے عبداللطیف البغدادی (م ۶۲۹ھ) نے نقد الشعر کی شرح لکھی تھی

[1] الزہرات: (مقدمہ از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم)

جس کے اقتباسات عبدالقادر البغدادی کی خزانۃ الادب[1] میں درج ہیں۔ اس شرح کا نام کشف الظلامہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغدادی نے اس کتاب میں نقد الشعر پر نقض وایراد کرنے والوں کے جواب پر زیادہ توجہ کی ہوگی جس کا اندازہ اس کے نام سے ہوتا ہے اس سے بیشتر ابو القاسم الحسن بن بشر الآمدی (م ۳۷۱ھ) نے نقد الشعر کی رد میں مستقل رسالہ مرتب کیا تھا جس کا حوالہ اس کی مطبوعہ کتاب "الموازنۃ بین ابی تمام والبحتری"[2] میں بھی ملتا ہے اور ابن رشیق (م ۴۶۳ یا ۴۵۶ ھ) نے اس موضوع پر "تزئیف نقد قدامۃ"[3] تالیف کی۔ اخیر میں ابن ابی الاصبع العدوانی (م ۶۵۴ھ) نے قدامہ اور اس کے معترضین میں محاکمہ کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں "المیزان فی الترجیح بین کلام قدامۃ وخصومہ"[4] قید تحریر میں آئی۔ العدوانی کے پیش نظر مقدم الذکر رسائل تھے اور اس سلسلہ کی آخری کڑی میرے علم میں خود العدوانی کی تالیف تھی اب ایک طویل وقفہ کے بعد عصر حاضر کے فضلاء نے نقد الشعر کو اپنے مطالعہ کا موضوع قرار دیا ہے۔

نقد الشعر طبع جدید؛ الجوائب کی اشاعت پر تقریباً ۷۴ سال گذرنے کو تھے کہ ایک ڈچ فاضل س۔ ا۔ بونیباکر (S.A. BONEBAKKER) کی سعی مشکور سے نقد الشعر کا تازہ ایڈیشن، ای۔ جی۔ بریل (E.J. BRILL, LEIDEN) کا مطبوعہ، یورپ کی مخصوص تصحیح و تحقیق سے آراستہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس اشاعت کا اہتمام دخویہ فنڈ (DE GOEJE FUND) کی جانب سے کیا گیا ہے جو اس معروف مستشرق کی یادگار میں قابل قدر کتابوں کی اشاعت کے لئے قائم ہے۔ نقد الشعر اس سلسلہ کی سترہویں کتاب ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع کی گئی ہے۔

بونیباکر نے جس کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے ہیں اس کا صحیح طور پر اندازہ کرنے کے لئے کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ یہاں قدرے تفصیل پیش کی جائے گی کہ قارئین کرام کے سامنے اس کارنامہ کا خاکہ آجائے۔ اور اس ایڈیشن کی اہمیت کسی حد تک ان پر واضح ہو جائے۔ علاوہ ازیں قدامہ

---

[1] ج ۳/۶۶۱ ج ۴/۳۶۳، ۵۳۲ ابن اصیبعہ ۲ ص ۲۱۱ [2] ص ۱۱۵ مطبوعہ استنبول ۱۲۸۷ھ [3] تحریر التحبیر (قلمی) ۴/ظ [4] ایضاً: ۱۲۴/ب (نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

کی سوانح حیات و تالیفات سے متعلق بعض ایسی باتیں بھی درج ملیں گی جن سے تعرض کرنے کا موقعہ بونیباکر یا اس کے پیشروؤں کو نہیں ملا۔

اس ایڈیشن کو عربی اور انگریزی کے دو حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔ عربی حصہ میں آٹھ صفحوں کی تمہید، سعد الدین توفیق کے قلم سے ملتی ہے جو ریڈیو اسٹیشن نیدرلینڈ میں عربی پروگرام کے انچارج ہیں۔ یہ تمہید ایڈیٹر کے انگریزی مقدمہ کا خلاصہ ہے۔ تمہید کے بعد نو صفحوں میں مراجع و رموز کی فہرست ملتی ہے اس کے بعد متن کتاب ۱۴۲ صفحوں میں اختلافی و تقابلی تعلیقات اور تخریج ابیات کے ساتھ ہے۔ پھر تین صفحوں میں فنی اصطلاحات کی فہرست اور آٹھ صفحوں میں فہرست شواہد ملتی ہے۔ سات صفحے کتاب الموشح (المرزبانی)، الموازنہ بین ابی تمام والبحتری (الآمدی) سر الفصاحہ (الخفاجی) کتاب الصناعتین (العسکری) اور کتاب العمدہ (ابن رشیق) کے ان مقامات کی نشاندہی کے لئے وقف ہیں جہاں قدامہ یا نقد الشعر کے حوالہ سے کوئی بات درج کی گئی ہے۔ اخیر میں دو صفحے صحت نامہ کے ہیں اس طرح عربی حصہ کل ۱۸۰ صفحوں میں ہے۔ شعراء، ادباء اور دوسرے اشخاص و قبائل کی فہرست کی ضرورت بونیباکر نے محسوس نہیں کی حالانکہ مستشرقین یورپ اس کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں۔ کم از کم فہرست شعراء کی سخت ضرورت تھی اس سے ان لوگوں کو بڑی سہولت ہو جاتی جن کو نقد الشعر کے ذخیرۂ شواہد سے رجوع کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے یہ واضح رہے کہ اس کتاب کا ذخیرۂ شعری اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ نادر اشعار کا معتدبہ حصہ تنہا اسی کتاب کے ذریعہ محفوظ رہا ہے۔

انگریزی زبان کے حصہ میں فہرست مباحث و محتویات، دیباچہ اور فہرست رموز کل چھ صفحوں میں اس کے بعد اصل مقدمہ ۷۳ صفحات میں اور الحاقی تعلیقات (Notes + Additions) سات صفحوں میں ملتی ہیں اس طرح یہ حصہ ۸۷ صفحوں کو محیط ہے۔ مقدمہ جس میں ایڈیٹر نے اپنی تحقیق و مطالعہ کا خلاصہ پیش کیا ہے اس کے ذیلی عنوانات یہ ہیں:

(الف) قدامہ بن جعفر (سوانح کے مخصوص مسائل سے بحث)

(ب) نقد الشعر کے مضامین کی تحلیل۔

(ج) ادبار متقدمین سے قدامہ کا علمی رابطہ۔

(د) یونانی فلسفہ کا اثر نقد الشعر پر۔

(ہ) نقد الشعر کا اثر بعد کی تالیفات پر اور ان کا استعمال متن کتاب کی تصحیح میں

(و) نقد الشعر کے قلمی نسخوں کی نشاندہی اور موجودہ ایڈیشن کی تیاری میں طریق کار کی وضاحت۔

قدامہ کے تذکرہ نگار | قدامہ بن جعفر کے سلسلہ میں بونیباکر کو تازہ ترین تحقیقات سے رجوع کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ اس موضوع پر اس نے دو کتابوں کا ذکر کیا ہے ایک ڈاکٹر احمد مکی کی تھیسیس (Gudama - b Gafar et son oeuvre) ہے جس میں قدامہ کے عہد میں عہدۂ کتابت کی تاریخ سے مفصل بحث کی گئی ہے اس کے سوانح حیات اور اسلاف کی شناخت پر بھی خاصی کوشش کی گئی ہے آخری باب میں نقد الشعر اور کتاب الخراج کے باقی ماندہ ابواب کی تحلیل ملتی ہے۔

دوسری ڈاکٹر بدوی طبانہ کی تھیسیس "قدامۃ بن جعفر والنقد الادبی" ہے جس کو المکتبۃ الانجلو مصریۃ قاہرہ، نے ۱۳۷۳ھ میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر طبانہ کی بابت بونیباکر کا بیان ہے کہ انھوں نے فن نقد کے بحث طلب مسائل کی تفصیل میں قدامہ کی فنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور نقد الشعر کے مضامین کی قیمت و اہمیت جتلانے اور عربی ادب کے انتقادی شعبہ میں اس کا مقام متعین کرنے کی خوب کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں نقد الشعر مطبوعۂ الجوائب کی عبارتیں بہ کثرت نقل ہوئی ہیں لیکن قدامہ کے پیشرو اصحابِ فن کے اقوال اور خود قدامہ سے بطور اخذ و رد تعرض کرنے والوں کی تالیفات سے یکسر صرف نظر کیا گیا ہے۔

البتہ اس کتاب میں یہ بات ضرور ہے کہ قدامہ کے تذکرہ نگاروں میں سے بہتیرے غیر معروف لوگوں کا حوالہ گیا ہے جن کی کتابوں سے قدامہ کے سوانح حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر طبانہ کے استعمال کردہ ماخذوں کی جو فہرست بونیباکر نے درج کی ہے وہ بہر حال مفید ہے لہذا میں بھی اسے نقل کئے دیتا ہوں۔

۱- ابن الندیم (م اواخر ۳۸۵ھ) - کتاب الفہرست ص ۱۳۰ (فلوگل)

۲- ابو حیان التوحیدی (م ۴۰۰ھ یا ۴۱۴ھ) - کتاب الامتاع والموانسۃ (ج ۱، ص ۱۰ و ج ۲، ص ۱۴۵-۱۴۶)

۳ - ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) - المنتظم فی ملتقط الملتزم (ج ۲ ورق ۲۸۰، تصویر دار الکتب المصریہ شمارہ ۱۲۹۶ (تاریخ) ماخوذ از نسخۂ ایا صوفیا شمارہ ۳۰۹۶) - مطبوعۂ حیدر آباد ج ۶، ص ۳۶۳ ۱۳۵۷ھ (بونیباکر)۔

(۴) - المطرزی - (م ۶۱۰ھ) - کتاب الایضاح (شرح مقامات حریری) نسخۂ دار الکتب المصریہ رقم ۲۴۹ (ادب)

۵ - یاقوت الرومی (م ۶۲۶ھ) ارشاد الاریب ج ۶، ص ۲۰۳ طبع مارگولیتھ)

۶ - الخلیل بن ایبک الصفدی (م ۷۶۴ھ) الوافی بالوفیات (ج ۷، ورق ۴۰ الف تصویر زیر شمارہ ۱۲۱۹۵ دار الکتب المصریہ - ماخذ نامعلوم - ایضاً تصویر مملوکہ (FONDASINECAETANI ماخوذ از نسخۂ تیونس (ورق ۴۲)

۷ - اسمٰعیل بن عمر بن کثیر (م ۷۷۴ھ - البدایۃ والنہایۃ (ج ۱۱، ص ۲۲۰-۲۲۱ قاہرہ ۵۱ - ۱۳۵۸ھ)

۸ - الملک الافضل (م ۷۷۸ھ) العطایا السنیہ (ورق ۲۰۷ نسخۂ دار الکتب المصریہ رقم ۳۵۱ تاریخ)

۹ - بدر الدین العینی (م ۸۵۵ھ) عقد الجمان فی تاریخ اہل الزمان (قسم اول از جزء سادس عشر تصویر شمارہ ۱۵۸۴، تاریخ دار الکتب المصریہ - ورق ۶۸ ماخذ نامعلوم۔

۱۰ - ابن تغری بردی (م ۸۷۴ھ) النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ (ج ۲، ص ۳۲۳ طبع Juynboll)

بونیباکر کا قول ہے کہ ان ماخذوں کی ورق گردانی کے باوجود انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مضمون متعلقہ قدامہ بن جعفر پر کوئی غیر معمولی اضافہ نہیں ہوتا۔

جعفر بن قدامہ اس نے قدامہ کے والد جعفر کی شخصیت سے خاص طور پر بحث کی ہے۔ اور اس مسئلہ میں اپنی طرف سے کسی اضافہ کے بغیر دہ سلان (DESLANE) دخویہ (DEGOEJE) عبد الحمید العبادی اور

عہ اس فہرست پر شریشی کا اضافہ ہونا چاہیئے جس کا حوالہ میں نے بعد میں دیا ہے۔ ارشاد الاریب مطبوعہ دار المامون کا مصحح قدامہ کے ترجمہ کے لئے کتاب نزہۃ العیون کا حوالہ دیتا ہے (دیکھو معجم الادباء ج ۱۷، ص ۱۲ بر ہامش)

ڈاکٹر بدوی طبانہ کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے - ان محققین کے نزدیک مؤلف نقد الشعر قدامہ کا باپ جعفر بن قدامۃ بن زیاد تھا جس کا تذکرہ خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد (ج ۷/ ۲۰۵) میں ملتا ہے - جعفر کے عبد اللہ بن المعتز سے گہرے تعلقات تھے اور کتاب الاغانی کے مؤلف ابو الفرج الاصبہانی کو اس سے تلمذ تھا - کتاب الاغانی میں بہت سی روایتیں جعفر بن قدامۃ بن زیاد کے حوالہ سے درج ملتی ہیں علاوہ بریں اصبہانی جعفر کی بعض کتابوں[۱] سے بھی روایات نقل کرنے کی تصریح کرتا ہے - یاقوت کی ارشاد الاریب[۲] میں جعفر کا تذکرہ خطیب کی تاریخ سے منقول ہے البتہ یاقوت نے اس کے عربی اشعار کا نمونہ بھی پیش کیا ہے اور اس کی وفات ۳۱۹ھ میں بتائی ہے -

ان محققین کی تحقیق دراصل مطرزی شارح مقامات حریری کے بیان پر مبنی ہے مطرزی قدیم ترشخص ہے جس نے جعفر بن قدامۃ بن زیاد کو قدامہ مؤلف نقد الشعر کا باپ قرار دیتے ہوئے خطیب بغدادی کے الفاظ کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اور نقد الشعر کی بابت مجہول صیغہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب قدامہ کے بجائے اس کے باپ جعفر بن قدامہ کی تالیف بھی بتائی گئی ہے[۳] -

اس نظریہ کے مقبول ہونے میں دو باتیں مانع ہیں - اول یہ کہ قدامۃ بن جعفر کا سب سے قدیم تذکرہ نگار ابن الندیم اس کے باپ جعفر بن قدامہ کا شمار اہل علم میں نہیں کرتا اور اس کے الفاظ صریح ہیں کہ (انہ ممن لا یفکر فیہ ولا علم عندہ[۴]) حالانکہ خطیب بغدادی کا جعفر بن قدامہ طبقۂ علیاء کے علماء میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے اور مطرزی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے ہم عہد فضلاء کے علم میں بھی قدامہ بن جعفر کا باپ بلند پایہ ادیب تھا جب ہی ان میں سے بعض نے نقد الشعر کو اس کی طرف منسوب کیا تھا - خود مطرزی ابن الندیم کے بیان پر دھیان نہیں دیتا اور جعفر بن قدامہ کے تعارف میں تاریخ بغداد سے رجوع کرتا ہے - دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ یاقوت نے قدامہ بن جعفر کا ترجمہ ابن الندیم کی الفہرست سے نقل کیا ہے اور جعفر بن قدامہ کے تعارف و تذکرہ میں تاریخ بغداد سے اخذ کیا ہے اس سے ہمیں یاقوت

۱؎ الاغانی ج ۵/ ۱۲۸ ۲؎ الارشاد ج ۲/ ۱۲ (گب میموریل) ۳؎ المطرزی - کتاب الایضاح - ورق ۸۰ (عبد الحمید العبادی نقد النثر ص ۳۲ حاشیہ ۲) ۴؎ الفہرست ص ۱۳۰ (لیبزک)

کے متعلق معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے نزدیک قدامہ کے والد اور جعفر بن قدامہ بن زیاد کی دو علیحدہ شخصیتیں تھیں ورنہ جعفر کے سلسلہ میں ابن الندیم اور خطیب کے متناقض بیان پر اس کو ضرور اشتباہ ہوتا۔

ان موانع سے قطع نظر مذکورۂ بالا نظریہ کی صحت چند ایسی دلیلوں سے ثابت ہوتی ہے جو بقول بونیباکر مطرزی کے بیان سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، جعفر بن قدامہ بن زیاد اور قدامہ بن جعفر دونوں کا عہدۂ کتابت سے تعلق، وزیر ابن الفرات کے خاندان سے دونوں کی وابستگی اور جعفر بن قدامہ، ابن خردازبہ کی ہم عصری نیز قدامہ بن جعفر کا اپنی کتاب الخراج میں ابن خردازبہ کے ماخذوں سے استفادہ کرنا، یہ تمام یا مجموعی طور پر ثابت کرتی ہیں کہ قدامہ کا باپ جعفر بن قدامۃ بن زیاد الکاتب تھا۔

استدراک مطرزی کے بیان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوئی وجہ راقم السطور کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جب کہ یاقوت کے مقابلہ میں تنہا اسی کا بیان ملتا ہے جس سے ہم استناد کرسکتے ہیں۔ پھر جملہ قرائن جن کو بونیباکر بزعم خود حجت و دلیل (Arguments) قرار دیتا ہے ان کی تقویت اسی بیان سے ہوتی ہے بہرحال ان قرائن پر راقم الحروف کی طرف سے یہ اضافہ ہونا چاہئے کہ کتاب الاغانی کا مصنف جعفر بن قدامہ بن زیاد سے اخذ روایت اور اس کی کتاب سے نقلِ مضامین تو کرتا ہی ہے اس کے ساتھ ہی قدامۃ بن جعفر مؤلف نقد الشعر سے بھی کسی موقعہ پر اس نے استفادہ کیا ہو تو تعجب نہیں۔ سر الفصاحۃ کے ایک اقتباس سے واضح ہوگا کہ ابو الفرج قدامہ سے ابو الفرج اصفہانی کو اخذِ علم کا موقعہ ضرور ملا۔ باوجودیکہ سر الفصاحۃ بونیباکر کے پیش نظر رہی ہے اس کی عبارت ذیل پر بونیباکر نے غور نہیں کیا۔ عبارت کا تعلق ایک مشہور ادبی اصطلاح سے ہے۔

"وحکی[1] ابو علی محمد بن المظفر الحاتمی عن ابی الفرج علی بن الحسین الاصفہانی قال قلت لابی الحسن علی بن سلیمٰن الاخفش اجد قوماً یخالفون فی الطباق فطائفۃ تزعم وھی الاکثر انہ ذکر الشیء وطائفۃ تخالف فی ذلک وتقول ھو اشتراک المعنیین فی لفظ واحد۔ فقال من ھو الذی یقول ھذا؟ فقلت: قدامۃ، فقال ھذا یا بُنَیَّ ھو التجنیس ومن زعم انہ طباق فقد ادّعی خلافاً علی الخلیل

[1] سر الفصاحۃ للخفاجی: صـ ۱۸۹

والاصمعی فاتفق الاخفش والآمدی علی مخالفة ابی الفرج (قدامة بن جعفر)

فی التسمیة"

واقعہ کی صراحت سے ثابت ہے کہ قدامہ جس کی رائے اصفہانی، ابو الحسن الاخفش کی مجلس میں نقل کرتا ہے اس سے اصفہانی کو ضرور تعارف تھا قدامہ اور ابو الحسن الاخفش[1] (م ۳۱۵ھ) ہم طبقہ تھے اور اور ابو العباس محمد بن یزید المبرد (م ۲۸۵ھ) و ابو العباس احمد بن یحییٰ ثعلب (م ۲۹۱ھ) کے شاگرد تھے غرض جعفر بن قدامۃ بن زیاد اور قدامۃ بن جعفر دونوں سے اصفہانی کے تعلق کی جو نوعیت ہے وہ اسی امر کی تائید کرتی ہے کہ ابو الفرج قدامہ کو جعفر بن قدامہ بن زیاد کا فرزند تسلیم کیا جائے۔ ابو الفرج اصفہانی کی ایک سند سے جعفر بن قدامہ کے ایک اور فرزند محمد کا علم ہوتا ہے۔ محمد بن جعفر بن قدامہ کی سند سے اس نے جعفر برمکی کے قتل کا واقعہ[2] درج کیا ہے۔ غالب گمان ہے کہ جعفر بن قدامہ کے بعد یا جب ضعفِ پیری کی وجہ سے جعفر بن قدامہ درس و املاء سے کنارہ کش ہوا تو اس کے شاگردوں نے اس کے باکمال لڑکوں سے استفادہ کا آغاز کیا۔

قدامہ بن زیاد | قدامہ بن جعفر کے اسلاف کی شناخت میں جن مآخذوں کا خلاصہ بو بنیا کرنے پیش کیا ہے ان میں غالباً جعفر کے باپ قدامۃ بن زیاد سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مضمون میں بروکلمان (C. BROCKELMANN) ابن الندیم، یاقوت اور دہ سلان وغیرہ کے مضامین کا خلاصہ درج کرتا ہے اور قدامہ کے باپ دادا کے متعلق اشارہ تک نہیں کرتا۔ ابن الندیم نے قدامہ کا نام و نسب یوں لکھا ہے۔ "قدامۃ بن جعفر بن قدامۃ" المطرزی جعفر کا باپ قدامۃ بن زیاد کو قرار دیتا ہے جو در اصل خطیب بغدادی کے بیان سے ماخوذ ہے۔ اس تقدیر پر کہ نقد الشعر کا مؤلف اسی جعفر بن قدامہ کا لڑکا ہے جس کا تذکرہ خطیب کی تاریخ میں ملتا ہے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ مؤلف نقد الشعر کو اپنے گھر میں بھی خالص علمی و ادبی ماحول میسر تھا اور گھر کی روایات ہی کے مطابق اس نے کتابت کا پیشہ اختیار کیا لیکن اس امر کی وضاحت بہر حال باقی رہ جاتی ہے

---

[1] نزہۃ الالباء: ص ۳۱۲ [2] الاغانی: ج ۶ / ص ۲۰۵

کہ جعفر بن قدامہ کس خاندان سے تھا اور اس کے باپ قدامہ بن زیاد کی کیا حیثیت تھی۔ اس بحث کا خیال میرے علم میں عبدالحمید العبادی کے سوا، قدامہ بن جعفر کے تذکرہ نگاروں میں سے کسی کو نہ آیا۔ خواہ عبدالحمید العبادی کو اس سلسلہ میں چنداں کامیابی نہ ہوئی ہو چنانچہ اس بحث کو چھیڑتے ہی ان الفاظ پر العبادی کو خاموش ہو جانا پڑا کہ "لفت نظری، زمیلی الاستاذ احمد امین الی قول الجاحظ فی کتاب الحیوان (ج ۵/ ۳۲) قال قدامۃ حکیم المشرق " ولکنی لم اعثر علی نص یفید ان قدامۃ ھذا ھو جد المترجم"[۱] جاحظ کے اس جملہ میں جس قدامہ کا ذکر ہے اس کی شناخت کا مسئلہ اپنی جگہ مستقل ہے۔ سردست قدامۃ بن زیاد کی شناخت کے سلسلہ میں قارئین کی توجہ محمد بن جریر طبری کی ایک عبارت کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے عبارت کا تعلق ایتاخ الخزری کی گرفتاری کے واقعہ سے ہے جس کو متوکل علی اللہ عباسی کے اشارہ پر امیر اسحق بن ابراہیم نے ۲۳۵ھ میں مع اس کے مخصوص عملہ کے گرفتار کر لیا تھا۔ واقعہ کی تفصیل میں طبری کے یہ الفاظ ہیں کہ

"واُخرج[۲] ایتاخ حین بلغ دار اسحق فادخل ناحیۃ منہا ثم قید فاثقل بالحدید فی عنقہ ورجلیہ ثم قدم بابنیہ منصور ومظفر وبکاتبیہ سلیمان بن[۳] وھب وقدامۃ بن زیاد النصرانی بغداد وکان سلیمان علی اعمال السلطان وقدامۃ علی ضیاع ایتاخ خاصۃ فحبسوا ببغداد فاما سلیمان وقدامۃ فضربا فاسلم قدامۃ وحبس منصور ومظفر"

اس عبارت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) ایتاخ کی جاگیروں کا نگراں یا اس کا پرائیوٹ سکریٹری ایک شخص قدامۃ بن زیاد النصرانی تھا۔

(ب) ایتاخ کے ساتھ اس کے عملے پکڑ لئے گئے ان میں قدامۃ بن زیاد بھی تھا جس کو جسمانی

---

[۱] نقد النثر: ص ۳۳ حاشیہ ۲　[۲] تاریخ الامم والملوک ج ۱۱ ص ۳۰ طبع اول مصر　[۳] سلیمان بن وہب کی وفات ۲۷۲ھ میں ہوئی۔ (دیکھو ابن خلکان: وفیات الاعیان رقم ۲۶۳ مصر ۱۹۴۶ء)

اذیت پہنچائی گئی۔

(ج) قدامۃ بن زیاد النصرانی اسلام قبول کرلیتا ہے (وجہ غالباً یہ ہوگی کہ قید و بند سے رہائی مل جائے)

اب اگر مولف نقد الشعر کے دادا قدامہ کی بابت شناخت کی کوشش کی جائے تو ہمارے خیال میں ابن الندیم کا قدامہ (غیر منسوب) اور المطرزی کا قدامۃ بن زیاد یا بہ لفظ دیگر خطیب کے جعفر بن قدامہ کا باپ قدامہ بن زیاد، قرین قیاس یہ ہے کہ وہی شخص ہے جس کو طبری امیر ایتاخ خزری کا کاتب خاص قرار دیتا ہے۔ اگر خطیب جعفر بن قدامہ کے آبائی مذہب کی بابت کچھ اشارہ کر دیتے تو یہ مسئلہ زیادہ واضح ہو جاتا لیکن خطیب کی خاموشی کے لئے یہی کافی تھا کہ جعفر بذات خود بھی نصرانی نہ رہا ہوگا۔ ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ عام طور پر سب تذکرہ نگار قدامۃ بن جعفر صاحب نقد الشعر کو نو مسلم قرار دیتے ہیں اور ان سب کا ماخذ تنہا ابن الندیم ہے جس کا بیان یہ ہے کہ نقد الشعر کے مولف نے مکتفی کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا۔ اگرچہ ابن الندیم کے قدیم اور صریح بیان کی تغلیط پر مجرد قرائن کی روشنی میں اصرار نہیں کیا جاسکتا تاہم اس کے بیان کو قطعی قرار دینے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ جیسے جعفر بن قدامہ کے بارہ میں اس کا بیان صحت سے بعید معلوم ہوتا ہے اسی طرح قدامہ بن جعفر کا مکتفی کے عہد میں اسلام قبول کرنا اصل واقعہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ وہ قرائن اپنی جگہ پر بہت ہی معقول اور وزنی ہیں جن کی بنیاد پر قدامۃ بن جعفر کو خطیب کے جعفر بن قدامہ بن زیاد کا فرزند اور جعفر کو ایتاخ کے کاتب قدامہ بن زیاد النصرانی کا فرزند قرار دے سکتے ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کے باہمی تعلق کو ان قرائن کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں کہ ایتاخ کا کاتب قدامۃ بن زیاد مذہباً نصرانی تھا۔ قدامہ بن جعفر بھی بالاتفاق نصرانی الاصل تھا۔ قدامۃ بن زیاد عہدۂ کتابت پر سرفراز تھا۔ جعفر بن قدامہ بن زیاد بہ قول خطیب مشایخ کتاب میں سے تھا اور قدامہ بن جعفر کے لئے بھی کتابت طرۂ امتیاز تھی۔ پھر قدامہ بن زیاد النصرانی اور قدامہ بن جعفر کے درمیان جو تفاوت زمانی ہے وہ مناسب طور پر قدامہ بن جعفر کو قدامہ بن زیاد کاتب ایتاخ کا پسر زادہ قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ قدامہ بن جعفر نے اپنے عہدہ اور علمی صلاحیت کے لحاظ

سے جو بلند درجہ حاصل کیا وہ اس امر کا غماز ہے کہ اس کی صلاحیتوں کے اُبھرنے میں خاندانی روایات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان قرائن کے نتیجہ میں مؤلف نقد الشعر کو قدامۃ بن زیاد کا پسر زادہ تسلیم کر لینے کے بعد ناگزیر مانناپڑے گا کہ قدامۃ بن جعفر کا خاندان مکتفی (۲۸۹ھ۔۲۹۵ھ) کے عہد سے ۴۰ سال پہلے نصرانیت ترک کر کے اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس کے بعد جعفر بن قدامہ بن زیاد کے متعلق جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا دور ہو جاتی ہے۔[1]

خطیب بغدادی سے بدگمانی | بونیباکر نے ڈاکٹر طبانہ کی تقلید میں اس سوال کو بڑی اہمیت دی ہے کہ خطیب کی تاریخ بغداد میں قدامۃ بن جعفر کا تذکرہ کیوں درج نہیں ہے؟ یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ بغداد جن نسخوں کی مدد سے طبع ہوئی ہے ان میں سے قدامہ کا تذکرہ ساقط ہو گیا ہو یا بیاض رہ گیا ہو اس لئے کہ اگر واقعی یہ بات ہوتی تو ابن النجار کے لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ذیل تاریخ بغداد میں قدامہ کا تذکرہ درج کرتا جس کا حوالہ خلیل بن ایبک الصفدی الوافی بالوفیات میں دیتا ہے۔

ڈاکٹر طبانہ کی رائے میں خطیب نے غالباً قدامۃ بن جعفر اور جعفر بن قدامہ کی مختلف شخصیتوں کو ایک سمجھ لیا اور اسی غلط فہمی کی بناء پر قدامہ بن جعفر کا ترجمہ تاریخ بغداد میں درج نہیں کیا۔ بونیباکر اس رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ باپ اور بیٹے جب دونوں ایک ہی عہدہ رکھتے اور ایک ہی خاندان کی خدمت سے وابستہ بھی تھے تو ایسی صورت میں اختلاط کا واقع ہو جانا عین ممکن ہے اس مفروضہ کی توثیق میں بونیباکر خطیب کے اس بیان کی یاد دہانی کرتا ہے کہ "جعفر بن قدامہ نے فن کتابت پر ایک کتاب[2] تالیف کی تھی"

میں نہیں سمجھ پایا کہ ڈاکٹر طبانہ اور بونیباکر کو اس سوال کو اہمیت دے کر اس سے بحث کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی۔ جب کہ خطیب کی تاریخ بغداد یا تراجم و تاریخ کے موضوع پر کسی کتاب کے بارہ میں

---

[1] عبدالحمید العبادی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے (دیکھو نقد النثر: ص۳ و ص۳) [2] بونیباکر کے الفاظ یہ ہیں:-
The statement of al- Hatib al- Baghdadi that Gafar b. Quda-ma wrote a Book about the art of epistolography must there fore, be regarded with caution p. 5. اس کے ساتھ خطیب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:
"وله مصنفات في صنعة الكتابة وغيرها" خطیب نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ کتابت کے موضوع پر جعفر کی ایک کتاب تھی یا ایک سے زائد۔

استقصاء کا گمان کرنا حسنِ ظن سے زیادہ نہیں۔ پھر خطیب کے بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس نے جعفر بن قدامہ سے اسی شخص کو مراد لیا ہے جس کو ہم قدامہ بن جعفر کے نام سے جانتے ہیں، بہت عجیب ہے۔ علی الخصوص جب کہ ابوالفرج الاصبہانی کے حوالہ سے ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ جعفر بن قدامہ واقعی صاحب تصانیف تھا اس کے علاوہ فنِ کتابت کے موضوع پر قدامہ بن جعفر پہلا شخص نہیں جس نے قلم اُٹھایا ہو۔ بونیباکر کو اس لاطائل بحث میں پڑنے کے بجائے مطرزی کے بیان کے اس جزو سے بحث کرنا چاہیے تھا کہ "وقیل انہ لوالدہ جعفر" یعنی بعض نقد الشعر کو قدامہ کے والد جعفر کی تالیف قرار دیتے ہیں۔ اس خیال کا منشا دراصل یہ ہے کہ جعفر اور قدامہ بن جعفر ایک جیسا ادبی مذاق رکھتے تھے اور ادب و کتابت پر جعفر کی بھی کتابیں تھیں۔ بعد میں جب اس کے لڑکے قدامہ نے تالیف کا سلسلہ شروع کیا تو بعض غیر محتاط قسم کے لوگوں نے نقد الشعر کو جعفر کی طرف منسوب کر دیا۔

قدامہ بن جعفر کی تاریخ وفات قدامہ بن زیاد کی بابت طبری کے بیان کے علاوہ ہمارے پیش نظر اور کوئی ماخذ نہیں ہے جس سے اس کی حالت پر روشنی پڑتی ہو۔ لہٰذا اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔ جعفر بن قدامہ کا حال کچھ ایسا ہی مبہم ہے۔ اس کی وفات حسب تصریح یاقوت ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں ہوئی۔ لیکن عبدالحمید العبادی ۳۱۹ھ میں جعفر کی وفات کا یقین رکھتا ہے[1]۔ اس موقع پر مکتبہ اسکوریال کے فہرست نگار دربنورغ (DERENBOURG) سے سنگین غلطی یہ ہوئی ہے کہ اس نے ۳۱۰ھ کو قدامہ بن جعفر کی تاریخ وفات بتائی ہے[2]۔ حالانکہ قدامہ بن جعفر کی وفات یقیناً ۳۱۰ھ کے بہت بعد ہوئی ہے۔ ابن الجوزی اس کی وفات ۳۳۷ھ میں بتاتے ہیں۔ گویا بغداد پر آلِ بویہ کے تسلط کو اس وقت تک تقریباً تین برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ غالباً ابن الجوزی کے بیان ہی کے پیشِ نظر مقامات حریری کے بعض شُرّاح قدامہ بن جعفر کو وزراء آلِ بویہ کا کاتب قرار دیتے ہیں۔

یاقوت، ابن الجوزی کے بیان کو غیر مستند قرار دیتا ہے۔ اور بویہی دور تک قدامہ بن جعفر کا زندہ رہنا تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی بڑی وجہ یاقوت کے نزدیک یہ ہے کہ قدامہ کو ابن قتیبہ، المبرد، العسکری

---

[1] نقد النثر صفحہ ۳۵ [2] فہرست اسکوریال: ج ۱ نمبر ۲۴۲ - العبادی صفحہ ۳۵

اور ثعلب کا زمانہ ملا تھا۔ یاقوت نے قدامہ کی تاریخ وفات نہیں بتائی ہے البتہ ۳۲۰ھ تک اس کے زندہ رہنے کے ثبوت میں ابوحیان التوحیدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ۳۲۰ھ میں قدامہ نے اپنی کتاب الخراج وزیر علی بن عیسیٰ کی خدمت میں پیش کی تھی[1]۔ اور وزیر ابن الفرات کے یہاں متی المنطقی اور ابوسعید السیرافی کے مناظرہ میں قدامہ بھی شریکِ مجلس تھا۔ غالباً یاقوت نے ابوحیان التوحیدی کی کتاب الامتاع و المؤانسۃ سے یہ تاریخ نقل کی ہے۔ لیکن اس کتاب میں جیسا کہ ڈاکٹر طبانہ کا بیان ہے مجلس مناظرہ کی تاریخ ایک جگہ ۳۲۶ھ بتائی گئی ہے[2] اور دوسری جگہ توحیدی کا یہ بیان ملتا ہے کہ مناظرہ کے وقت مناظرہ کے ایک رکن ابوسعید السیرافی جو ۲۸۰ھ میں پیدا ہوا اس کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ اس بیان کی صحت پر مناظرہ کی تاریخ ۳۲۰ھ نکلتی ہے۔ توحیدی کے بیان میں اس اختلاف سے کم از کم ۳۲۰ھ تک قدامہ کا زندہ رہنا ثابت ہو جاتا ہے۔ پس یاقوت کا اسی توحیدی کی سند پر تنہا ۳۲۰ھ کی تاریخ کو مستند قرار دینا تعجب خیز ہے۔

عبدالحمید العبادی، یاقوت سے کھلا اختلاف رکھتا ہے۔ وہ ابن الجوزی اور مقامات کے مجہول شارح کے بیان کو محسوس کرتا ہے کہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ اور ان دونوں کے بیان کو مطرزی کے بیان سے قوت پہنچتی ہے کہ "وہ میرے گمان میں قدامہ نے مقتدر باللہ اور اس کے لڑکے الراضی باللہ کا عہد پایا تھا" (راضی: از ۳۲۲ھ - ۳۲۹ھ) ڈاکٹر طبانہ جس کا خلاصہ بونیباکر نے پیش کیا ہے العبادی سے قدرے مختلف پیرایہ میں لکھتا ہے کہ علماء کے جس طبقہ کا عہد حسب بیان یاقوت، قدامہ نے پایا تھا اس طبقہ میں ابن قتیبہ کی وفات سب سے پہلے ۲۷۶ھ میں ہوئی۔ فرض کیجئے کہ قدامہ نے ابن قتیبہ کو بھی دیکھا اور اس کو بویہی سلاطین کا عہد بھی ملا یا اس کی وفات ۳۳۷ھ میں ہوئی جیسا کہ ابن الجوزی کا بیان ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن قتیبہ کے بعد قدامہ ۶۱ سال تک زندہ رہا اگر یہ مان لیا جائے کہ قدامہ کو ابن قتیبہ سے درس لینے کا موقع بھی ملا اور اس وقت قدامہ کی عمر ۱۵ برس کی فرض کی جائے تو اس تقدیر پر قدامہ کی پیدائش کی تاریخ ۲۶۱ھ قرار پائے گی اور اس کی کل عمر ۷۶ سال کے قریب ہوگی جو بظاہر مستبعد نہیں۔

ع یہاں پر ڈاکٹر طبانہ سے تسامح ہو گیا ہے اس لئے کہ مذکورہ طبقہ میں سب سے پہلے سکری کی وفات ہوئی ۲۷۵ھ میں (دیکھو معجم الادباء ج ۸/ ۹۴ طبعہ دار المامون) [1] التوحیدی: کتاب الامتاع والمؤانسۃ (ج ۲/ ۱۰۵-۱۳۶) [2] ایضاً: ص ۱۰۸ ج اول [3] ایضاً: ج ۱/ ص ۱۲۹

بونیباکر کی تحقیق میں الصفدی نے ابن النجار کے حوالہ سے قدامہ کی وفات ۳۲۸ھ[1] میں بتاتی ہے۔ لیکن بتصریح العبادی کتاب الخراج کے قلمی نسخہ کے سرورق پر ۳۳۷ھ کی تاریخ درج ہے اور یہی تاریخ ذہبی[2] بتاتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قدامہ کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں کوئی قطعی اور صریح اطلاع محفوظ نہیں ہے۔ ابن النجار یا ابن الجوزی کی بتائی ہوئی تاریخیں ظاہری قرائن سے ماخوذ ہیں۔ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کو ابن النجار (م ۶۴۳ھ) پر جو تقدمِ زمانی حاصل ہے اس کی بنا پر میں ابن الجوزی کی نشان دادہ تاریخ کو مقدم سمجھتا ہوں۔ خاص طور پر قدامہ کے ہم طبقہ علماء میں سے بعض کے متعلق ۳۳۵ھ یا ۳۳۶ ہجری تک زندہ رہنا جب ثابت ہو تو ۳۳۷ھ تک قدامہ کا زندہ رہنا کچھ مستبعد نہیں۔ مثال کے طور پر ابو بکر محمد بن یحییٰ الصولی کا نام لیا جا سکتا ہے جو ابو العیناء، المبرد اور ثعلب کا شاگرد ہے اور جس کی وفات ۳۳۵ھ یا ۳۳۶ھ میں بتائی جاتی ہے۔

قدامہ کی کتابیں | ابن الندیم، قدامہ کی مندرجہ ذیل تالیفات بتاتا ہے:

(۱) کتاب الخراج۔

(۲) کتاب نقد الشعر۔

(۳) کتاب صابون الغم۔

(۴) کتاب صرف الہم۔

(۵) کتاب جلاء الحزن۔

(۶) کتاب درياق الفكر۔

(۷) کتاب السیاسہ۔

(۸) کتاب الرد علی ابن المعتز فیما عاب بہ ابا تمام

(۹) کتاب حشو حشاء الجلیس۔

---

[1] مقدمۂ نقد الشعر: ص ۶ حاشیہ ۲ [2] نقد النثر: ص ۳۱۷ (نوشتۂ عبد الحمید العبادی)

(١٠) کتاب صناعۃ الجدل (١١) کتاب الرسالۃ فی ابی علی بن مقلہ و تعرف بالنجم الثاقب (١٢) کتاب نزہۃ القلوب فی زاد المسافر (١٣) شرح السماع الطبیعی - طبیعیات ارسطو کے مقالۂ اولیٰ کی شرح - اس کا ذکر ابن الندیم نے تالیفات ارسطو کے ضمن میں کیا ہے - الفہرست ص٢٥٠) اور اسی کتاب کا نام قدرے ترمیم کے ساتھ القفطی کی مختصر تاریخ الحکماء میں ملتا ہے (ص٣٩) غالباً اسی کتاب کا ذکر حاجی خلیفہ بھی کرتا ہے (کشف الظنون ج ٣ / ١٩ - ٦٢٠ ، فلوگل)

مسعودی ایک کتاب زہر الربیع فی الاخبار کا ذکر کرتا ہے[1] - یاقوت کو اس کتاب سے واقفیت ہے عبد الحمید العبادی[2] اسی کتاب کو غلطی سے زہر الریاض کا نام دیتا ہے - مطرزی کے ذریعہ کتاب الالفاظ کا نام معلوم ہوتا ہے یہی کتاب جواہر الالفاظ کے نام سے محمد محی الدین عبد الحمید کی تصحیح و تحقیق سے شائع ہوئی ہے - (قاہرہ ١٣٥٠ھ) اس کتاب کے مقدمہ کی بابت بوئیبا کر تقریباً یقین رکھتا ہے کہ قدامہ بن جعفر ہی کے قلم سے ہے خواہ پوری کتاب کی نسبت قدامہ کی طرف معرض اشتباہ میں ہو -

نقد النثر قدامہ کی تالیف نہیں ہے

کتاب نقد النثر جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور عبد الحمید العبادی کی مشترک ادارت میں مطبوع ہوئی ہے (قاہرہ ١٣٥٩ھ) قدامہ کی طرف اس کی نسبت کے بارہ میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور عبد الحمید العبادی کے خیالات جداگانہ ہیں - ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس کو قدامہ کے بجائے کسی شیعی ادیب کی تالیف قرار دیتے ہیں، لیکن اس مسئلہ سے مزید تعرض کرنا غیر ضروری سمجھ کر اس کی تحقیق کی بابت عبد الحمید العبادی کے نوشتہ کی طرف توجہ دلانے پر اکتفا کرتے ہیں[3] العبادی اس کتاب کی داخلی شہادتوں کی بناء پر قدامہ کی طرف اس کی نسبت صحیح سمجھتے ہیں اور نقد الشعر و نقد النثر کے مضامین کی ہم آہنگی پر مفصل بحث کرتے ہیں - ١٩٤٩ء میں ڈاکٹر علی حسن عبد القادر نے ایک مخطوطہ کا انکشاف کیا تھا جس کا نام کتاب البرہان فی وجوہ البیان ہے - یہ مخطوطہ (CHESTER BEATTY COLLECTION) ، ڈبلن (DUBLIN) میں محفوظ ہے اور دراصل کتاب نقد النثر کا کامل نسخہ ہے اس مخطوطہ پر مؤلف کا نام قدامہ بتایا گیا ہے لیکن ڈاکٹر علی حسن عبد القادر نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ قدامہ کی تالیف نہیں بلکہ ابو الحسین اسحق بن ابراہیم بن وہب الکاتب کی کتاب ہے جس کی بابت کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ یہ یقین ہے کہ ٣٣٥ھ کے بعد یہ کتاب لکھی گئی اس نسخہ کی رو سے مطبوعہ نقد النثر کا نسخہ بے حد ناقص قرار پاتا ہے اور اس میں اصل کتاب کی دو تہائی سرے سے موجود نہیں (مجلۃ المجمع العلمی ١٩٤٩ء) بوئیبا کر ڈاکٹر علی حسن عبد القادر کی تحقیق کا خلاصہ پیش کرتے ہی نقد الشعر اور البرہان فی وجوہ البیان (مطبوعہ نقد النثر) کے مماثل مضامین سے بحث کا آغاز کرتا ہے -

---

[1] مروج الذہب ج ١/ ص١٧١ (یورپ) [2] نقد النثر: ص١٠ - [3] نقد النثر: (تمہید فی بیان العربی: ص٢ و ص٢٤)
٢٣

میر کی اخلاقی قدریں

(جناب لکشمی نرائن وششٹ تابش ایم - اے - بی - ایڈ)

اخلاق اور مذہب کا گہرا تعلق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مذہب کا اخلاق جداگانہ ہوتا ہے - اس کا مفہوم یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد اخلاق پر قایم ہے - مذہب کا مقصد انسان کو با اخلاق بنانا ہے تاکہ وہ اس دُنیا میں رہ کر بہتر زندگی بسر کر سکے، خود جئے اور دوسروں کو جینے دے - یہی وجہ ہے کہ ظاہر اطور پر مذاہب جُدا جُدا ہیں لیکن ان کی اخلاقی قدریں جُداگانہ نہیں - وہ آفاقی ہی نہیں بلکہ لامکانی ہیں بقول شخصے شاعری کا مقصدِ اولین اخلاقی قدروں کی اشاعت ہے - اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شاعری صحیح معنوں میں شاعری کہلانے کی مستحق نہیں جو اُن اخلاقی قدروں کو فروغ نہ دے اگر شاعری کا اصل مقصد یہی سمجھ لیا جائے تو موجودہ شاعری کا بیشتر حصہ نذرِ آتش کر دینا پڑے گا -

ایک زمانہ تھا جب عرب میں شاعری کا خوب چرچا تھا اور عرب کے عوام اپنے اس خداداد عطیہ پر اس قدر نازاں تھے کہ انھوں نے ساری دنیا کو اپنے سامنے گونگا (عجم) سمجھا مگر قرآن شریف میں واضح طور پر یہ بات بتادی گئی ہے کہ پیغمبرِ اسلام شاعر نہیں تھے، وہ پیامبر تھے اس کے باوجود قرآن شریف بر معنی میں شاعری کا مکمل ترین نمونہ سمجھا جاتا ہے - یہاں کچھ ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن پر مکمل تحقیقات کی ضرورت ہے جیسے شاعری اور موسیقی، تخئیل اور موسیقی، الفاظ اور موسیقی اور ان سب کا باہمی تعلق -

نفسیات کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی انسان کے ذہنی ارتقار کی کڑیاں گننے کے لئے اُس کی زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لینا ضروری ہے - یہ جائزہ ہر دور کے لئے مختلف ہوگا اور ان دوروں میں اہم ترین دورِ اوائل عمر کا سمجھا جاتا ہے - ماحول کا جو اثر اس دور میں کسی انسان کے ذہن پر پڑے گا وہ نقوش ذہن پر عمر بھر مرتسم رہیں گے اگر اس نظریہ کے مطابق میر کی زندگی کو دیکھا جائے تو اُن کا بچپن اُس عہد کے لحاظ سے اچھی طرح بسر ہوا تھا - دس سال کی عمر میں پہلی بار انھیں دنیا کی تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا - یہ دس سال

کس طرح گذرے اس کا اندازہ "ذکر میر" کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ والدین کی محبت سے زیادہ انھیں اپنے منہ بولے چچا (امان اللہ) کی محبت حاصل تھی۔ میر کو غالباً اپنے والد بزرگوار کے مرنے کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا کہ عم بزرگوار کے انتقال کا۔ میر کے ابتدائی دس سال اسی بزرگ کی صحبتوں میں گذرے۔ اس زمانہ میں ان کی ننھی آنکھوں نے عشق حقیقی کے وہ مناظر دیکھے، اخلاق کی وہ تجلیاں دیکھیں، اور ان کے خام ذہن نے فلسفۂ تصوف کے ان رازوں کو کھولنے کی مقدور بھر کوشش کی جو سعدی شیرازی کو چالیس سال کی عمر عزیز گذارنے کے بعد میسر ہوتے۔ ان کے والد نے انھیں عشق کی تلقین کی اور یہ اُسی کا اثر ہے کہ انھوں نے عشق پر کافی لکھا ہے۔ یکایک ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور انھیں دُنیاوی زندگی کے نشیب و فراز کا احساس ہوا۔ اپنے پرائے ہو گئے، محبت، نفرت میں تبدیل ہو گئی اور مجبوراً انھیں وطن کو خیرباد کہنا پڑا جیسا کہ "ذکر میر" میں لکھا ہے:

"جو لوگ درویش کی زندگی میں میری خاکِ پا کو ---- سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے اب انھوں نے مجھ سے آنکھیں چُرا لیں"۔

میر کی زندگی کا یہ واقعہ ایسا سانحہ ہے جو اخلاق کی کسوٹی کہا جا سکتا ہے۔ اس پر انھوں نے اپنوں اور پرایوں اور عزیز و اقارب کے اخلاق کو پرکھا، اپنے اس ماحول کی آزمائش کی جس میں انھوں نے دس سال گذارے تھے، اُن آشناؤں اور بے گانوں میں سے انھیں ایک ہمدرد نظر آیا اور انھیں اپنی مختصر سی دنیا میں فقط ایک ستارہ جگمگاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ والہانہ اس کی طرف بڑھے مگر راستے میں خطرے حائل ہوئے۔ میر کی نظروں میں اُس ستارے کی۔ تابناکی عمر بھر جگمگاتی رہی اور یہی نور ان کی عشقیہ شاعری کی روح ہے۔ ذوق کا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میر گھبرا کر اُس مختصر سی دُنیا سے نکلے مگر انھیں اس کا کیا علم تھا کہ وہ باہر کی وسیع و عریض دنیا میں بھی سکون کو ترستے رہیں گے۔ آگرہ سے باہر نکلنے کے بعد میر صاحب کو زندگی کے جو تلخ تجربات ہوئے "ذکر میر" میں ان کے ثبوت موجود ہیں۔ مصائب و آلام کا یہ سلسلہ جو اُس عہد کی تاریخی خصوصیت بن چکا تھا اخیر عمر تک

میر کے ساتھ رہا۔ اُس نے ان کے ذہن میں اخلاق کا ایک مخصوص فلسفہ پیدا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دل کو تسکین دینے کے لئے حقیقتاً یہ نتیجہ نکالا کہ انسان کے اندر پختگی اور وسیع الخیالی اُسی وقت آتی ہے جب وہ ساری دنیا کو دیکھے بھالے یعنی اس کا بغور مطالعہ کرے۔ گھر پر بیٹھ کر انسان تجربہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے اُسے ہر قسم کے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے اور دور دور کا سفر کرنا پڑتا ہے کیوں کہ تجربہ سے ہی انسان بنتا ہے اور اُسی وقت اس کے اندر روشنی پیدا ہوتی ہے جو اُسے ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرتی ہے ؎

پختہ کاری کے تئیں سفر ہے شرط ۔۔۔ خامی جاتی ہے کوئی گھر بیٹھے

شیخ سعدیؔ فرماتے ہیں ؎

ہرگز اے خام آدمی نشوی ۔۔۔ تا بہ دکان خانہ در گروی

فارسی کے ایک اور شاعر نے اس طرح کہا ہے ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے ۔۔۔ صد تجربہ شد حاصل در راہ بہر گامے

اور یہیں سے ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انسان کی عزّت اس کے اپنے نہیں بلکہ پرائے کرتے ہیں، وطن میں نہیں بلکہ باہر اس کی عزت ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ انسانی فطرت ہو۔ اس لئے کہ تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ میرؔ نے مشہور تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے ؎

عزت کسو کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ ۔۔۔ کنعاں سے جا کے مصر میں یوسف ہوا عزیز
پاکیزہ گوہروں کی عزت نہیں وطن میں ۔۔۔ یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا

منشی چندر بھان کیفیؔ دہلوی کہتے ہیں ؏

اہلِ ہنر کی قدر وطن میں ذرا نہیں

کسی کا مشہور شعر ہے ؎

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا ۔۔۔ عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا

اخلاق کی سب سے پہلی چیز شاید انسانی عظمت ہے یعنی انسان کی پیدائش کا مقصد اور اس کا منات

میں اس کی صحیح اور مناسب جگہ۔ اس مسئلہ کے ساتھ ساتھ انسان کے خالق کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔
میر کے سامنے انسان کی بزرگی اور فضیلت کا وہ فلسفہ تھا جو قرآنِ کریم میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس نظریہ
پر تصوف کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم میں صاف طور پر انسان کو اشرف المخلوقات ہی نہیں بلکہ خدا
کا نائب بتایا ہے۔ چنانچہ میر انسانی عظمت کے قائل ہیں۔ ذیل کے اشعار اس بات پر دال ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم — برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

یہ مشتِ خاک یعنی انساں ہی ہے رو کش — ورنہ اٹھائی کن نے اس آسماں کی ٹکر

پھر نہ شیطاں سجودِ آدم سے — شاید اس پردے میں خدا ہووے

کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو — اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہووے

آدمی سے ملک کو کیا نسبت — شان ارفع ہے میر انساں کی

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے، ورنہ — آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

تھوڑے میں دور کھینچے ہے کیا آدم آپ کو — اس مشتِ خاک کا دماغ آسمان پر

باوجودِ ملکیت نہ ملک نے پایا — وہ تقدس کہ جو ہے حضرتِ انساں کے بیچ

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں — تب کوئی ہم سا صاحبِ صاحب نظر بنے ہے

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

کہیں نسلِ آدمی کی اٹھ نہ جاوے اس زمانے میں — کہ موتی آبِ حیواں جانتے ہیں آبِ انساں کو

برسوں تئیں جب ہم نے تردد کئے ہیں تب — پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو

لیکن انسانی جامہ مل جانے سے ہی انسان نہیں بن جاتا۔ اس میں انسانی خوبیاں ہونا بھی لازمی ہیں۔
میر کہتے ہیں ؎

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال — آدم نہیں ہے، صورتِ آدم بہت ہے یہاں

اور یہ حقیقت ہے کہ صحیح معنوں میں آدمی بننا بڑا مشکل ہے۔ میر نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک
آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں

بیاںؔ یزدانی میرٹھی نے بھی کہا ہے ؎

اے بیاںؔ سہل ہے ہم رنگِ ملائک ہونا
آدمی بنتا ہے انسان بڑی مشکل سے

لیکن ——— اگر اپنے آپ کو خدا سمجھ لے تو سماج کی کیا حالت ہو؟ اس کا اندازہ مشہور صوفی منصور کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ انسان اور خدا کا تعلق انفرادی ہو سکتا ہے اجتماعی نہیں۔ انسان کی تخلیق میں ان سب باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ انسان کے ساتھ آرزو کا کانٹا ایسا لگا دیا گیا ہے کہ اس سے اس کا دامن بُری طرح اُلجھا ہوا ہے میر فرماتے ہیں ؎

برنگِ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گزرے
میسر میر صاحب گر دلِ بے مدعا آوے

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

کسی نامعلوم شاعر کا شعر اسی ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے ؎

ہم خدا تھے گر نہ ہوتا دل میں کوئی مدعا
آرزوؤں نے ہماری ہم کو بندہ کر دیا

اور یہ تمنائیں انسان کی خصوصیات ہیں۔ حیوانات میں بھی خواہشات پائی جاتی ہیں لیکن انسانی اور حیوانی خواہشات میں سب سے بڑا فرق اُن خواہشات کے تسکین کے ذرائع کا ہے۔ حیوانی خواہشات اپنے پورا ہونے کے لئے کچھ نہیں دیکھتیں۔ وہاں جس طرح بھی ہو خواہشات پوری کرلی جائیں یہی مدنظر رہتا ہے لیکن انسانی خواہشات پر عقل کا تسلط ہوتا ہے اور یہی عقل اخلاق کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس سماج میں ایک انسان نہیں رہتا، پوری نسلِ آدم اس کے اجزا ہیں۔ اس لئے انسان کو اپنی خواہشات کی تسکین ڈھونڈتے وقت دوسروں کی خواہشات کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔

اس دُنیا میں دولت کے بغیر زندگی مکمل نہیں اور شاید قدرت کا بھی یہی منشا ہے اور حقیقت میں اسی سے دنیاوی عزت قایم ہے ؎

دیکھو گل کو تنک کہ ہو یک سر چڑھا لیتا ہے یہاں
اس سے پیدا ہے کہ عزت اس چمن میں زر سے ہے

نظیر اکبرآبادی نے بھی کیا خوب فرمایا ہے ؎

پیسہ ہی رنگ وروپ ہے، پیسہ ہی مال ہے پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

لیکن سماج میں جتنے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ سب اسی "زر" کی تقسیم سے ہوتے ہیں اور بائبل میں آیا ہے کہ "دولت سب برائیوں کی جڑ ہے۔" اس لئے لوگوں نے اخلاقی طور پر دولت کو اہمیت نہ دے کر صبر وقناعت کو بہتر قرار دیا ہے۔ میر صاحب قلندرانہ زندگی گذارنے کے حق میں ہیں جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

تھا میر عجب فقیر، صابر، شاکر ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سُنی

ہوسکتا ہے کہ یہ ایک قسم کی افیون ہو جو عوام کو سُلانے کے لئے دی گئی ہو جیسا کہ کچھ ترقی پسندوں کا خیال ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس توکل سے ایک عجیب وغریب قسم کی راحت ملتی ہے۔ میر صاحب نے جا بجا توکل کا ذکر کیا ہے ؎

نہ کیوں کہ شیخ توکل کو اختیار کریں زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں

غیرت ایک ایسی خوبی ہے جو ہر انسان کے اندر ہونی چاہیئے اگر حق پوچھا جائے تو یہی عزت کی بُنیاد ہے اور وہی انسان مرد کہلانے کا مستحق ہے جو غیرت جیسی صفت سے متصف ہو ؎

واصل بہ حق ہوئے نہ جو ہم جانے مر گئے غیرت ہو کچھ مزاج میں جس کی وہ مرد ہے

یہاں بھی غیرت کا سبق دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وانسیم صبح سے ہوتا ہے گُل تجھ کو اے مُرغِ چمن غیرت بھی ہے

جاتا ہے یار تیغ بہ کف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

غرور ایک ایسی زبردست انسانی کمزوری ہے جو اسے کسی بلند مرتبہ تک پہنچنے نہیں دیتی۔ اس لئے اسے ترک کرنا ہی لازم ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میر آپ کو جانا جہاں سے سب کو مسلم ہے زیر خاک

مت ہو مغرور اے کہ تجھ میں زور ہے یہاں سلیماں کے مقابل مور ہے

کوئی کیا زیر فلک دیکھا کرے فرقِ غرور　　ایک پتھر حادثہ کا آ لگا، سر جیر گیا

میر صاحب جیسے خود دار انسان کے لئے احسان اٹھانا موت کا پیغام تھا اور حقیقت یہ ہے کہ احسان نہ اٹھانا ایک ایسی خوبی ہے جو خود داری کا جذبہ پیدا کرتی ہے ؎

بہت چاہا تھا ابرِ تر نے لیکن　　نہ منت کش ہوا گلشن ہمارا

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو　　جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہ ہوا

شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب　　کسی عنوان میں ہم چشمِ عزیزاں نہ ہوا

ذوقؔ کا مشہور شعر ہے ؎

احسان ناخدا کا اُٹھائے میری بلا　　کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

جو رضائے الٰہی ہوتی ہے وہ ہر حالت میں ہو کر رہتی ہے۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے نہیں روک سکتی۔ ہونی اور شدنی عام مشہور ہے ؎

ہم میرؔ ترا مرنا کیا چاہتے تھے لیکن　　رہتا ہے ہوئے بن کب، جو کچھ کہ ہوا چاہے

جس انسان کا دل "حرص و ہوس" سے پاک ہوتا ہے وہی اچھا کہلاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ لالچ بُری بلا ہے اور اس میں پھنس کر انسان اپنے دین و ایمان کو گنوا بیٹھتا ہے ؎

حرص و ہوس سے باز رہے دل تو خوب ہے　　ہے قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز　　وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

انسانی خود غرضی مشہور ہے اس واسطے ہر چیز خدا سے ہی طلب کرنی لازم ہے ؎

میرؔ بندوں سے کام کب نکلا　　مانگنا ہے جو کچھ خُدا سے مانگ

داغؔ فرماتے ہیں ؎

داغؔ کو، کون دینے والا تھا　　جو دیا اے خُدا دیا تو نے

بے نیازی اور عاجزی بڑی خوبیاں ہیں جو طرح طرح کی ذلتوں سے انسان کو بچاتی ہیں، ان کو

حاصل کرنے کے واسطے کڑی ریاضت کرنا پڑتی ہے اور دل پر قابو پانا پڑتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میر نے اپنے آپ کو بندہ، حقیر، احقر اور ہیچداں لکھا ہے ؎

آگے جواب ہے اُن لوگوں کے بارے معافی اپنی ہوئی
ہم بھی فقیر ہوئے تھے لیکن ہم نے ترکِ سوال کیا

ہم سے بغیر عجز کبھو کچھ بنا نہ میر
خوشحال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

خودداری انسانی جوہر ہے ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

جو، اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اور —— آخر کار یہ "سرمایۂ توکل" خدا کا نام بن جاتا ہے ؎

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا
سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا

جن لوگوں کو اس دنیاوی زندگی میں سکون اور راحت نہیں ملتی وہ اپنا دل خوش کرنے کے لئے کچھ آخرت کے فلسفے گھڑ لیتے ہیں اور اسی تصور میں، کہ ان مصیبتوں کو اٹھا کر موت کے بعد شروع ہونے والی دنیا میں سکون اور آرام ملے گا، ہنسی خوشی مصیبتوں کا سامنا کر لیتے ہیں۔ اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ عاقبت کی فکر کرنا دوراندیشی ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

فکر کر زادِ آخرت کا بھی
میر اگر تو ہے عاقبت اندیش

توشۂ آخرت کا فکر رہے
جی سے جانے کا ہے سفر نزدیک

یہی وہ مقام ہے جہاں مذاہب پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ عوامی ذہن کے لئے افیون ہے اور یہ اُن کی صلاحیتوں کو سُلا کر تصور میں لطف حاصل کرنا اور انجان مستقبل کا منتظر رہنا سکھا دیتے ہیں۔ میر کی زندگی آفتوں میں کٹی، انھیں دولت کے سہارے ملے مگر وہ سب عارضی ثابت ہوئے۔ ان کے ماحول میں یہ اضطراری کیفیت ناذہنی جزو بن چکی تھی۔ اسی لئے میر کا فلسفۂ اخلاق توکل کے گرد گھومتا نظر آتا ہے اگر میر کو زندگی میں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ مل جاتا اور وہ آمدنی ان کے لئے کافی ہوتی تو کلیاتِ میر میں توکل کا لفظ بھی نہیں ملتا اور آج وہ موجودہ میر نہ ہوتے۔

ظاہر اً نیکی کا بدلہ بدی ملتا ہے اور یہ بات روز دیکھنے میں آتی ہے کہ اگر کسی کے ساتھ بھلائی کی جائے تو اس کے عوض میں برائی ملتی ہے۔ میرؔ اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

ہر آن کیا عوض ہے دعا کا بدی لئے ۔۔۔ تم کیا کرو بھلے کا زمانہ نہیں رہا
بدی نتیجہ ہے نیکی کا اس زمانہ میں ۔۔۔ بھلا کسو سے جو کرتا تو تو برا کرتا
منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی ۔۔۔ حق جو کہے ہے اس کو یہاں دار کھینچتے ہیں

"انوار سہیلی" میں اژدہے اور اونٹ سوار کی مشہور کہانی بھی اسی بات کی غمازی کرتی ہے کہ بھلائی کا بدلہ برائی ملتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نیکی بذاتِ خود ایک ایسی اچھائی ہے جو لافانی حیثیت رکھتی ہے۔ نیک کام کا انجام ہمیشہ نیک ہی ہوگا اس لئے میرؔ نیکی کو اختیار کرنے اور بدی کو ترک کرنے کی تلقین کرتے ہیں ؎

رہتی ہے سو نکوئی، رہتا نہیں ہے کوئی ۔۔۔ تو بھی جو یہاں رہے ہے تو زنہار مت بدی کر

مذہب ایک ایسی روشنی ہے جس کی مدد سے ہم پُر پیچ راستوں سے بے خوف وخطر گذر جاتے ہیں۔ مذہب سچائی کا نام ہے۔ ہر مذہب کا ایک اپنا مسلک ہوتا ہے لیکن ہر مذہب کی بنیادی باتیں مشترک ہوتی ہیں اور پہنچنا سب کو اُسی خدا تک ہے اس لئے بلند نظری اور وسیع الخیالی سے کام لینا چاہیئے۔ میر صاحب کا مذہب انسانیت ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے علم بردار ہیں، وہ مذہبی "رسوم و قیود" سے بالاتر ہیں۔ مذہبی رواداری ان کا ایمان ہے۔ اسی لئے وہ ہندو مسلم تفرقات کو فضول بتاتے ہیں۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر فساد کرنا واقعی نری حماقت ہے ؎

مذہب سے میرؔ کے کیا تجھ کو میرا دیار اور ۔۔۔ میں اور یار اور مرا کاروبار اور
میرؔ کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو ان نے تو ۔۔۔ قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا
کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم، کیا احرام ۔۔۔ کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر ۔۔۔ دیر ہو یا کعبہ، مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے
راہ سب کو ہے خدا سے، جان اگر پہنچا ہے تو ۔۔۔ ہوں طریقے مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل — اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف، کہیں رُخ نہ دکھا — اختلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ

مسلم و کافر کے جھگڑے سے ہیں جنگ و جدل سے رہائی نہیں — لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی، کٹتے رہیں گے سر کے سر

جب میرؔ اپنے عمِ بزرگوار امان اللہ کے ساتھ بایزید سے ملنے گئے تو انھوں نے یہ نصیحت کی کہ اگر مقصود تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی کے دل میں راہ کرو۔ چنانچہ یہ اشعار اسی کی صدائے بازگشت معلوم دیتے ہیں کہ کعبہ اور کاشی جانے سے انسانی مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کسی دل میں راہ پیدا نہ کی جائے ؎

کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ — سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک

کعبے سو بار وہ گیا تو کیا — جس نے یہاں ایک دل میں راہ نہ کی

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا — ہے ختم اس آبلہ پر سیر و سفر ہمارا

میرؔ کی نگاہ میں بلندی ہے اور تنگ نظری نام کو نہیں۔ ان کی نظر میں اونچ نیچ سب یکساں ہیں۔ چنانچہ جلوۂ ربانی دیکھنے کے لئے خاص و عام کی پابندی نہیں اس کی تجلی سے ہر خرد و کلاں لطف اندوز ہو سکتا ہے اور اس کے دروازے سب پر بلا امتیاز یکساں کھلے ہوئے ہیں ؎

عام ہے یار کی تجلّی میرؔ — خاص موسےٰ و کوہِ طور نہیں

کسی چیز کے اصلی جوہر اس کی متضاد چیز سے ظاہر ہوتے ہیں ؎

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے — حسن زنّار ہے تسبیحِ سلیمانی کا

قائمؔ کا یہ شعر اسی ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے ؎

موقوف ضد ہی پر ہے ہر شے کی معرفت — کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

انسانی قدر و منزلت جُدا ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے ؎

پچھتاؤ گے بہت جو گئے ہم جہان سے — آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جُدا ہوتے

خاموشی ایک ابدی سچائی ہے جس کی قدر و قیمت مسلم ہے۔ اس میں وقار پوشیدہ ہوتا ہے ع

اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار

ہر چیز میں خلوص کی ضرورت ہے ؎

اخلاص دل سے چاہیئے سجدہ نماز میں	بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے

میر نے قلبیہ واردات اور کیفیات کی جو سچی تصویریں کھینچی ہیں وہ بے مثال ہیں۔ صاف گوئی انھیں اچھی لگتی ہے اور اسی واسطے انھوں نے اس خوبی پر زور دیا ہے ؎

کہنا جس سے جو کچھ ہو گا سامنے میر کہا ہو گا	بات نہ دل میں پھیر گئی ہو گی منہ پر میرے آئی ہوئی

اور یہ حقیقت ہے کہ میر نے جو کچھ کہا منہ در منہ کہا اور کھلے بندوں کہا۔

اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے ؎

چشم مست اپنی سے صحبت نہ رکھا کر اتنی	بیٹھئے بھی تو بھلا مردم ہشیار کے پاس

دنیائے فانی میں کیا کسی سے لڑنا اور جھگڑنا ہے۔ سب کے نرم گرم اٹھانا چاہیئے، ہر ایک سے اچھا سلوک رکھنا چاہیئے اور کسی کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیئے یعنی زندگی اس طرح گذارنی ضروری ہے کہ خود دوسرے پر بوجھ ثابت نہ ہو ؎

چار دن کا ہے مجہلہ یہ سب	سب سے رکھیئے سلوک ہی ناچار

کسی ایک فن میں کامل مہارت حاصل کرنا انسانی زندگی کا مقصد ہے اور اس کے واسطے ہمت کی ضرورت ہے ؎

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا	آدمی ہووے کسی پیشہ میں جرأت چاہیئے

حالی نے کہا ہے ؎

کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے

انسان اُسی وقت مشہور اور نامور ہو سکتا ہے جب وہ مستقل طور پر اپنا ٹھکانہ بنا لیتا ہے اور ایک ہی جگہ جم کر بیٹھ جاتا ہے جیسا کہ انگریزی کی مشہور کہاوت بھی اسی حقیقت کو جتلاتی ہے :

میر صاحب فرماتے ہیں ؎

نہ اُٹھ تو گھر سے اگر چاہتا ہے ہوں مشہور
نگیں جو بیٹھا ہے گڑ کر تو کیسا نامی ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ گیا ہوا وقت واپس نہیں آتا اور ظاہر ہے کہ وقت بڑی قیمتی چیز ہے اس لئے جو وقت باقی رہ گیا ہے اُسی کو غنیمت جان کر مستعدی اور نیک نیتی سے ہر کام کرنا چاہیئے کیوں کہ انسانی زندگی چند روزہ ہے

گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب، ہوئے ہیں گنوا کے خراب سب
تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیوں

خواجہ میر درد کا پُر معنی شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کرائے درد
ہر دم دمِ عیسیٰ ہے تجھے پاس نہیں ہے

انسان خطا کا پُتلا ہے اسی سے غلطی سرزد ہوتی ہے لیکن میر صاحب اسے کوئی بری بات نہیں بتاتے۔ ان اشعار کے تیور ملاحظہ فرمایئے ؎

یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو
کبھو آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر

در پے خونِ میر ہی نہ رہو
ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

"تائیدِ آسمانی" کے بغیر کسی کام میں کامیابی حاصل کر لینا قدرے مشکل ہے ؎

کیئے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ہے
کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے

آہ لاکھ "تدبر و تبیر" سے زیادہ کام کرتی ہے اور اس میں بلا کا اثر ہوتا ہے ؎

غافل نہ رہو آہ ضعیفوں سے سرکشاں
طاقت ہے اُس کو یہ کہ جہاں کو جلا سکے

کبیر کا مشہور شعر ہے ؎

دُربل کو نہ ستائیو، جا کی موٹی ہائے
موٹی کھال کی سانس سے سار بھسم ہو جائے

یہ بات زبان زدِ خاص و عام ہے کہ دوا سے زیادہ دُعا میں تاثیر ہوتی ہے ؎

تاثیر ہے دُعا کو فقیروں کی میر جی
ٹک آپ بھی ہمارے لئے ہاتھ اُٹھایئے

یک وقتِ خاص ہی میں مری کچھ دعا کرو تم بھی تو میرؔ صاحب قبلہ فقیر ہو

محبت وہ ہے جو نبھائی جا سکے اور اسی سے وہ لطف مل سکتا ہے جو سکون کہلاتا ہے ؎

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ

رجب علی بیگ سرورؔ نے "انشائے سرور" رقعہ ۲۶ میں لکھا ہے :-

"سب ملتے ہیں چاہنے والا نہیں ملتا۔ ترک سہل ہے۔ نباہنے والا نہیں ملتا۔"

اسی ضمن میں اُردو کے ایک مشہور شاعر نے کہا ہے ؎

یہ دُنیا ہے یہاں دل کا لگانا کس کو آتا ہے ہزاروں پیار کرتے ہیں، نبھانا کس کو آتا ہے

مصیبت کی قدر مصیبت زدہ ہی جانتا ہے اور عشق و محبت کی حقیقت سے صرف وہی واقف ہے جس کا دل کسی کی زلفوں کا اسیر ہو اور اُسی کو اس کی لطف انگیزیاں حاصل ہوتی ہیں ؎

آزار کھینچنے کے مزے عاشقوں سے پوچھو کیا جانے وہ کہ جس کا کہیں دل لگا نہ ہو

نظیریؔ کا یہ شعر یہاں صادق آتا ہے ؎

بزیرِ شاخِ گُل افعی گزیدہ بلبل را نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

ہر انسان کا نوشتۂ تقدیر علیحدہ علیحدہ ہے ؎

شیخ جنت تجھے، مجھے دیدار واں بھی ہر اک کی ہے جُدا قسمت

جب تک زندگی ہے اس دنیائے آب و گِل میں سُکھی یا دُکھی بہر صورت رہنا ہے۔ زندگی ان دونوں صورتوں میں سے ایک صورت میں ضرور گذارنی پڑتی ہے لیکن اس دُنیا سے دوسری دنیا میں جانے سے پہلے ایسے کام کرنے چاہئیں جن کی بدولت مرنے کے بعد بھی مرنے والا یاد آتا رہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اور اس کے نیک کاموں یا خوبیوں کی یاد تازہ ہوتی رہے اور ایسی بات نہ ہو کہ لوگ اس کا نام لینا ہی شرم، بدنامی اور ذلت کا باعث سمجھیں۔ میرؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

بامے دُنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو　　ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اور ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

سب کام سونپ اس کو جو کچھ کام بھی چلے　　جب نام اس کا صبح کو تا نام بھی چلے

مُلّا وجہی نے "قطب مشتری" میں فرمایا ہے ؎

دُنیا میں توں آیا تو کچھ نام کر　　خدا کوں جو بھاتا ہے سو کام کر

کبیر نے بھی کیا خوب کہا ہے ؎

جو تو آیا جگت میں جگت سرا ہے توئے　　ایسی کرنی کر چلو، پا چھے ہنسی نہ ہوئے

کسی چیز کو انسان اُسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب وہ خود کو اس کی جستجو میں ضم کر دے۔ وانہ جب اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے تو اسی کی وجہ سے ہرا بھرا گلزار نظر آنے لگتا ہے ؎

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اُس کی جیسے　　بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

انسان کو سوچ سمجھ کر بات کہنی چاہیے اور بغیر سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے۔ کسی بات کا اسی وقت اثر ہوتا ہے جب یہ غور و خوض کے بعد کہی جاتے۔ اس لئے میر کہتے ہیں ؎

ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن　　یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ

اس لئے کہ اگر زبان بے محل کھولی گئی تو اس میں خطرہ کا امکان ہوتا ہے جس کی طرف ایک فارسی شاعر بہائی نے اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

نگہدار از بیش گوئی زباں　　کز افزونیٔ نقطہ گردد زیاں

یہ مشاہدہ ہے کہ اگر زندگی کے دن شروع سے اخیر تک ایک ہی طرح گذار ے جائیں تو ہر انسان کی اس دُنیا میں اچھی نبھ جاتی ہے کیوں کہ ہر انسان پر اچھے یا بُرے دن آتے رہتے ہیں۔ اگر دولتمندی کے زمانہ میں گلچھرے اڑا ئے جائیں اس لئے کہ اس وقت روپے پیسے کی ریل پیل ہوتی ہے لیکن اگر ناداری کا زمانہ آجائے تو اس وقت کس طرح سے عزت کے ساتھ زندگی گذاری جا سکے گی۔ اس لئے یہ بڑا اچھا اصول ہے کہ زندگی کو ایک رنگ میں ڈھال لیا جائے اور اسے یکساں طور پر گذارا جائے تا کہ آڑے وقت

میں کسی قسم کی ذلّت کا سامنا نہ کرنا پڑے ؎

ہر اک سے ڈھب جُدا ہے، سارے زمانہ کا بھی — بنتی ہے جس کسو کی یک طور پر بنے گی

اخلاقی بلندی ملاحظہ ہو ؎

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر — کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

——— میر صاحب نے سبحہ و زنار کی جکڑ بندیوں سے بے نیازی سکھلائی ہے۔ انھوں نے ہمیں خود غرضی، ظلم، غرور، برائی، تعصب، لالچ اور حسد وغیرہ اخلاقی کمزوریوں کو ترک کرنے کا سبق دیا ہے اور حقیقت میں یہی وہ "امراض" ہیں جو ایک انسان کی راہِ ترقی میں حائل ہوتے ہیں اور اُسے منزلِ مقصود تک پہنچنے نہیں دیتے۔ انھیں حقائق شناسی کی وجہ سے ان کی لے میں آفاقی نغمہ ہے، ان کی آواز میں کائنات کی صدا مضمر ہے اور ان کے دل میں ساری دُنیا کا درد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنگ دُنیا سے نکل کر اتنی وسیع و عریض دُنیا میں پہنچ گئے ہیں جہاں مروّت اور دردمندی پنپتی نظر آتی ہیں اور فی الواقع ان کی عظمت کا ایوانِ رفیع بھی انھیں ابدی سچائیوں پر قایم ہے جن کی آب و تاب میں کبھی بھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور ظاہر ہے کہ انسان انسان کی دوا ہے۔ میر صاحب نے ٹھیک کہا ہے ع — درد مندی ہی تو ہے جو کچھ کہ ہے

آخر کار ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ میر کے فلسفۂ اخلاق میں آفاقیت بھی ہے اور دنیاوی ہوشمندی بھی، انھوں نے اُن اخلاقی اقدار پر زور دیا ہے جو نہ صرف انھیں عزیز تھیں بلکہ وہ آج بھی عزیز ہیں اور ان کی آفاقی قدر و قیمت میں کبھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔ دردمندی، انسانی فضیلت، کُشادہ دلی، رواداری، نیکی، انسانیت اور انسان دوستی وغیرہ ایسی دائمی قدریں ہیں جن پر نہ صرف دنیا کا امن قائم ہے بلکہ نظامِ کائنات کا دارومدار انھیں قدروں پر ہے ——— اور یہی زندگی کی صداقتیں ہیں جو قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں اور ہمارے دکھی دلوں پر مرہم کا کام کرتی ہیں۔ اس لئے انسان کامل اُسی وقت بنتا ہے جب اس میں اخلاقی خوبیاں ہوں "ذکرِ میر" میں درحقیقت کیا لاجواب بات کہی ہے کہ "تا آدم اخلاق پیدا نہ کند، انسان نہ شود" اس واسطے انسان بننے کے لئے پہلی شرط اخلاق ہے اور جس میں اخلاق ہے وہ تمام خوبیوں کا گنجینہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میر کے دل میں دردمندی اور طبیعت میں

ادبیات

غزل

از

(جناب الٓم مظفر نگری)

کیفِ نغمہ بھی ہے کچھ نالۂ دمساز کے ساتھ
وہ کہیں بول رہے ہیں مری آواز کے ساتھ

سلسلہ سوز کا ہر رنگ میں ہے ساز کے ساتھ
جلتی ہے شمع بھی پروانۂ جانباز کے ساتھ

جلوہ گر ہیں جو وہ آئے تو اس اعجاز کے ساتھ
فتنے اُٹھ اُٹھ کے پسے ہر قدمِ ناز کے ساتھ

اپنی منزل پہ پہنچتا ہے مثالِ شبنم
جو بھی اُڑتا ہے یہاں ہمتِ پرواز کے ساتھ

انتظامِ دوجہاں زیر و زبر ہو بھی چکا
وہ سنورتے ہی رہے جلوۂ ہر ناز کے ساتھ

سوزشِ داغ بھی موجود ہے زخمِ دل میں
لطفِ انجام بھی ہے عشق میں آغاز کے ساتھ

دیکھئے بیکس و ناداں پہ گزرتی کیا ہے
دل گیا تو ہے نگاہ غلط انداز کے ساتھ

زندگی ہی نے تو رکھا مجھے محرومِ وصال
پھر بھی اٹکے ہوں ہیں اس تفرقہ انداز کے ساتھ

تابِ نظارہ کی کچھ اور بڑھے گی ہمت
کھیلنے دے تو اسے جلوہ گہہِ ناز کے ساتھ

بدگماں عشق نہ اندازِ بیاں سے ہو جائے
بات کرتے ہوئے ہو ڈر نہ لبوں ہیں ہم راز کے ساتھ

اب تو منزل کے تعین سے بھی آزاد ہوں میں
بڑھ گئی اور طلب ہمتِ پرواز کے ساتھ

مل سکے گی نہ تجھے عشرتِ انجامِ وفا
دیکھ مشغول نہ ہو لذتِ آغاز کے ساتھ

سب ہیں تاثیر میں ڈوبے ہوئے نغماتِ الٓم
اس کو نسبت ہے کسی زمزمہ پرداز کے ساتھ

لوحِ گوشۂ تربت

۱۳ ھ ۷۷

بہ غمِ شیخ رح

۱۹ ۶ ۵۷

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

۷ ۵ ۶ ۹ ۱

حیف در چشمِ زدن دورِ خیار آخر شد — حسرتا ساعتِ تسکین و قرار آخر شد

دورِ علامہ حسین احمدِ شیخ الاسلام رح — خلفِ راشدِ اسلافِ کبار آخر شد

نازشِ طائفۂ حاجی امدادِ الٰہ — رونقِ معرکۂ منبر و دار آخر شد

آیۂ اِنَّ صَلَاتِیْ نصب العین کہ داشت — خلوت و جلوتِ آں لیل و نہار آخر شد

محورِ حسنِ عمل، نقطۂ پرکارِ خلوص — پیکرِ زہد و تقا، آخرِ کار آخر شد

وائے برہند کہ از رفتنِ شیخ الاسلام — دعوتِ دینِ متیں سرّ و جہار آخر شد

گفت حادی بہ صد افسوس سنِ رحلتِ شیخ رح

"زُد گل سیر ندیدیم بہار آخر شد"

۱۹ ۶ ۵۷

از

جناب مولوی محمد عبدالباری صاحب حادی

تبصرے

اسلام کا سیاسی نظام از مولانا محمد اسحق صاحب سندیلوی استاد دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ تقطیع کلاں ضخامت ۳۱۰ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت صہ، شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اس لئے اُس کی تعلیمات جہاں زندگی کے دوسرے معاملات ومسائل کے نظاموں پر مشتمل ہیں۔ اُن میں سیاسی نظام کا بھی مکمل خاکہ پایا جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق کے عہد میں اس نظام کی ابتدائی ترتیب وتدوین ہوئی۔ پھر خلافتِ عباسیہ کے دور میں جب اسلامی مملکت کے حدود بہت وسیع ہوگئے اور مختلف اقوام کے ساتھ اختلاط وارتباط کے باعث نئے نئے سیاسی مسائل پیدا ہوئے تو خلافت کے ایما پر متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں کلی یا جزئی طور پر اسلام کے سیاسی نظام پر بحث کی گئی تھی۔ اُردو میں "اسلام کا نظام حکومت" "مسلمانوں کا نظم مملکت" ندوۃ المصنفین کی طرف سے اور بعض اور کتابیں دوسرے اداروں سے اسی موضوع پر شائع ہو چکی ہیں زیر تبصرہ کتاب بھی جواب سے پندرہ سال پہلے لکھی گئی تھی مگر چھپی اب ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں لائق مصنف نے شروع کے چار ابواب میں نظریۂ خلافت، نیابتِ الٰہی۔ قانون اور حکومت کا تعلق۔ قانون کے اقسام۔ اسلامی قوانین کے ماخذ۔ قانون کے غلط ماخذ اور اسلام میں حکومت کے درجہ پر عقل اور نقل دونوں کی روشنی میں مفصل گفتگو کی ہے اور اس سلسلہ میں آج کل کے بعض عافیت پسند لوگوں کے اس خیال کی پرزور اور مدلل تردید کی ہے کہ اسلامی حکومت کا قایم کرنا فرض نہیں ہے، اُس کے لئے جدوجہد کرنا اسلامی فریضہ نہیں بلکہ حکومت خود بخود عملِ صالح کے انعام کے طور پر عطا ہوتی ہے اس تمہیدی گفتگو کے بعد کتاب کے باقی ابواب میں جن کی تعداد چودہ ہے سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں استحقاقِ خلافت کے شرائط۔ انتخاب کا طریقہ۔ بیعت۔ خلیفہ کے

فرائض وواجبات۔ مجلس شوریٰ۔ خلیفہ کے اختیارات۔ مجلس تقنین وتشریع۔ رعایا کی مختلف قسمیں، ان کے حقوق وفرائض۔ مالی نظام۔ اربابِ تنفیذ۔ عدلیہ۔ دفاع۔ صوبائی حکومتیں۔ امورِ خارجہ وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد آخر میں غیر اسلامی سیاسی افکار ونظریات پر تنقید کی گئی ہے۔ لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے مدلل اور جزم ویقین کے ساتھ لکھا ہے اور اس اعتبار سے جو لوگ اسلام کے سیاسی نظام کو جاننا چاہتے ہیں اُن کو اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی۔ لیکن جیسا کہ مقدمہ اور دیباچہ میں ہی بتا دیا گیا ہے یہ کتاب سیاسی نظام اسلامی کا صرف ایک اساسی خاکہ پیش کرتی ہے۔ نظمِ مملکت کے مختلف پہلو ہیں مثلاً بجٹ۔ وسائل آمد ورفت۔ سکرٹریٹ۔ پبلک ورکس وغیرہ جن پر مستقل ابواب کے ماتحت گفتگو کی ضرورت تھی۔ مگر اُن کا تذکرہ نہیں ہو سکا ہے اس کے علاوہ یہ خاکہ اسلام کے صرف ابتدائی عہد کا ہے۔ آج اگر کہیں کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کو اسلام کے اصولِ تشریع کے ماتحت بہت سی چیزوں میں مزید وسعت پیدا کرنی ہوگی مثلاً مصنف صفحہ ۲۴۳ پر لکھتے ہیں

"اسلامی حکومت میں ان ظالمانہ محاصل کا وجود نہیں ہو سکتا جو آج کل کی عوامی وجمہوری حکومتیں مفادِ عامہ کا نام لے لے کر پبلک کے سر پر لادتی جاتی ہیں۔ مثلاً انکم ٹیکس۔ برآمد اشیاء کا ٹیکس۔ بکری ٹیکس۔۔

۔۔۔۔۔۔ اس قسم کے محاصل عائد کرنا یقیناً ظلم ہے اور اسلامی حکومت اس کا ارتکاب کرنے کی مجاز نہیں"۔

ہمارے خیال میں اسلامی حکومت کو پورا حق حاصل ہے کہ اگر وہ ضرورت سمجھے تو یہ تمام ٹکس لگا سکتی ہے۔ کسٹم ڈیوٹی۔ برآمد اشیاء کے ٹکس کا تذکرہ تو خود عہد فاروقی وعثمانی میں بھی آتا ہے۔ کتبِ فقہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں اسلامی حکومت کے اختیارات کافی وسیع ہیں چنانچہ فاضل مصنف نے صفحہ ۲۴۴ پر شامی کی جو عبارت نقل کی ہے اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال کتاب اگرچہ موضوعِ بحث کے تمام گوشوں پر حاوی نہیں اس اعتبار سے اپنے مقصد میں بہ وجوہ کامیاب ہے کہ اس میں اسلام کے سیاسی نظام کی اصل روح اور اس کے بنیادی خدوخال بہ کمال وضاحت آگئے ہیں۔ اس حیثیت سے یہ کتاب اس لائق ہے کہ سیاسیات کا ہر طالب علم اس کا مطالعہ کرے۔

زجاجۃ المصابیح از جناب مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ الحیدر آبادی الحنفی تقطیع کلاں ضخامت ۴۶۴ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت چھ روپے پتہ:- جناب مصنف محلہ حسینی علم جوبلی پوسٹ آفس (۲۷) حیدر آباد دکن۔

یہ کتاب حدیث کی مشہور و متداول کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ کے مولف خطیب تبریزی شافعی المذہب ہیں اس لئے انھوں نے مسائل کی ترتیب شافعی مذہب کے مطابق ہی رکھی ہے۔ اس کے برخلاف سید عبداللہ صاحب نے زجاجہ میں مسائل حنفی مسلک کے مطابق ترتیب دیے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی مزید خصوصیات یہ ہیں کہ صحیح بخاری کے طرز پر ہر بڑے عنوان کے بعد قرآن مجید کی متعلقہ آیات نقل کی گئی ہیں۔ مشکوٰۃ میں ایک مسئلہ کے متعلق جو احادیث لائی گئی ہیں ان کو تین فصلوں پر منقسم کیا گیا ہے۔ لیکن زجاجہ میں تمام احادیث بلافصل ایک ہی جگہ جمع کر دی ہیں۔ جس کے باعث پڑھنے میں تسلسل قایم رہتا ہے اور مسائل بیک نظر معلوم ہو جاتے ہیں۔ پھر احادیث کی توضیح وتشریح، مسئلہ متعلقہ کے بارہ میں حنفی مسلک کی وضاحت اور احادیث اور دوسرے ذرائع سے اُس کی تائید ان سب کا ذکر حواشی میں باقاعدہ حوالوں کے ساتھ ہے۔ اس طرح یہ کتاب فنِ حدیث اور مسلک حنفی دونوں کے اعتبار سے ایک نہایت رفیع علمی اور دینی خدمت ہے حق تعالیٰ حضرت مصنف کو اس کا اجر عطا فرمائے عصر حاضر میں حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری کے بعد فاضل مصنف ہندوستان میں دوسرے بزرگ ہیں جنہوں نے مسائلِ حنفیہ کے لئے اس طرح احادیث کا ذخیرہ مرتب کر کے حنفیہ کے دامن کو ایک بڑے داغ سے پاک وصاف کر دیا ہے۔ اس کتاب کی دو جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں اور برہان میں اُن کا تذکرہ آچکا ہے۔ یہ تیسری جلد ہے جو کتاب القصاص۔ کتاب الحدود۔ کتاب الامارۃ والقضاء اور کتاب الجہاد اور ان سے متعلقہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ مدارسِ عربیہ کے نصاب میں شامل کی جائے۔

ظفر علی خاں از جناب شورش کاشمیری تقطیع متوسط ضخامت ۲۳۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد چار روپیہ پتہ:- مطبوعات چٹان ۸۰ میکلوڈ روڈ لاہور۔

مولانا ظفر علی خاں مرحوم اُردو زبان کے بلند پایہ ادیب ۔ خطیب ۔ شاعر ۔ صحافی اور جنگِ آزادی کے صفِ اول کے سپاہی تھے ایک زمانہ میں اُن کا اور اُن کے اخبار زمیندار کا پورے ملک میں نام گونجتا تھا اور مولانا مرحوم کی نظمیں اور مقالات پڑھنے والوں پر وجد و حال کا عالم طاری کر دیتے تھے۔ آغا شورش کاشمیری نے اس کتاب میں مولانا کی شخصیت کا سراپا ایک مخصوص انداز میں کھینچا ہے جس میں اُن کے علمی و عملی اور اخلاقی کمالات و خصوصیات کے خد و خال پوری طرح ابھر آئے ہیں بقول پروفیسر محمد سرور کے لائق مصنف چوں کہ مولانا مرحوم کی خصوصیات کے اس درجہ حامل ہیں کہ گویا انھیں کا عکس اور مثنیٰ معلوم ہوتے ہیں اس لیے مولانا کی شخصیت نگاری کا فرض اُن سے زیادہ کوئی اور شخص زیادہ بہتر طریقہ پر انجام نہیں دے سکتا تھا۔ یہ کتاب بے حد دلچسپ بھی ہے۔ عبرت آفریں بھی اور معلومات افزا بھی خطابت۔ صحافت اور شاعری ان تینوں کے امتزاج نے اس کو حسین و لطیف مجموعۂ رنگ و بو بنا دیا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقطیع متوسط ضخامت ۲۰۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ قیمت پانچ روپے۔ یہ کتاب بھی شورش صاحب کاشمیری کی چکیدۂ قلم ہے اور مطبوعات چٹان میں سے ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کی ساری زندگی جہد و عمل کی زندگی ہے۔ تحریک خلافت کانگریس۔ احرار۔ جمعیۃ علماء ہند۔ ہر ایک سے وابستہ ہو کر انھوں نے بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ کام کیا ہے۔ وہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے بے پناہ خطیب ہیں۔ جب بولنا شروع کرتے ہیں تو تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں۔ سامعین پر سکتہ کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یوں بھی بڑے باغ و بہار اور ذاتی اوصاف و کمالات کے لحاظ سے غیر معمولی شخصیت کے بزرگ ہیں۔ شورش صاحب کو مولانا ظفر علی خاں کی طرح شاہ جی سے بھی بڑی عقیدت و محبت ہے اور اسی عقیدت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہے۔ شاہ جی کے ذاتی حالات و سوانح اخلاق و عادات اور ان کے لطائف و ظرائف کے ساتھ شاہ جی کا تعلق جن تحریکوں سے رہا ہے ان کی تاریخ بھی اس کتاب میں آگئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب تقسیم سے پہلے ہندوستان کی مختلف تحریکوں کی ایک تاریخی دستاویز بھی ہے۔ زبان و بیان کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے میں ناول کا مزہ ملتا ہے۔

برہان

جلد ۴۰ شمارہ ۳

مارچ سنہ ۱۹۵۸ء مطابق شعبان المعظم سنہ ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آہ! "ترکشِ ما را خدنگِ آخریں"

واحسرتا! ابھی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا اور امتدادِ روزگار کا مرہم اس غم کی جراحت سامانیوں کو کم نہیں کر سکا تھا کہ اچانک مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات حسرت آیات کا سانحہ جاں گداز پیش آگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْن۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیئے ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیئے

عام پیرایۂ بیان میں لوگ کہتے ہیں کہ مولانا علومِ قدیمہ وجدیدہ کے مُبصر عالم تھے سحر طراز انشاپرداز بلند پایہ ادیب۔ جادو فشاں خطیب تھے۔ فہم وتدبر۔ ذہانت وفطانت اُن کے اوصاف وکمالاتِ طبعی کا نگمہ زریں تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب عنوانات مولانا کی اصل شخصیت کی ترجمانی اور عکاسی سے قاصر ہیں وہ بذاتِ خود ایک تاریخ تھے اور تاریخ ساز بھی، وہ مستقل ایک عہد تھے اور عہد آفریں بھی۔ انھوں نے اپنے دماغ اور زبان وقلم سے ایک عہد پیدا کیا جس کی ہمہ گیری اور وسعت کا یہ عالم تھا کہ اُس سے مذہب بھی متاثر ہوا اور ادب بھی۔ سیاست بھی اُس سے اثر پذیر ہوئی اور تہذیب وثقافت بھی۔ اُن کا قلم ابرِ بہاراں بھی تھا اور برقِ شرر فشاں بھی۔ علم وحکمت اور شعر وادب کے میدان کی طرف نکل گیا تو فروغِ نظر اور ایمان ویقین کے لالہ وگل کو پیغامِ نشو ونما دیتا گیا اور چٹیل میدانوں کو گل وگلزار بنا گیا۔ اور اگر اُس نے مذہب اور سیاست کی طرف رُخ کیا تو فکر ونظر اور احساس وشعور کی دنیا میں طوفان برپا کر گیا جو گوشہ نشین تھے وہ اس آواز کو سن کر گھروں سے نکل پڑے جن پر غلامی کی غفلت ومدہوشی کا تسلط تھا وہ جوش وولولۂ عمل سے سرشار ہو کر زندگی کا ایک نیا خون اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس کرنے لگے۔ وہ ہر بزم اور ہر محفل میں پہنچا اور ہر جگہ صدرِ انجمن اور میرِ محفل ہو کر رہا، مذہب۔ سیاست اور

ادب، تہذیب اور معاشرت ان میں کوئی منزل ایسی نہیں ہے جس کی طرف اُس نے رخ نہ کیا ہو اور اُس میں اپنے اجتہاد و تحقیق، سنجیدہ فکر اور نظر بلند کے لازوال نقوش نہ چھوڑ گیا ہو۔

ایک شخص آج کل کے رسمی طریقۂ تعلیم سے ناآشنا ہونے کے باوجود محض اپنی خداداد غیر معمولی ذہانت و فطانت اور ذاتی مطالعۂ و تحقیق سے کس قدر اونچا ہو سکتا ہے مولانا اُس کی برہانِ مبین اور دلیلِ روشن تھے اور اس طرح کی عبقریت (GENIUSNESS) کی مثالیں دنیا میں کم ہی ملیں گی۔ چنانچہ جس طفلِ نوخیز نے سولہ برس کی عمر میں اُردو کی اخبار نویسی سے اپنی زندگی شروع کی تھی نہ نوجوانی میں ہی اس قدر بلند اور سرافراز ہو گیا کہ جس محفل میں سن رسیدہ ملک کے اکابر زعما یکجا بیٹھتے تھے وہاں بھی وہ کرسیِ صدارت پر متمکن نظر آتا تھا اکابر علما نے اُس کو امام الہند کہا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگرس نے تحریکِ آزادی کے سب سے زیادہ نازک دور میں اُسی کی قیادت میں جدوجہد کی آخری منزلیں طے کیں اور پھر آزاد ملک میں سب سے پہلا مرکزی وزیرِ تعلیم بھی وہی بنا۔ یہ ایک محکمہ تو محض رسمی طور پر تھا ورنہ اُس کا ناخنِ تدبیر و فہم ملک کی پوری سیاسی گتھیوں کے ہی سلجھانے میں مصروف رہا۔ چنانچہ آج یہ شخصیت ہم میں موجود نہیں ہے تو ہر طبقہ اور ہر گروہ میں اُس کا ماتم بپا ہے علما رو رہے ہیں کہ اُن کا سرتاج اٹھ گیا، علوم و فنون کے ماہر اشک فشاں ہیں کہ ایک عظیم الشان اسکالر جاتا رہا۔ وزیر اعظم نہرو ماتم کناں ہیں کہ اب مشورہ اور رائے کس سے لیں گے۔ وزیر داخلہ پنڈت پنت کو ملال ہے کہ مولانا کی وفات ملک کے لئے مہاتما گاندھی کے بعد سب سے بڑا حادثہ ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ کسی ایک شخصیت کے جامع اور ہمہ گیر ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ ہر شخص بلاتفریق مذہب و ملت اپنے خاص نقطۂ نظر اور مذاقِ طبع کے ماتحت اُس کو مجموعۂ کمالات و اوصاف سمجھے اور اُس کی وفات پر اشک فشاں و گریہ کناں ہو۔

اگرچہ ملک کی آزادی کے بعد سے مولانا گوشہ نشین ہو گئے تھے اور عوام سے رابطہ باقی نہیں رکھا تھا لیکن اُس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں تھی کہ مولانا اس بات کا یقین رکھتے تھے

کہ ملک کے خاص حالات میں اُن کا پبلک میں آنا اور تقریریں کرنا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اُس سے تھوڑے بہت نقصان کا ہی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ملک کی خدمت کا صحیح اور درست طریقہ یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ ملک کی تعمیری خدمات انجام دی جائیں اور اسی سلسلہ میں پنڈت نہرو کو زیادہ سے زیادہ قوت بہم پہنچائی جائے اور اپنے صحیح مشوروں سے اُن کی مدد کی جائے۔ چنانچہ اس سیاست پر وہ آخر وقت تک عمل پیرا رہے۔ جو کچھ ان کو کہنا ہوتا تھا وہ پنڈت نہرو سے کہلاتے تھے اور جو کچھ انھیں کرنا ہوتا تھا پنڈت جی سے کراتے تھے مولانا کے کیرکٹر کی یہ بھی بڑی اہم خصوصیت تھی کہ اُن کو اپنی زبان اور دل و دماغ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ خود اُن کے بقول انھوں نے سالہا سال کی مشق کے بعد اپنے اندر یہ کمال پیدا کر لیا تھا کہ کسی کی مدح و ذم کا اُن پر مطلق کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور ہمیشہ اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے تھے۔ جب بولنے کی ضرورت ہوتی تھی تو بھرپور تقریر کرتے تھے اور جب بولنے کو مضر جانتے تھے تو بالکل چپ سادھ لیتے تھے۔ مولانا کے سیاسی مخالفین نے برا بھلا کہنے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی تھی۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ مولانا کی پیشانی پر غیظ و غضب کی ایک شکن بھی نہیں پڑی اور کبھی خلوت میں بھی کسی بڑے سے بڑے مخالف کا ذکر بدی کے ساتھ نہیں کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی موجودگی میں کسی کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی، شرافتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ زبان کبھی فحش اور گندہ لفظ سے آشنا نہیں ہوئی غیور و خوددار اس پایہ کے تھے کہ والد مرحوم کی استخواں فروشی ہرگز گوارا نہیں کی حالانکہ اس ذریعہ سے بلا کسی محنت و مشقت کے لاکھوں کما سکتے اور ایک وسیع و متمول طبقہ کے مرشدِ روحانی بن سکتے تھے۔ مولانا پر سخت قسم کی عسرت و تنگدستی کے دور بھی آئے لیکن کیا مجال کہ زبان کسی کے سامنے اظہارِ احتیاج کے ننگ سے آلودہ ہوئی ہو یہ وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اس زمانہ میں علما اور مشائخ اور عباد و صلحا تک میں عموماً ناپید ہیں پھر اور لوگوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مولانا اکابر و زعمائے امت کی پرانی نسل کی آخری یادگار تھے اس لئے مولانا کی وفات ایک شخص اور ایک بڑے آدمی کی موت نہیں۔ بلکہ پورے ایک عہد۔ ایک دور ایک قرن کی موت ہے۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ عہد حاضر کا ایک باب ختم ہو گیا۔ بس سدا رہے نام اللہ کا، "کل شیئ ھالک الا وجھہ" اس دنیا کی ریت یہی ہے۔ جو آیا ہے اس کو جانا ضرور ہے رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اسلامی صنائع لطیفہ اور یورپی صنائع پر ان کا اثر

(از اے ایچ کرسٹی)

مترجمہ

(جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت، لکچرر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، گلبرگہ)

(۲)

چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں مرصع کاری کا فن زوال پذیر ہوچکا تھا۔ شام میں منگولوں کی تباہ کاری اور ۱۴۰۱ء میں دمشق میں تیمور کے قتل عام نے معروف و آباد مراکز میں قیامت برپا کردی اور ۱۵۱۷ء میں عثمانی ترکوں کی فتح مصر نے قاہرہ کے بچے کھچے استادوں کو بھی منتشر کردیا۔ ادھر تو یہ فن اپنے اصلی گھر میں زوال پذیر ہورہا تھا، اُدھر یورپ میں اس فن پر بڑھتی ہوئی توجہ مبذول کی جا رہی تھی جہاں اسے ایک نئی شاندار زندگی حاصل ہونے والی تھی۔ پندرھویں صدی میں مشرق سے وہ تجارتی کاروبار جو حروب صلیبیہ کے زمان میں اطالوی شہروں نے قائم کرلئے تھے، بڑے زور وشور سے پروان چڑھ رہے تھے۔ اطالیہ کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں کے شاندار درباروں میں مشرقی ساز و سامان کو زبردست حسن قبول حاصل ہوگیا تھا۔ ان رئیسوں کے کاری گران چیزوں کو اپنے لئے نمونہ قرار دے کر بڑی نفیس چیزیں تیار کرنے لگے۔ وینس میں اسلامی دھاتی کام نے مقامی صناعوں کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ ایک واضح وینیسی مشرقی دبستاں ہی وجود میں آگیا جس میں اسلامی تکنیک اور شکلیں اطالوی نشاۃ ثانیہ کے مذاق کے مطابق اختیار کی گئی تھیں۔ اس طرح کی صناعی کی ایک مثال پیتل کا ایک طبق ہے جو وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ یہ طبق پندرہویں صدی کے وسط کا بنا ہوا ہے۔ اس پر چاندی کی مرصع کاری کی گئی ہے۔ نقشہ اسلامی ہے اور اس میں گتھے ہوئے بیل بوٹوں کا کام ہے جو اس سے پہلے کے عہدوں کے قاہرہ کی تزئین کاری کی یاد تازہ کردیتا ہے۔ اس طبق کے بیچ میں چاندی

کا ایک سپر بنایا گیا ہے جس پر میناکاری میں ویرونا کے ایک امیر خاندان اوچی دی گیں کا خاندانی نشان بنا ہوا ہے۔ اسی طرح دوسری چیزیں بھی ہم عصر ایرانی کام کے نمونے پر بنائی جا رہی تھیں جو خود وینیس میں ہو رہا تھا۔ یہ کام ایرانی صناع انجام دے رہے تھے جو اس شہر میں آکر بس گئے تھے۔

تیرھویں اور چودھویں صدی میں دھاتی کام نے ایران میں نئی ڈھنگ اختیار کیا جو موصل کے دبستان نے اختیار کیا تھا۔ موصل کے دبستان سے ایرانی کام کا گہرا ربط تھا۔ لیکن ایران میں یہ کام جیسے جیسے ترقی کرتا گیا برتنوں کی شکل و صورت میں نفاست کا عنصر بڑھتا گیا اور ان کی تزئین میں بھی اصلاحیں کی گئیں۔ سولھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جب صفوی خاندان برسر اقتدار آیا تو ایران کے قومی آرٹ کو پھر ایک حیاتِ تازہ ملی اس وقت تک یہ تبدیلیاں ایک نئی طرز کی حیثیتِ ارتقار پا چکی تھیں۔ اس طرز میں عام طور پر مرصع کاری خطوط کے نقشوں یا کتبوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ یہ مرصع کاری ایسی زمینوں میں کی جاتی تھی جن میں بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ بیل بوٹوں کے نمونے بنائے جاتے تھے۔ اس طرز کا ایک نمونہ بادے کے اوپر کا ایک ڈھکن ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اس پر محمود الکردی کے دستخط ہیں۔ یہ مشہور ایرانی استاد تھا اور سولھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں وینیس میں کام کرتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں مسلمان صنّاع سونے اور چاندی میں جس طرح کی مرصع کاری سے کام لے رہے تھے، وہ ایک حد تک یورپ کے ہم عصر صناعوں کی دھاتی میناکاری کا جواب تھا۔ یورپ کے ان صناعوں کی یہ میناکاری یورپی اصطلاح میں "منبت کاری" (Champleve enamel) کہلاتی ہے مختلف اشیار پر رنگین شیشوں کے مسالے سے منبت کار نقشے بناتے تھے۔ ادھر مسلمان ایسے ہی طریقے سے عام طور پر ہیرے جواہرات سے ان اشیار کو مزین کرتے تھے۔ دھات پر میناکاری یقیناً مشرق میں مروج تھی لیکن اس کے قطعی اسلامی نمونے کم یاب ہیں۔ مقریزی نے فاطمی خزانوں کی جو فہرست دی ہے ان میں مختلف رنگوں کی میناکاری سے مزین منقش طلائی لوحوں کا ذکر ملتا ہے۔ قسطاط کے ویرانے میں ایک دھاتی ٹکیا ملی ہے۔ اس ٹکیا پر پتے کے نقش و نگار بنائے گئے ہیں اور اس پر میناکاری کے اس

طریقے سے جس میں مختلف رنگوں کو ایک تپلی لکیر سے جدا رکھتے ہیں، ایک کتبہ بنایا گیا ہے۔ یہ ٹکیا اب قاہرہ کے "دار آثار العربیہ" میں رکھی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی مینا کاری کا سب سے اہم معلومہ نمونہ تانبے کا ایک پیالا ہے جو انس برک (Insbruck) کے فردی نندم عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اس پیالے کو منبت کاری سے مزین کیا گیا ہے اس کے وسطی حلقہ میں سکندر کے صعود کی تصویر بنائی گئی ہے۔ اس کے اطراف حلقے ہیں جن کے اندر دیومالا کے درندوں کی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ یہ حلقے ایسی زمین پر بنائے گئے ہیں جس کو کھجور کے پیڑوں اور استادہ شکلوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس پیالے کی طرز بازنطینی ہے لیکن اس پر جو کتبہ درج ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ عراق کے خاندان ارتقیہ کے ایک حکمراں کے لئے بنایا گیا تھا جس نے بارہویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے۔

مینا کاری کے جو چند ایک نمونے ہم تک پہنچے ہیں ان سے اندازہ لگایئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان صناعوں کو مینا کاری کا کام زیادہ نہیں بھایا۔ پندرھویں صدی میں کہیں جاکر اسپین میں تلواروں سے متعلق سامان پر بھاری مینا کاری سے یہ فن پھر اسلامی ملکوں میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ مثالیں، ہندوستان میں مغل شہنشاہوں کے لئے تیار کی ہوئی ابعد کی میناکار چیزوں کی طرح روایتی ارتقا سے زیادہ غالباً بیرونی اثرات کے پرتو کی شاہد ہیں۔

دوسری قسم کی مینا کاری یعنی مٹی کے برتنوں پر رنگین روغن چڑھانے میں مسلمان ابتدائی زمانے ہی سے استادانہ مہارت کا ثبوت دیتے آرہے تھے۔ اسلامی دورِ حکومت میں مصر اور مشرق ادنیٰ کے کوزہ گروں نے اس فنی عمل اور ان تزئینی تدبیروں کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ انھیں ترقی بھی دی جو کم بیش نیم مردہ حالت میں قدیم الایام سے اس وقت تک باقی چلی آرہی تھیں۔ سبزی مائل نیلے رنگ کی روغنی سطح والے خوبصورت دیواری ٹائیل مصر میں بہت ابتدائی زمانے ہی سے ملتے ہیں اور مختلف رنگوں میں ایسا ہی کام بڑے دل پذیر انداز میں ایرانی شہنشاہ داریوش کے محل واقع شوسا میں استعمال کیا گیا تھا جو ۵۰۰ ق۔ م کے قریب تیار ہوا تھا۔ عربوں کے حملے تک یہ فن ان علاقوں میں کس مپرسی کی حالت میں موجود تھا۔ اسلامی اثر کے تحت یہاں کے کوزہ گروں نے نئے فنی عمل

اور تزئینی نمونوں کے ساتھ پھر سے تجربے شروع کئے۔

مسلمانوں کی کوزہ گری کی ابتدائی تاریخ ابھی تک لکھی نہیں گئی ہے۔ اور اگرچہ اس کے بہت سے دلچسپ نمونے حالیہ سالوں میں دریافت ہوئے ہیں، پھر بھی ان کا مقام پیدائش اور ان کا شجرہ سب بڑی حد تک قیاسی باتیں ہیں۔ یہ واضح ہے کہ ایران، عراق، شام اور مصر میں واقع بہت سے مراکز سے نکل کر اس کی بہت سی قسمیں تیزی کے ساتھ پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئیں۔ لیکن قطعی طور پر یہ متعین کرنا ناممکن ہے کہ کس مخصوص قسم کے برتن کی ابتدا کہاں سے ہوئی مقبولِ علم قسم کے ظروف اتنے دور دور تک پھیل گئے تھے کہ وضع قطع اور بناوٹ میں یکساں قسم کے ظروف بہت سے ایسے قدیم مقامات پر ملے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہیں۔ یہاں یہ دکھانے کے لئے کہ ابتدائی اسلامی کوزہ گری کس قسم کی تھی، ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔

سُوسا میں روغنی مٹی کی ایک رکابی ملی ہے۔ اس پر سفید زمین دے کر کوبالٹ[1] سے گہرے نیلے رنگ سے خشخاش کے بوٹے کا نقش بنایا گیا ہے۔ خیال ہے یہ رکابی نویں صدی عیسوی میں بنی ہے ایسے ہی نمونے سامرا میں واقع ایک قصر کے محلِ وقوع سے کھود کر نکالے گئے ہیں۔ یہ قصر خلیفہ ہارون الرشید کے ایک بیٹے نے ۸۳۶ء میں بنوایا تھا اور پچاس سال کے بعد اس میں رہائش ترک کر دی گئی تھی۔ یہ رکابی نیلے اور سفید رنگ کے اس آرائشی نقشے کی اولین مثال ہے جس سے مغربی کوزہ گری کا فن اب بہت آشنا ہے۔ یہ طرز بعد میں چین کے ذریعہ موجودہ یورپ میں درآمد ہوئی ہے۔ نویں صدی ہی میں عباسی حکمران چین کے بنے ہوئے ظروفِ گلی اپنے ملک میں درآمد کر رہے تھے۔ چین کے تہانگ خاندان کے تحت جس قسم کے مٹی اور چینی کے ظروف بنائے گئے تھے وہ سامرا میں بھی دریافت ہوائے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ایسے برتن بھی ملے ہیں جو چین کے بنے ہوئے ظروفِ گلی کی واضح طور پر مقامی نقل ہیں۔ اس رکابی پر حقیقت سے قریب جس قسم کا نقش بنایا گیا ہے، اس کا تعلق بیرونی روایت سے ہے۔ لیکن خوبصورت نیلا رنگ جس طرح استعمال ہوا ہے وہ بہت دل کش ہے یہ رنگ آخر کار چین پہنچ گیا جہاں

---

[1] کوبالٹ، نکل سے مشابہ ایک قسم کی دھات ہے جس سے سوسنی رنگ نکلتا ہے۔ (مترجم)

اسے "اسلامی نیلا" رنگ کہا جاتا تھا۔ نیلے اور سفید برتن بنانے کے لئے چینی اسے اتنا ناگزیر سمجھنے لگے کہ اگر بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر کبھی کبھار اس کی درآمد رک جاتی تو ان برتنوں کا بننا بھی عارضی طور پر رک جاتا تھا۔ اس طرح اگرچہ عام طور پر مغرب "چینی کے نیلے اور سفید" ظروف کو مشرق بعید سے وابستہ کرنے کا عادی ہے، لیکن خود وہاں مخصوص نیلے رنگ کو مسلمانوں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ مسلمان کوزہ گروں نے اس رنگ کو پندرھویں اور سولھویں صدی میں ایشیائے کوچک کے مقام کوتاہیہ میں تیار ہونے والے بعض برتنوں پر بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

مسلمان کوزہ گروں نے ترقی پسند تصورات کو شوق سے قبول کرنے کے ساتھ ساتھ زبردست بداعت کو بھی برقرار رکھا۔ باہر سے حاصل کئے ہوئے تصورات کو انھوں نے ایک نمایاں روایت کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھال دیا کہ بہت سی دلچسپ مثالیں اس کی واضح طور پر شہادت دے رہی ہیں۔ مٹی کے مرتبان کا ایک ڈھکن، جس کو کندہ کاری اور رنگ کاری سے مزین کیا گیا ہے، اور گیارہویں صدی کے ایران کا بنا ہوا ہے، اب نیویارک کے میٹری پولیٹن عجائب گھر میں رکھا ہے۔ یہ نام نہاد "گبری" کام کا ایک نمونہ ہے۔ خیال ہے اس طرح کے برتن آتش پرست بنایا کرتے تھے۔ عربوں کے ایران فتح کرنے کے بہت دنوں بعد تک بھی یہ آتش پرست ایران کے بعض علاقوں میں اپنے قدیم دین پر قایم تھے۔ اس ڈھکن پر لگی ہوئی پتلی سی سفید مٹی کو اس کے نچلے جسم کی سُرخ مٹی تک بھدے لیکن پُراثر طریقے پر کھود کر تزئین کاری کی گئی ہے۔ پھر پورے ڈھکن پر ایک شفّاف روغن کا لیپ دیا گیا ہے۔ اس شفاف روغن کو زرد، سبز، گلابی یا عُنابی رنگ دیا گیا ہے۔ بعض صورتوں میں ان رنگوں کے بے ترتیب ٹیکے اور دھبے اس طرح دئے گئے ہیں کہ ایک ہم عصر چینی طرز کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ساسانی دور کے نقوش جیسے شکاری سوار، دیومالا کے حیوانوں اور برگ دار مخصوص تزئین کاری کے رواج کی وجہ سے "گبری" ظروف گلی کو اسلامی عہد کے ابتدائی کا کام قرار دیا گیا تھا لیکن اس کام کے ایسے نمونے بھی ملے ہیں جن پر گیارھویں اور بارھویں صدی کے کوفی رسم خط میں تحریریں موجود ہیں۔ اس لئے اب اس کام کے بڑے حصّے کو اسی عہد کا قرار دیا جاتا ہے۔ استرکاری پر کھدائی

کا کام جس میں اَنڈا کی رنگ برنگی سطح نظر آتی ہے (Grefito work) کہلاتا ہے۔ چین میں اس طرح کی تزئین کاری کا عام رواج تھا۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کام کی ابتدا وہیں ہوئی ہو کیوں کہ اس طرح کا کام قبلِ اسلام مصر میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ پندرھویں صدی میں اس عمل کو اطالوی کوزہ گر بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے تھے۔ اطالیہ کے ان کوزہ گروں نے یہ کاری گری اسلامی ذرائع سے حاصل کی تھی جہاں سے انھوں نے اور بہت سا پختہ فنی علم حاصل کیا تھا جو نشاۃ ثانیہ کے دوران میں فنِ کوزہ گری کی تجدید میں ان کے بہت کام آیا۔

ایسے ظروفِ گلی جن کو اصطلاح میں "چمک دار ظروف گلی" (Lustred Pottery) کہا جاتا ہے، ان کے بنانے میں مسلمانوں کو غیر معمولی مہارت حاصل ہوئی ہے۔ اس میں چمک دار سطح پر نقوش ایک دھاتی نمک سے بنائے جاتے ہیں اور دھوئیں میں پکا کر ان نقوش کو اس طرح پکا کر لیا جاتا ہے کہ اس میں ایک طرح کی دھاتی چمک آ جاتی ہے۔ یہ دھاتی چمک مختلف نمونوں میں مختلف ہے لیکن تانبے جیسی سرخ، کہیں سبزی مائل زرد اور بعض صورتوں میں قوس قزح کے رنگ برنگی شوخ رنگوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح کے برتنوں کے بعض نمونے جو دسویں صدی کے قریب بنے ہیں، مشرق قریب، شمالی آفریقہ، اور اسپین میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان کے دور دور تک پھیلے ہوئے رواج سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورے اسلامی ممالک میں ان کی کتنی زیادہ قدر ہوتی تھی۔ لیکن ان ظروف کی ابتدا کہاں سے ہوئی، یہ مسئلہ مشتبہ ہی رہتا ہے۔ آیا یہ ظروف گلی پہلی بار مصر میں بنے یا ایران میں، ہنوز ایک نزاعی مسئلہ ہے جس کے بارے میں ماہروں میں شدید اختلاف ہے۔ فسطاط کے ویرانے میں ایک بڑا ظرف ملا ہے جو لاورے (فرانس) کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ خیال ہے یہ ظرف گیارھویں صدی کے قریب فاطمینِ مصر کے عہد میں بنا ہے۔ اسی عجائب گھر میں روغنی مٹی کی ایک اور رکابی محفوظ ہے جس پر ایک شگفتہ رو، بُراق کی شکل، بیلیں اور خط کوفی میں طغرے بنے ہوئے ہیں یہ رکابی ایران کے قدیم شہر رے کے مقام پر ملی ہے جسے ۱۲۲۰ء میں مغلوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

شہر رے صنعت کوزہ گری کا ایک بہت بڑا مرکز تھا جہاں متعدد مخصوص قسم کی طرزیں ایجاد

ہوئی ہیں۔ اس کے کھنڈر کوزہ گری کے خوبصورت نمونوں کا معدن ہیں۔ اس شہر سے بعض خاص قسم گل دان اور رکابیاں وابستہ ہیں جن پر مختلف غیر شفاف رنگوں میں جیسے نیلے، سبز، عنابی، اور گلابی رنگوں نے رنگ کاری کی گئی ہے اور کہیں کہیں سفید یا ہلکی رنگی ہوئی زمین پر سونے کا ورق بھی لگایا گیا ہے۔ ان برتنوں پر مختلف رنگوں میں صورتیں بنائی گئی ہیں اور رسمی تزئین کاری کی گئی ہے۔ یہ صورتیں اور تزئین کاری اپنی نازک صناعی کے لحاظ سے یادگار ہیں۔ یہ تزئین کاری، ہم عصر مخطوطوں کی مصوری سے بہت مشابہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کوزہ گروں نے ایسی شکلوں کا خیال وہیں سے لیا ہے۔ روغنی مٹی کا ایک پیالہ جو شہر رے میں تیرہویں صدی کے قریب بنا ہے، آب لاؤرے کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اس پیالے پر خوبصورت حلقے بنائے گئے ہیں اور ان حلقوں کو ابوالہول اور نشستہ مغنیوں کی شکلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ لاطینی حرف S جیسی منحنی لکیروں کو سیدھا اور الٹا جوڑ کر یہ حلقے بنائے گئے ہیں یہ ان برتنوں کی ایک اچھی مثال ہے جو عام طور پر "چھوٹے پیمانے کے برتن" (Minature ware) کہلاتے ہیں۔ مغلوں نے تیرہویں صدی میں جب اس شہر کو زیر کیا ہے اس وقت یہاں یہ صنعت اپنے پورے شباب پر تھی۔

"وکٹوریا اور البرٹ عجائب گھر، لندن میں دوائیں رکھنے کا ایک مرتبان محفوظ ہے۔ مٹی کے اس مرتبان کو فیروزی، گہرے نیلے اور سیاہ رنگوں سے رنگا گیا ہے۔ یہ مرتبان اس قسم کے ظروف کا نمائندہ ہے جو تیرہویں اور چودھویں صدی کے دوران میں ایران کے شہر سلطان آباد میں بن رہے تھے۔ اہل اطالیہ اس وضع کے مرتبانوں کو (Albarello) کہتے تھے۔ انھوں نے غالباً یہ اصطلاح عربی لفظ "البرنیہ" سے لی تھی جس کے معنی دوا کے مرتبان کے ہیں۔ اس برتن کا نام ہی بتا رہا ہے کہ مشرق میں یہ کس کام آتا تھا اور اطالیہ میں بھی ان سے یہی کام لیا جاتا رہا۔ پندرہویں صدی میں اطالیہ کے عطاروں کی دکانوں میں ایسے مرتبان بہت دکھائی دیتے تھے جو مشرق سے درآمد کی دواؤں اور محفوظ رکھنے والی چیزوں سے بھرے رہتے تھے۔ اس تجارت نے مغرب میں دوا رکھنے کے طاوی مرتبانوں کے دلیں نمونوں کو اسی طرح متنقل کیا جیسے آج بھی ہم تک ادرک رکھنے کے چینی مرتبان پہنچتے ہیں۔ وکٹوریا اور البرٹ عجائب گھر میں دوائیں

رکھنے کا ایک مرتبان محفوظ ہے جو مشرقی طرز پر اطالوی ایراد کا ایک نمونہ ہے۔ مٹی کے اس زرد رنگ کے برتن پر گہرے نیلے رنگ سے گل کاری کی گئی ہے۔ یہ برتن پندرھویں صدی کے وسط میں بمقام فائنزا (Faenza) بنا ہے۔

چمک دار روغن سے مرصع دواؤں کے برتن اہل اطالیہ، بلنسیہ سے حاصل کرتے تھے جو مغرب میں اس طرح کے ظروف کا اسلامی مرکز تھا۔ اس قسم کے بعض نفیس ترین برتن اسی مقام پر بنے تھے اور بعض اوقات یہ بیرونی گاہکوں کی فرمائش پر بنے تھے اور ان گاہکوں کے خاندانی نشان ان برتنوں پر بنائے جاتے تھے۔ وکٹوریا اور البرٹ عجائب گھر میں ایک رکابی محفوظ ہے جسے زرد اور نیلے چمک دار روغن سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ رکابی فلارنس کے خاندان دگلی اگلی (Degli Agli) کے ایک فرد کے لئے پندرھویں صدی کے آخر میں بمقام بلنسیہ بنائی گئی تھی اس رکابی پر اس شخص کے خاندان کا مارکہ بنا ہوا ہے۔ اندلس کے بنے ہوئے چمک دار روغنی ظروف کی نقالی میں اہل اطالیہ ایسے کامیاب ہوئے کہ سولھویں صدی میں مقامی کوزہ گروں نے نشاۃِ ثانیہ کے مخصوص نقشوں کو چمکانا سیکھ لیا۔ اور انھیں کچھ ایسے ڈھنگ سے کبھی نہ مدھم ہونے والی آب وتاب دینے لگے جو پچھلی روایت سے قطعاً الگ تھی۔ اطالیہ کا شہر گبیو (Gubbio) اس صنعت کا بہت مشہور مرکز تھا۔ یہاں اس فن کا زبردست استاد جارجیو اندیولی (Andreoli Giorgio) کام کرتا تھا اس نے برتنوں پر جو سنہرا اور سرخ رنگ دیا ہے اس کی نظیر اطالیہ اور مشرق میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

سولھویں صدی کی ابتداء میں کوزہ گری کی صنعت کا نظام ہر جگہ بدل رہا تھا اس کے اظہار کی شکلوں میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی دو طرزیں جو ایشیائے کوچک اور شام میں بتدریج جنم لے رہی تھیں بڑی آب وتاب کے ساتھ پروان چڑھنے لگیں، ان طرزوں میں ہوتا یہ ہے کہ مٹی کا برتن بنا کر اس پر سفیدے کی تہ چڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس پر شفاف روغن سے نقش ونگار بنائے جاتے ہیں ان کے خاکے سیاہ ہوتے ہیں اور گل بوٹوں کا رنگ گہرا سبز، نیلا اور گہرا گلابی ہوتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے کارخانوں نے ان رنگوں میں ٹماٹے جیسا گہرا روشن سرخ رنگ بھی بڑھایا تھا۔ ان برتنوں کی غالب

دلچسپ ترین ارتقائی صورت یہ تھی کہ انھیں دیواری ٹائیلوں کی طرح استعمال کیا جانے لگا۔ انھیں مربع ٹکڑوں کی صورت میں گھڑا جاتا تھا اور ان پر ایک بڑے نقش کے مختلف اجزا اتارے جاتے یا الگ الگ ٹکڑوں پر بڑے بڑے متناسب گل بوٹے بنائے جاتے جو اپنی جگہ مکمل ہوتے تھے۔ قسطنطنیہ، بروسا اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے بڑے شہروں میں ایسی بہت سی عمارتیں ہیں جن کی دیواریں اس دلکش تزئین سے جگمگا رہی ہیں۔

تزئینی فنون کے عجائب گھر، پیرس (Musee des Arts Decoratifs) میں اس قسم کی دیواری ٹائیلوں کے بہت سے نمونے محفوظ ہیں۔ ان نمونوں میں سے یہاں ہم تکراری بیل بوٹوں کے نقوش والے ٹائیلوں کے تین نمونوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک نمونے میں ٹائیل بنانے والے نے ہر ٹائیل کے وسط میں ایک نوک دار بیضوی نقش بنایا ہے، اور اسی شکل کا ایک چوتھائی حصہ ٹائیل کے چاروں گوشوں پر بنایا ہے۔ جب اس طرح کے کئی ٹائیل ایک جگہ جمائے جاتے ہیں تو یہ سب مل کر مزین کی ہوئی جگہ پر اوپر سے لے کر نیچے تک ایک دوسرے کے مقابلے میں لہراتی ہوئی پٹیوں کا سا اثر پیدا کرتے ہیں۔ اس ڈزائین کا مقابلہ ایک اور ڈزائین سے کیجئے جو بالکلیہ تجریدی وضع کا ہے۔ اس کے اندر ایک دوسرے کے متوازی بیلیں بنائی گئی ہیں جن میں باری باری ایک پر تاک کے پتے اور انگور کے خوشے اور دوسری پر بادام کے پھول بنائے گئے ہیں۔ ایک اور ٹائیل میں یہ دونوں نمونے جن میں سے ایک رسمی اور ایک قدرتی ہے، آپس میں ملا دئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شوکت ابہو دکی نازک پتیوں کا جالا اور بیچ بیچ میں اس کے پھول بھی اس ڈزائین میں بڑھائے گئے ہیں۔ سیدھی سادی شکلوں کی بظاہر ایک دوسرے سے بے میل تفصیلات کو لے کر ان کے مرکب ڈزائین تیار کرنا اس دبستان کی خصوصیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فن کار تزئینی تصورات کا کس باقاعدگی کے ساتھ تجزیہ کر رہے تھے۔ اسی عجائب گھر میں ایک اور نمونہ ہے۔ یہ کئی ٹائیلوں کا ایک تختہ ہے۔ ان ٹائیلوں پر جو گل کاری کی گئی ہے وہ سب مل کر ایک بڑا آرائشی نقشہ بناتے ہیں۔ خوبصورت ٹائیلوں کا یہ تختہ دوسری طرز کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ دمشق کے کام کا ایک نفیس نمونہ ہے اور اس پر ہلکے نیلے، سبز

اور گلابی رنگوں سے نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ اس طرح کی رنگ کاری شامی کام کو ترکی کام سے ممیّز کرتی ہے ــــ

ترکی اور شامی کوزہ گر اپنے ٹائیلوں میں ایک ہی طرح کی تکنیک سے کام لیتے تھے اور خوبصورت رکابیوں، پیالوں، گل دانوں اور مختلف قسم کے برتنوں کی تزئین بھی ایک ہی طرح سے کرتے تھے۔ برٹش میوزیم میں سولھویں صدی کے ایشیائے کوچک کی بنی ہوئی ایک خوبصورت صراحی محفوظ ہے اس صراحی پر سرخی مائل سبز زمین دے کر سفید رنگ میں ابوالہول اور پرندوں اور درندوں کا ایک عجیب مجموعہ بنایا گیا ہے۔ یہ قدیم طرز کی ایک یادگار مثال ہے جس میں قدیم عناصر کی جھلک نظر آتی ہے۔ سُرخ رنگ کی جھلک جس نے رنگ کی ترکیب میں جان ڈال دی ہے، اس کے ترکی نژاد ہونے کی چغلی کھا رہی ہے۔ ایشیائے کوچک کی بنی ہوئی چیزوں پر سرخ رنگ ہمیشہ نہیں ملتا، لیکن شامی کام میں یہ رنگ سرے سے ملتا ہی نہیں۔

اس قسم کے ظروف اور ٹائیلوں میں جو تزئینی عناصر استعمال کئے گئے ہیں ان میں بے شبہ سب سے زیادہ متاثر کن عناصر میں گل کار نقشہ ہے۔ ایسا ہی نقشہ دمشق کے بنے ہوئے مذکورۂ بالا تختے پر بنا ہوا ہے۔ اس تختے پر دو بڑے بڑے خوبصورت گل دانوں سے ربل پیل کر نکلتی ہوئی بکثرت بیلوں پر لالہ، گلاب، سنبل، سوسن، اور بادام کے پھول دکھائے گئے ہیں۔ پھولوں کا نقش ہمیشہ بڑی مہارت اور چابک دستی سے بنایا گیا ہے اور ایسے تزئینی ذوق کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ ان کا قدرتی پن صرف ایک عکسی نقش ہی بن کر نہیں رہ گیا ہے۔ ایران سے ان نقاشوں نے گل کاری کا مسالہ حاصل کیا اور انھیں اتنے حسین وجمیل انداز میں پیش کر کا بھی اسی ملک سے سیکھا آکسفورڈ کے آشمولین عجائب گھر (Ashmolean Museum) میں سولھویں صدی کا بنا ہوا روغنی مٹی کا ایک جگ (قرابہ) محفوظ ہے۔ یہ قرابہ دمشق کا بنا ہوا ہے اور ایرانی نمونوں سے متاثر ہے۔ اس پر نیلس نما حلقوں کی نیلی زمین دے کر لالہ اور گلاب کے پھولوں سے تزئین کاری کی گئی ہے۔ اپنی نازک نقاشی اور روشن رنگوں کے لحاظ سے یہ قرابہ اپنی آپ نظیر اور ایک شاہکار ہے۔

بڑی حد تک ترکی اور شامی واسطوں سے ایران ہی سے مغربی آرٹ نے وہ پھول حاصل کئے جواب عام طور پر ہمارے باغوں میں اگائے جاتے ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں یورپ ان پھولوں سے اسلامی مشرق سے درآمد کردہ ظروف اور چینی برتنوں پر بنی ہوئی ان کی تصویروں کے ذریعہ ہی سے روشناس تھا۔ بس بک (Busbecq) نے جو قسطنطنیہ میں شہنشاہ کا سفیر تھا، سولھویں صدی کے وسط میں گل لالہ کو پہلی بار یورپ میں درآمد کیا تھا۔

شام میں قدیم الایام سے زجاج سازی کا کام ہوتا چلا آتا تھا۔ یہاں مسلمانوں نے شیشے پر تزئین کاری کی ایک خاص طرز کو ترقی دی۔ اس طرح کا تزئینی کام مختلف قرابوں، صراحیوں، گلدانوں اور دوسری چیزوں پر منقش دکھائی دیتا ہے اس طرح کی تزئین میں رنگین مینا کاری میں عام طور پر سونے کی جلا دے کر مختلف شکلیں اور گل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ بعض نمونے جو اس طرح مزین کئے ہوئے ملتے ہیں، ایرانی اور شامی ظروف گلی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ بعض فنی اسباب کی بنا پر خیال ہے یہ نمونے اس کام کے سب سے قدیم نمونے ہیں۔ غالباً یہ کام ان عراقی صناعوں کا ہے جو مغلوں کے پہلے حملے میں عراق سے بھاگ کر شام میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ یہاں انھوں نے اپنے کارخانے قائم کر لئے تھے جو چودھویں صدی عیسوی تک کافی عروج پاتے رہے۔ لیکن جب تیمور لنگ نے ۱۴۰۱ء میں شام کو زیر کر لیا تو یہ بھی نیست و نابود ہو گئے۔

برٹش میوزیم میں شام کا بنا ہوا تیرھویں صدی کا ایک بلوریں پیالا محفوظ ہے۔ اس پیالے پر افقاً کتبات کی منقش دو پٹیاں بنی ہوئی ہیں اور ان پٹیوں کے درمیان کسی رئیس کو تخت پر جلوہ افروز دکھایا گیا ہے۔ تخت کے دونوں طرف دو ملازمانِ شاہی کھڑے ہیں۔ یہ تیرھویں صدی کے آخر کی طرزِ نقاشی کا مخصوص نمونہ ہے۔ یہ نقاشی جگمگاتی سرخ و سفید مینا کاری اور ملمع کاری میں پیش کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیالا بننے کے فوراً بعد ہی یورپ آ گیا ہوگا کیوں کہ اسے ایک بیش قیمت شے مان کر ایک نازک سی چاندی کی ڈنڈی اور چاندی کی چوڑی سی نشست دے کر ساغر بنا لیا گیا ہے۔ چاندی کی اس نشست اور ڈنڈی پر چودھویں صدی کی مروجہ گل کاری کی گئی ہے۔ ہم عصر

دستاویزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شام کے بنے ہوئے شیشے کے ظروف کی نصرانی دنیا میں بڑی قدر و قیمت تھی۔ فرانس کے بادشاہ چارلس پنجم کے خزانوں کی جو فہرست ۱۳۷۹ء میں مرتب کی گئی تھی اس میں شام کے بنے ہوئے دو ظروف کی بڑی وضاحت سے درج کئے ہوئے داخلے ملتے ہیں۔ ان کے بارے میں فہرست میں لکھا ہے: "شیشے کا گل دان جو دمشقی طرز کی شکلوں سے مزین ہے" اور "شیشے کا جوڑا طشت جس پر دمشقی طرز کے نقش بنے ہوئے ہیں"۔ برٹش میوزیم میں ایک اور شامی پیالا ہے جو یقیناً کسی نصرانی کے لئے خاص طور پر بنایا گیا ہوگا کیوں کہ اس کے اوپر بی بی مریم، حضرت عیسیٰ، قدس پیٹرس، قدس پال کی شکلیں اور ایک لاطینی کتبہ ملتا ہے۔ وینیس کے زجاج کار تیرھویں صدی سے یورپ بھر میں مشہور تھے جو دھویں صدی میں انھوں نے زجاج کاری کے مشرقی طریقے کی طرف توجہ کی، اور مینا کاری کے فنی عمل میں اتنی مہارت پیدا کرلی کہ جلد ہی اس فن پر مسلمانوں کا اجارہ باقی نہ رہا۔ وینیس سے یہ فن یورپ کے دوسرے مرکزوں میں پھیل گیا اور وہاں اس کی نئی طرزیں وجود میں آنے لگیں۔ خوش رنگ مینا کاری سے مزین شراب رکھنے کی صراحیاں جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں بہت عام تھیں، اصل میں قرون وسطیٰ کی اسلامی صناعی کی بگڑی ہوئی شکلیں تھیں۔

مشرقی ظروف کی یہ نقلیں دلچسپ ضرور ہیں لیکن مشرقی ظروف کی وضع میں جو دل کشی اور ان کی تزئین میں جو بے ساختگی تھی، اس کی یہ نقلیں کبھی بھی حریف نہ بن سکیں لاؤرے کے عجائب گھر میں شام کی بنی ہوئی چودھویں صدی کی ایک لمبی گردن والی مینا کار شیشے کی صراحی محفوظ ہے۔ برٹش میوزیم میں شام کا بنا ہوا اسی عہد کا ایک بہت ہی نازک اور خوبصورت ڈھکن والا کاسہ رکھا ہے۔ یہ ظروف مسلمانوں کے دسترخوان کے نمائندہ ظروف زجاج ہیں۔ برٹش میوزیم والی صراحی پر مینا کاری میں حلقے، کتبے اور بل کھاتے پتے افقی طور پر پٹیوں کی صورت میں بنائے گئے ہیں۔ اس صراحی پر ۱۳۴۱ء میں مملوک سلطان مصر الکامل سیف الدین شعبان سے متوسل ایک امیر کا نام ملتا ہے۔ کاسے پر بھی اسی طرح کے نقش و نگار سبز، نیلے، سُرخ اور سفید مینا کاری میں بنائے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان پر ملمع بھی کیا گیا ہے۔ عام طور پر اس شکل کے برتن نہیں ملتے۔ اس نفیس برتن پر لکھا ہے: عز لمولانا السلطان۔ باقی

قدامہ ابن جعفر الکاتب

(نقد الشعر طبع جدید)

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی لکچرر اسلامی تاریخ مدرسہ عالیہ - کلکتہ)

(۲)

استدراک | بونیبا کر اس مسئلہ سے قطعاً بحث نہیں کرتا کہ کتاب البرہان کے ہر دو نسخوں پر بحیثیت مؤلف کے قدامہ بن جعفر کا نام لکھنے والے نے خواہ غلط ہی لکھا ہو آخر کس بُنیاد پر لکھا اور اس غلطی کا منشا، کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ چھٹی ساتویں صدی کے ادیبوں کے درمیان ضرور کوئی ایسی تالیف قدامہ کی مشہور و مروّج رہی ہے جس کا موضوع نثر نگاری کا تھا۔ اور غالباً اس تالیف سے کتاب البرہان فی وجوہ البیان کی غیر معمولی مماثلت نگاہِ غلط انداز ڈالنے والوں کے لئے گمراہ کن ثابت ہوئی۔ میرا خیال کہ قدامہ کی کتاب نثر نگاری کے خاص موضوع پر تھی قوی بنیادوں پر قایم ہے۔

مقامات حریری کا معروف شارح ابو العباس احمد بن عبد المؤمن الشریشي (م سنہ ۶۱۹ھ) جس کی طرف العبادی، ڈاکٹر طبانہ یا بونیبا کر نے توجہ تک نہیں کی ہے اور ممکن ہے کہ اس بے التفاتی کی وجہ یہ بات ہو کہ الشریشی نے قدامہ کے ذکر میں بہ مشکل چار سطریں لکھی ہیں۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ شریشی کی انھیں چند سطروں سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم یہ اطلاع ہے کہ قدامہ کی ایک کتاب نثر نگاری کے موضوع پر تھی جس کا نام ستر البلاغۃ تھا شریشی کے اصل الفاظ پہلے سُن لیں:

هو ابو الولید بن جعفر[1] کان بلیغاً مجیداً عالماً باسرار صنعة الکتابة ولواذمها

وله کتاب یعرف بستر البلاغة فی الکتابة وترجمة تدل علی متضمنه وله تحقیق فی

---

[1] قدامہ کی یہ کنیت تنہا شریشی نے بتائی ہے اسی طرح ابن تغری بردی تنہا شخص ہے جس نے قدامہ کی کنیت ابو جعفر بتائی ہے (نجوم زاہرہ: ج ۶ / ۲۲۳ لیدن) مشہور کنیت ابو الفرج ہے۔

صنع البدیع بتمیز بہ عن نظرائہ وتدقیق فی کلام العرب یربی فیہ علی الکفائۃ ویحدق فی علوم التعلیم اضوم فیہا شعلۃ ذکائہ فلذلک ساد المثل ببلاغتہ واتفق المتقدم والمتأخر علی فضل براعتہ[1]"

یقین ہے کہ شریشی کتاب سرالبلاغۃ سے ذاتی طور پر واقف اور اس سے غایت درجہ متاثر تھا جب ہی اس نے نام کی صراحت کردی ہے۔ البتہ اس نے نقد الشعر کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کی وجہ میرے خیال میں کتاب نقد الشعر کی غیر معمولی شہرت ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ شریشی جیسے جلیل القدر فاضل سے یہ بدگمانی غالباً جائز نہ ہوگی کہ قدامہ کی سرالبلاغۃ کی اس کو اطلاع ہو اور نقد الشعر سے واقفیت نہ ہو بظاہر اسی بنا پر کہ سرالبلاغۃ اپنی اہمیت کے باوجود اس درجۂ قبول کو نہ پہنچ سکی تھی جو درجہ کہ نقد الشعر کو حاصل ہوا شریشی نے خاص طور پر سرالبلاغۃ کے ذکر پر اکتفا کیا اب غور طلب یہ سوال ہے کہ سرالبلاغۃ جس کی نشاندہی تنہا شریشی کرتا ہے یہ قدامہ کی واقعی مستقل کتاب تھی یا اس نے کتاب الخراج وصناعۃ الکتابۃ کے ابواب متعلقہ فن کتابۃ کو سرالبلاغۃ کا نام دیا ہے؟ یہ متیقن ہے کہ سرالبلاغۃ نام کی کتاب شریشی کی اپنی ایجاد نہیں ہو سکتی بلکہ یہ کتاب شریشی کے دور تک کم از کم فضلاء کے مخصوص طبقہ میں اسی نام سے معروف ومتداول رہی ہوگی۔

شریشی کے بیان کی تائید بڑی حد تک عبدالرحمٰن بن علی الیزدادی کے نوشتہ سے ہوتی ہے۔ جس کا زمانہ شریشی کی بہ نسبت قدامہ کے عہد سے قریب تر ہے۔ عبدالرحمٰن الیزدادی کی شہادت ہے کہ اس نے قدامہ کی ایک مستقل کتاب فنِ نثر نگاری پر دیکھی تھی جس میں قدامہ نے عربی زبان کے نمائندہ انشاپردازوں کے طرزِ نگارش پر نقد وتبصرہ کرتے ہوئے نثر نگاری سے متعلق فنی نکات وبدائع کو مرتب ومدون کیا تھا۔ اور قدامہ کی اسی تالیف کو دیکھ کر عبدالرحمٰن الیزدادی کو داعیہ پیدا ہوا کہ امیر شمس المعالی قابوس بن وشمگیر (م ۴۰۳ھ) کے رسائل ونگارشات کو ترتیب دے کر مقدمہ میں ان فنی نکات کو واضح کرے جن کی طرف قدامہ نے اپنی کتاب میں توجہ نہیں کی تھی۔ الیزدادی قدامہ کی

---

[1] شرح المقامات (ج ۱ ص ۱۲)

کتاب کا نام نہیں بتاتا لیکن رسائل قابوس کے مجموعہ کو کمال البلاغۃ[1] کا نام دیتا ہے۔ کیا یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ جس طرح قدامہ پر استدراک کے شوق میں الیزدادی نے رسائل شمس المعالی کو مدون کیا اور ان نثری محاسن کی نشاندہی کی جن کو قدامہ کی طبع رسا نہ پا سکی تھی اسی طرح اس نے اس مجموعہ کو کمال البلاغۃ کا نام دے کر گویا قدامہ کی مذکورۂ بالا کتاب سر البلاغۃ سے مقابلہ کو بتانا چاہا ہے۔ بہرحال الیزدادی کا مقدمہ ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے:

"قال[2] عبدالرحمن بن علیؒ الیزدادی: ان کنت انظر فیما ألفہ قدامۃ بن جعفر بذکر الکتابۃ وافردہ من فصول مستخرجۃ من انشاء رسائل الکتاب وکلام البلغاء وأبان عنہ من نظوم غریبۃ عربیۃ وذکر انہا فی الحسن والجودۃ غایۃ فوجدت فی رسائل الامیر شمس المعالی قابوس بن وشمکیر کثیراً مما ذکرہ واشار الیہ مما جمع تلک الانواع بافصح واوجز من تلک الالفاظ واکمل فی تلک المعانی مع زیادات فی غرائب النظم وبدائع المعانی لم یکن خطر ببال قدامۃ ان تتسع لمثلہ قدرۃ فصیح بلیغ ویاتی بہا احد من ذوی البراعۃ"

یزدادی کی صراحت سے ثابت ہے کہ جس کتاب کی طرف وہ اشارہ کر رہا ہے وہ اپنے موضوع پر مستقل کتاب تھی۔ الشرتنی کی نشان دادہ کتاب کو میں الیزدادی کے نشان دادہ کتاب سے علیحدہ

---

[1] یہ کتاب ۱۳۴۱ھ میں السلفیہ قاہرہ میں مطبوع ہوئی۔ مقدمہ نگار محب الدین الخطیب کو اعتراف ہے کہ اس کے مرتب عبدالرحمن بن علی الیزدادی کی شناخت نہ ہو سکی (کمال البلاغۃ: صہ ۱۴) راقم الحروف کے علم میں تاریخ طبرستان کا مؤلف ابن اسفندیار منفرد شخص ہے جس کو کمال البلاغہ کے مرتب کے نام سے واقفیت ہے۔ ابن اسفندیار مرتب کا نام ابوالحسن علی بن محمد الیزدادی اور کتاب کا پورا نام قرائن شمس المعالی وکمال البلاغۃ بتاتا ہے۔ اس وقت ابن اسفندیار کی انگریزی تلخیص پیش نظر ہے (مطبوعہ گب میموریل سیریز۔ صہ ۹۲) ابن اسفندیار اس شخص کو کبھی صرف الیزدادی اور کبھی ابوالحسن محمد الیزدادی بھی لکھتا ہے۔ یہ مسئلہ دلچسپ اور تحقیق طلب ہے۔ میں نے قصداً کمال البلاغہ کے مطبوعہ نسخہ کی پیروی کی ہے۔ الیزدادی کی ایک کتاب تاریخ طبرستان کے موضوع پر عقود السحر وقلائد الدرر کے نام سے تھی۔ جس سے ابن اسفندیار کو تاریخ تبرستان کے مرتب کرنے میں مدد ملی تھی۔ [2] کمال البلاغۃ: صہ ۱۶ مطبوعہ ۱۳۴۱ھ۔

دوسرا نسخہ کوپریلو میں زیر شمارہ ۱۴۴۵ ملتا ہے اس کے ساتھ ابن الاثیر کی کتاب المثل السائر کا نسخہ ہے یہ نسخہ قسطنطنیہ میں رجب ۱۰۵۰ھ میں لکھا گیا۔ کاتب عبدالرحمن بن مصطفی، قاضی زادہ ہے۔

تیسرا نسخہ جامعہ ییل (Yale) ولایات متحدہ امریکہ کے کتب خانہ میں، زیر شمارہ ۴۲۶ ملتا ہے یہ نسخہ اواخر محرم ۱۲۴۵ھ میں لکھا گیا۔ الجوائب کے مطبوعہ نسخہ کی اصل کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس کو دوسرے اور تیسرے نسخوں سے زیادہ مطابقت ہے لیکن ان میں سے کسی نسخہ کو اس کی اصل قرار دینا مشکل ہے لہذا اس مطبوعہ نسخہ سے بھی کہیں کہیں مدد لی گئی ہے۔ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین الجوائب نسخہ کی اصل کبریلی کے نسخہ کو قرار دیتے ہیں)[1]۔

دوسرے قلمی نسخے جن سے متنِ کتاب کی تصحیح میں مدد لی گئی ہے ان میں سے المرزبانی کی کتاب الموشح فی مآخذ العلماء علی الشعراء کے منفرد نسخہ (مکتبہ ینی جامع زیر شمارہ ۱۰۱۲) کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ نسخہ ۶۳۳ھ میں عباسی دار الخلافہ بغداد میں لکھا گیا، لکھنے والے کا نام محمد بن علی النقاش ہے اور نسخہ منقول عنہا عبدالسلام بن الحسین البصری (م ۴۰۵ھ) معاصر المرزبانی کا نوشتہ تھا جس نے ۳۶۶ھ میں مؤلف کتاب کے خود نوشت نسخہ سے نقل لی تھی۔ ینی جامع کا نسخہ وزیر ابن العلقمی کے لئے لکھا گیا اس لئے اس کی صحت کا خاص اہتمام بھی ہوا ہوگا۔ اسی نسخہ کی نقل علامہ شنقیطی نے حاصل کر کے مصر سے اس کی اشاعت کی تھی۔ الموشح کے ذریعہ نقد الشعر کی جو عبارتیں محفوظ رہ گئی ہیں وہ قدامہ کے اصل نوشتہ سے قریب تر اور تصحیف و تحریف سے بڑی حد تک پاک سمجھی جا سکتی ہیں۔

طبع جدید کی خامیاں | بونیباکر کی اس عظیم ادبی خدمت کے اعتراف کے ساتھ ان مواقع کی نشان دہی بھی ناگزیر ہے جہاں طباعت غلط ہو گئی یا خود ایڈیٹر سے سہو ہو گیا ہے

(۱) نقد الشعر: ص۱۱ سطر ۱۵ — "ابیات لجہام الاسجعی" — "الاسجعی" بہ سین مہملہ صحیح نہیں "الاشجعی" ہونا چاہیئے۔

---

[1] تمہید (نقد النثر: ص۱۶)

(۲) نقد الشعر : ص۱۲۳ سطر ۸ — "ابیات للمخبل بن عبید الیشکری"۔ صحیح "المخبل" ہے۔

(۳) نقد الشعر : ص۱۰۷ سطر ۴ لیلی الاخیلیہ کا ایک شعر ہے جس کی تخریج میں حوالہ (الخنسار ص۱۰۸) ملتا ہے۔ ایڈیٹر کے پیش نظر انیس الجلساء فی دیوان الخنسار مطبوعہ بیروت ۱۸۹۵ء ہے یہ شعر کتاب الاغانی (ج ۱۰ ص۷۱-۷۲) میں لیلی الاخیلیہ کے طویل قصیدہ میں ملتا ہے جو توبہ بن الحمیر کے مرثیہ میں ہے۔ بعض الفاظ کتاب الاغانی میں قدامہ کی روایت سے مختلف ہیں۔ ایڈیٹر کے سامنے الاغانی موجود ہے لیکن اس موقع پر اس کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

(۴) نقد الشعر : ص۱۰۷ سطر ۵ — "وقال ناهض بن توبة الكلابي" طبعۃ الجوائب میں بھی اسی طرح ہے۔ ایڈیٹر کتاب الاغانی کے حوالہ سے (ج ۱۲ ص۳۳) حاشیہ پر "ناهض بن ثومة" نقل کرتا ہے۔ لیکن اس کی صحت پر گویا اعتماد نہیں رکھتا۔ اسی بنار پر متن کتاب میں "توبة" کو باقی رکھتا ہے صحیح الاغانی کا نسخہ ہے۔ قاموس میں اس شاعر کا نام ملتا ہے (مادہ نہض) زمخشری کی کتاب الجبال والامکنۃ والمیاہ میں ایک شعر درج ہے جس کے بعض نسخوں میں ثومہ کے بجائے "تومہ" لکھا ہے لیکن صحیح "ثومہ" بالثار ہے۔ الجاحظ کی کتاب الحیوان[۱] میں طباعت یا اصل نسخہ کی غلطی سے "ناهض بن بوصة" ملتا ہے عربی اسماء میں توبۃ کا نام معروف ہے لیکن "ناهض بن توبة" کا نام کہیں نہیں ملتا۔ یاقوت کی معجم البلدان[۲] میں کئی اشعار ناہض بن ثومہ کے ملتے ہیں جو میرے نزدیک اسی قصیدہ کے ابیات ہیں جس کا ایک شعر قدامہ نے نقل کیا ہے۔ جاحظ کے یہاں دو شعر ملتے ہیں وہ بھی اسی قصیدہ کے ہیں۔

(۵) نقد الشعر : ص۴۹ سطر ۱۱ - لیلی الاخیلیہ کے مذکورہ قصیدہ کا ایک شعر ہے یہاں بھی صرف (الخنسار ص۱۰۸) کا حوالہ ملتا ہے یہ شعر بھی کتاب الاغانی میں ملتا ہے اور ترتیب میں مذکورہ بالا شعر اس کے بعد ہی ہے،

---

[۱] الحیوان (ج ۷/۳۶ طبعۃ الساسی) [۲] معجم البلدان - ج ۱ ص۱۶۹ - ص۱۶۵ ج ۲/۸۱۶ (طبعۃ وستنفلا)

(۶) نقد الشعر: ص۸۵ سطر ۹ — لیلی الاخیلیہ کے مذکورہ قصیدہ کا ایک اور شعر ہے جس کی تخریج ایڈیٹر نے نہیں کی ہے ترتیب میں گیارہواں شعر ہے اور کتاب الاغانی میں موجود ہے، قصیدہ میں کل ۴۵ اشعار ہیں اور پورا قصیدہ الاغانی کے علاوہ محمد بن المبارک بن محمد بن میمون کی کتاب منتہی الطلب من اشعار العرب میں بھی درج ہے جس کا واحد قلمی نسخہ (لالہ لی استانبول شمارہ ۱۹۴۱) کی نظم ایڈیٹر کے سامنے ہے۔ میں نے اس قصیدہ کو محمد بن المبارک کی کتاب کے حوالہ سے البقاعی کی اسواق الاشواق میں دیکھا ہے۔

(۷) نقد الشعر: ص۹۵ سطر ۴ — زہیر بن ابی سلمیٰ کا مشہور معلقہ کا شعر ہے:

کانّ فتات العهن فی کل منزل نزلن به حبّ الفنا لم یحطّم

بحث کا تعلق لفظ "الفنا" سے ہی ایڈیٹر اس لفظ کو (بالقاف) ترجیح دیتے ہوئے اس کی تائید میں حاشیہ پر لکھتا ہے:

"کذا فی ق و ص والقانون (ص ۳۲۲) والنهایة (ج ۷/ص ۱۳۹ سطر ۱۷) وجمهرة اشعار العرب" ق سے مراد کوپریلی کا نسخہ اور ص سے مراد کتاب الصناعتین للعسکری (مطبوعہ آستانہ ۱۳۲۰ھ) ہے۔ بعض ماخذوں میں یہ لفظ (بالفاء) ملتا ہے ان کی نشاندہی حاشیہ میں کی گئی ہے:

"فی ک و ع و خ و دیوان زهیر: الفنا" —
ک سے اسکوریال کا نسخہ، ع سے کتاب العمدہ ابن رشیق اور خ سے سر الفصاحۃ للخفاجی مراد ہے اس شعر پر کلام کرتے ہوئے قدامہ نے دو بار اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اور دونوں جگہ اسکوریال اور کوپریلی کے نسخوں میں "الفنا" کا لفظ (بالفاء) ملتا ہے۔ چونکہ ایڈیٹر کے نزدیک صحیح لفظ "القنا" (بالقاف) ہے لہٰذا متن میں اس کی اصلاح کر دی اور ف کو ق سے بدل کر حاشیہ پر لکھ دیا ہے:

"تصحیح مقترحہ" پھر اسی لفظ کی بابت الحاقی تعلیقات (Notes + Additions)

میں لکھا ہے : ذالفنا is Perhaps Synonymous with القنا —"

cf. the commentary on this line in the Jamharat Ashaar

شجر له حب احمر فيه نقط سود القنا at Arab, p. 48: The Paris

M.S. of the K. at Sinaatayn (Fol. 148) Reads

الفنا " (Notes. P. 78)

کتاب الصناعتین طبعہ آستانہ کے بارہ میں گذر چکا ہے کہ اس میں لفظ زیر بحث بالقاف ہے۔
اب یہ معلوم ہوا کہ اسی کتاب کا قدیم قلمی نسخہ جو پیرس میں محفوظ ہے اس میں لفظ زیر بحث بالفاء ہے
اسی طرح جمہرۃ اشعار العرب کا نسخہ مطبوعہ سنہ ۱۳۰۸ھ ایڈیٹر کے سامنے ہے جس میں یہ لفظ بالقاف ہے
لیکن راقم کے پیش نظر اسی کتاب کا نسخہ مطبوعہ سنہ ۱۳۴۵ھ ہے اور اس نسخہ میں اصل شعر اور شرح میں
یہ لفظ بالفاء[1] ملتا ہے۔ ایڈیٹر کی نشاندہی کے مطابق نقد الشعر کے قدیم تر نسخہ اسکوریال میں بھی اسی
طرح ہے اس نسخہ کو کوپریلی کے نسخہ پر جو گیارہویں صدی کا ہے ترجیح ہونی چاہیے۔ اور متن کتاب
میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ دونوں نسخے متفق ہو جاتے ہیں۔ الجوائبی مطبوعہ میں بھی لفظ کی یہی شکل ہے
(ص ۴۳)، الخفاجی کی سر الفصاحۃ جو معتمد اور قدیم نسخوں کی بنیاد پر مطبوع ہوئی ہے اس کے علاوہ
دیوان زہیر کی دو شرحیں ایڈیٹر کے پیش نظر ہیں ایک الاعلم الشنتمری کی (مطبوعہ سنہ ۱۸۸۹ء) دوسری
ثعلب کی (مطبوعہ سنہ ۱۳۶۳ھ قاہرہ) اور دونوں میں الفنا (بالفاء) ملتا ہے۔ غرض ایڈیٹر کے
پیش نظر مآخذ ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ اس لفظ کو "بالفاء" ہونا چاہیے۔ مزید اطمینان کے لئے چند
اور حوالجات یہ ہیں کہ زوزنی کی شرح میں ہے " والفنا عنب الثعلب " آگے یہ عبارت ملتی ہے
" کأن قطع الصوف المصبوغ الذی زینت به الهوادج فی کل منزل نزلته هؤلاء
النسوة حب عنب الثعلب فی حال کونه غیر محطم لانه اذا حطم زایله لونه شبه
الصوف الاحمر بحب عنب الثعلب قبل حطمه " (ص ۷۲، ۱۳۴۴ھ) اصمعی کی کتاب

[1] جمہرۃ اشعار العرب ص ۶۹

النبات والشجر میں مذکور ہے — "والفنا وھو عنب الثعلب"۔ (البلغة فی شذور اللغة ص ۱۴۲ سنہ ۱۹۱۴ء) فیروز آبادی باب الواو والیاء کی فصل الفاء میں لکھتا ہے — "والفناة ... و عنب الثعلب ج فنا"۔ اور فصل القاف کی عبارت یہ ہے "والقنا بالکسر و الفتح: الکباسة"۔ ظاہر ہے کہ زہیر کے شعر میں مشبہ بہ سالم عنب الثعلب ہے۔ جس کی خصوصیت خود قدامہ نے ظاہر کردی ہے کہ توڑنے پر اس کا رنگ جاتا رہتا ہے، کھجور کے خوشہ سے تشبیہ دینے کا یہ موقع نہیں ہے قطعی فیصلہ جوہری کی صحاح العربیہ سے ہو جاتا ہے کہ اس نے فصل الفاء میں اس لفظ پر زہیر کا شعر شہادت[1] میں پیش کیا ہے۔ ان تصریحات کے بعد یونیا کر کا یہ کہنا کہ — "الفنا is Perhaps synonymous with القنا" ہرگز کسی اصلیت پر مبنی نہیں۔ اس لئے کہ اس شعر میں لفظ کی صحیح شکل صرف "الفنا" (بالفاء) ہے۔

(۸) نقد الشعر: ص ۱۰۹ سطر ۳ عمرو بن شاس کا شعر:

تذکرت لیلی لات حین اذکارها　　　وقد حنی الاصلاب ضلا بتضلال

اس کی تخریج میں صرف (Lane) کی مرتبہ ڈکشنری (مد القاموس) کا حوالہ ملتا ہے۔ میرے علم میں ابو زید الانصاری کی کتاب النوادر[2] میں عمرو بن شاس کا پورا قطعہ درج ہے جس کا آغاز اسی شعر سے ہوتا ہے۔ قطعہ میں کل سات اشعار ہیں اور قدامہ کے استاذ ابو العباس احمد بن یحیی (ثعلب) کی روایت کے بموجب تین شعر زائد ملتے ہیں اس طرح کل دس ابیات ہوئے۔ ایڈیٹر کے پیش نظر یہ شعر تنہا ہے اس لئے قافیہ کو متحرک سمجھ لیا ہے اگر پورا قطعہ سامنے ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اس کے قوافی "وقد سال" اور "اذا صال" بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی روایت میں وقف کرنا پڑتا ہے۔ ابو زید نے تصریح کر دی ہے کہ — "والشعر مقید"۔

(۹) نقد الشعر: ص ۱۳۷ سطر ۷ خالد بن صفوان کا شعر:

فان صورة راقتك فاخبر فربما　　　امر مذاق العود والعود اخضر

۱؎ صحاح العربیة: ج ۲/ ۵۳۲ (فنی) دیکھو القصائد العشر (شرح ابو زکریا التبریزی) ص ۵۶ کلکتہ ۱۸۹۴ء

۲؎ کتاب النوادر فی اللغة: ص ۱۴۱ تا ص ۱۴۲ سنہ ۱۸۹۴ء

حاشیہ میں لکھا ہوا ہے کہ یہ شعر اسکوریال کے نسخہ میں العتابی کی طرف منسوب ہے العتابی سے مراد بظاہر کلثوم بن عمرو ہی ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس مسئلہ کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ البتہ ایک قلمی مجموعۂ اشعار[1] میں جو بہت زیادہ قدیم نہیں ہے یہی شعر ایک اور شعر کے ساتھ کسی شاعر کی طرف نسبت کے بغیر ملتا ہے :

وما المرء الا الاصغران لسانہ ومعقولہ والجسم خلق مصور

فان ترمنہ ما یروق فانما امر مذاق العود والعود اخضر

ممکن ہے کہ کسی متاخر شاعر نے تضمین کردی ہو۔

(۱۰) نقد الشعر: ص۵۵ سطر۶ — "ومثل قول خالد بن زهیر بن اخی ابی ذؤیب الهذلی"۔ قدامہ کی یہ عبارت تحقیق طلب ہے ابو ذؤیب اور خالد بن زہیر میں اتنا قریبی رشتہ نہ تھا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے[2]۔ "وکان ابو ذؤیب یهوی امرأة من قومه وکان رسوله الیها رجلاً من قومه یقال له خالد بن زهیر"۔ البتہ المرزبانی اس کو "ابن اخت ابی ذؤیب الهذلی[3]" کہتا ہے۔

---

[1] انوار الازہار (خط) ورق ۱۴۸ ب مکتبۂ خدا بخش خاں پٹنہ زیر شمارہ ۱۸۵۲ [2] الشعر والشعراء: ص۲۵۲ مصر ۱۹۳۲ء [3] معجم الشعراء: ص۲۷۱؛ الشواہد الکبری (عینی) ج ۱/۲۹۵ (علی ہامش الخزانہ)

جوگ بشسٹ

از

جناب پروفیسر سید ابوظفر ندوی احمد آباد

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں اپنے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ (متصل بہار شریف) جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے کتب خانہ کی فہرست میں اتفاقاً میری نظر ایک کتاب پر پڑی، جس کا نام "جوگ بشسٹ" تھا، کچھ دنوں سے میں ایسے مواد کی فراہمی میں مصروف ہوں، جن کا تعلق ایسی کتابوں سے ہو جو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہوں، خوش قسمتی سے یہ کتاب جوگ بشسٹ انھیں میں سے ایک ہے۔

یہ کتاب یوگ یعنی ہندو تصوف میں ہے، جس کو سنری والمیک نے سنسکرت میں تصنیف کی۔ شاہزادہ دارا شکوہ نے اس کا ترجمہ فارسی میں کرایا اور زیر تبصرہ نسخہ اسی فارسی کا اردو ترجمہ ہے، جہاں تک مجھے علم ہے ابھی تک زیور طبع سے محروم ہے۔ یہ چھوٹی تقطیع ۷ء انچ اور تین سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور ابتدا سے آخر تک مکمل ہے۔ صرف وسط میں دو تین صفحات غائب ہیں۔

مترجم اردو نے ایک خاتمہ لکھ کر تقریباً ۲۵ صفحوں کا اضافہ کیا ہے اور کاتب نے اس کے بعد ایک تکملہ لکھ کر کتاب کو ختم کیا ہے۔ جو بارہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح کل صفحات ۳۹۸ ہوئے۔

کتاب سیاہی سے خط نستعلیق میں تحریر کی گئی ہے۔ کاغذ خاکی رنگ، پتلا، بہار کا بنا ہوا ہے۔ بہار میں کاغذ بنانے کے مرکز، بہار شریف اور گیا تھے۔ غالباً انھیں دو جگہوں میں سے کسی جگہ کا ہوگا۔ باب اور دوسری چیزیں مثلاً حکایات، کسی کا قول، اشعار وغیرہ ہلکی سرخی سے تحریر ہے، اردو مترجم نے کہیں کہیں نصیحت بھی کی ہے اور کسی جگہ اپنی طرف سے بھی مضامین کا اضافہ کیا ہے، کہیں بزرگوں کے قول سے نتیجہ بھی نکالا ہے۔ ایسے تمام مضامین کی ابتدا میں سرخی سے لفظ "مولف" کا استعمال کیا ہے، حالاں کہ مترجم لکھنا چاہئے تھا۔ زیر تبصرہ نسخہ کی نقل ۱۸۶۷ء میں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی عمر اس وقت اسی برس کی ہوئی اور چونکہ کاغذ بہت ادنیٰ درجہ کا ہے، اس لئے اس کی عمر تمام ہو رہی ہے۔ ذرا بھی ہاتھ ادھر ادھر ہو کہ کاغذ

پر مردنی چھا جاتی ہے۔

اس کتاب کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے (گو وہ میری کم علمی اور کم فہمی کے سبب سے ممکن ہے کہ غلط ہو) کہ اس میں مضامین بہت منتشر ہیں اور ایک ہی بات کو ہر باب میں مکرر بیان کیا گیا ہے اور جو عنوان باب کا لکھا گیا ہے۔ اس کی تشریح بہت کم کی گئی ہے۔ قصص اور غیر معقول باتیں بکثرت ہیں۔ جن کو طبع سلیم قبول کرنے سے ابا کرتی ہے اور کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ لیکن مترجم نے ایک بات آخیر میں لکھی ہے، کہ قصص اور کہانیوں کی طرف توجہ نہ کی جائے، بلکہ ناظرین کو چاہئے کہ اصل مطلب پر نگاہ رکھیں۔ خذ ما صفا، ودع ما کدر، یعنی جو اچھی باتیں ہیں ان کو لے لو، باقی چھوڑ دو، اس طرح واقعی یہ کتاب تزکیہ نفس کے لئے بڑی مفید ثابت ہوگی اور اصل مقصود حاصل ہو جائے گا۔

کتاب کے متعلق لوگوں کے نام اس کتاب میں جن جن لوگوں کے نام آئے ہیں، جن کا اس کتاب سے تعلق ہے، ناظرین کی آسانی کے لئے درج کرتا ہوں۔

(۱) بھرت، راجہ اجودھیا (اودھ) رام چندرجی کے والد (۲) سری رام چندرجی، جن کی پریشانی دور کرنے کے لئے یہ باتیں ان کو بتائی گئیں۔ (۳) بشسٹ، رام چندرجی کا استاد اور راجہ کا وزیر جس کے بیان سے سری رام چندرجی نے سکون حاصل کیا (۴) بسوامتر، ایک بڑا مہا پرش عابد زاہد۔ (۵) والمیک (بالمیک) اس کتاب کا مصنف جس نے بشسٹ اور رام چندرجی کے بیانات کو قلم بند کیا اور رامائن کا مشہور مصنف (۶) دارا شکوہ، شاہجہاں بادشاہ دہلی کا بڑا لڑکا، اورنگ زیب عالمگیر کا بڑا بھائی جس نے اس کتاب کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ (۷) بھاردوج " ایک بڑا رشی جس نے والمیک سے رام چندر کے متعلق سوال کیا اور اس کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی (۸) منشی کنھیا لال آلکھ دھاری، فارسی سے اردو ترجمہ کرنے والا (۹) ہرن گربھ (برہما جی) منشی کنھیا لال مترجم اردو کا مرشد (۱۰) راجہ لال، اس نسخہ کا کتابت کرنے والا (۱۱) بانکی لال دبیر، راجہ لال کا برادر۔

اس کتاب کی کتابت کا سبب اس میں کاتب کی تحریر مختصر طور پر درج کرتا ہوں، جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ اس کتاب کی کتابت کے کیا اسباب ہوئے۔

بندہ راجالال متخلص "کنور" ولد لالہ پرتاپ نرائن، بن لالہ جمن لال، بن لالہ درشن داس۔
قوم کائستھ، ساکن پیری، پرگنہ سہسرام، ضلع شاہ آباد (آرہ)، صوبہ بہار، وارد حال اکبر آباد (آگرہ) عرض
کرتا ہے کہ کتاب الکھ امواج (جوگ بشسٹ) مؤلفہ (مترجمہ) منشی کنھیا لال (الکھ دھاری) کی نقل اور
کتابت کی یہ وجہ ہوئی کہ میری عمر کے ۳۱ سال لہو و لعب میں گذرے۔ اب خیال ہوا کہ کچھ کام عقبیٰ کے لئے
بھی کرنا چاہیئے۔ تلاش مرشد میں مدت گذر گئی، جو ملتا وہ راہ زن اور جس کو پیر و مرشد سمجھتا، وہ شیطان نکلا
اور غلطی سے میں نے اپنے بھائی (برادر حقیقی) بابو بانکی لال دبیر کو بھی اسی رنگ میں رنگ لیا، چند ہی دنوں
کے بعد ہم دونوں الگ ہو گئے اور مجھ کو سب اسٹنٹی محکمہ پرمٹ آگرہ کے مفصلات میں سرکار آگرہ
تبدیل کر دیا، لیکن مرشد کی تلاش یہاں بھی جاری رہی۔ اس طرح ہم دونوں بھائیوں کو گیارہ سال مرشد
کی تلاش جاری رکھنی پڑی۔

پھر میری تبدیلی مقام "ملبورہ" ہوئی۔ جہاں میرا بھائی دبیر تھا۔ دونوں ساتھ رہنے لگے۔ یہاں
ایک مہربان منشی سوہن لال سے ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے رحم کھا کر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ یعنی میری ملاقات
پیر دستگیر، روشن ضمیر، حضرت یقین شاہ نقش بندی سے کرا دی۔ ان کو دیکھتے ہی دل روشن ہو گیا، گو
آمد و رفت رہی مگر وحشت باقی تھی۔ حضرت شاہ نے اس کو محسوس کر کے، حال دریافت کیا۔ میری
سرگذشت سن کر فرمایا کہ "تم پہلے جوگ بشسٹ کا مطالعہ کرو"۔

چناں چہ اس کتاب کی تلاش شروع کر دی اور میرے برادر دبیر کی کوشش سے یہ کتاب
دستیاب ہوئی۔ واقعی مطالعہ کے بعد اس کو بہت مفید پایا، مارچ ۱۸۷۴ء سے اس کی کتابت
شروع کی۔ لیکن بعض اسباب سے نقل میں تاخیر ہوگئی۔ آخر ایک سال بعد ۱۸۷۵ء میں اختتام کو پہنچی۔

مترجم اردو کا مقدمہ | مترجم کتاب نے ابتدا میں جو مقدمہ تحریر کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ "فقیر بے باک
اور بے حجاب ہو کر کہتا ہے کہ الکھ دھاری کے دل میں جو قیام رکھتا ہے وہ الکھ ہے اور "الکھ" وہ
ہے، جس کا تعین کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے، نام و نشان، شکل و صورت، رنگ و مزہ اور اشارہ سے
محسوس نہیں کیا جا سکتا (یعنی وہ بے چون و چگون ہے) پس جو ہر طرح الکھ ہے اس کی طرز خدمت اور

عبارت بھی الکھ ہے۔ جس کو اس کی تحقیقات منظور ہو، پہلے، بیم ورجا کو دل سے نکالے۔ یاد رکھو کہ جو لکھے جاتے ہیں وہ فنا ہونے والے ہیں اور جو موت کی خوراک ہیں وہ سب اس معاملہ میں برابر ہیں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، فقیر ہوں یا امیر۔ جو فقیر کی بات باور نہ کرے گا، وہ فنا ہوگا اور بعد مرگ بھی "بیم ورجا" کے زندان سے باہر نہ ہوگا۔ جو الکھ دھاری کی کہانی کو من (دل) لگا کر سنے گا، وہ الکھ دھارنا (یکسو ہو کر خدا کا دھیان) کرے گا اور جو الکھ دھارے گا، وہ الکھ ہو جائے گا اور محسوسات سے الگ رہے گا اور جب محسوسات اور ملفوظات سے الگ ہو گا تلے (نیچے) کا نقطہ اوپر ہوگا اور پرم انند (انتہائی خوشی بلا دکھ) کو پائے گا اور "امر" ہو جائے گا (جاودانی زندگی حاصل ہوگی) فقیر کی طرز تحریر عجیب وغریب ہے، مگر مدعا اور معنے بنوع قدیم۔

امید وبیم کی بحث ظاہر ہے کہ جب آدمی کو کسی چیز کی تمنا ہوتی ہے۔ اس کے حاصل ہونے کی امید اور محرومی کا خوف رکھتا ہے، وہ لذت اور سرور سے دور رہتا ہے۔ گو کہ وہ بیکنٹھ (جنت) میں جگہ پائے اور جو تمنا کو تیاگتا ہے، وہ دنیا اور عاقبت اور اس کے متعلقات کو ناچیز سمجھتا ہے پس وہ نہ کسی شے کے وصل کی آرزو رکھتا ہے نہ کسی کے غضب سے ڈرتا ہے، جس حالت میں رہتا ہے یکساں رہتا ہے۔ پھر سرور نہ ہو تو کیا ہو (یعنی اس حالت میں جو سرور حاصل ہوتا ہے وہ اس قدر دل کش ہے کہ دوسرے قسم کے سرور کی حقیقت تک پہنچنے والے جانتے ہیں، کہ بہشت کے معنی آزاد ہونے کے ہیں۔ اور بیم ورجا میں مبتلا ہونے کا نام دوزخ ہے، لیکن وہ بہشت جس میں انگور اور ناشپاتی، حور اور شراب وافر ہے۔ خدا جانے کہاں ہے، کہ نقاشان فلکی وارضی نے آج تک اس کو نقشہ میں درج نہیں کیا، باوصف نادانی وجہالت بہت رنگ آمیزی سے ایسی باتیں اپنے دوستوں اور مریدوں کے لئے بنائی ہیں[1] لیکن وہ بہشت جس میں مکمل سرور ہے، وہ گیان ہے اور گیان کے معنی علم کے ہیں۔ اور جملہ علموں میں جو اشرف اور اکبر ہے، وہ برہم گیان ہے۔ جس کو علم الٰہی اور مابعد الطبیعیات کہتے ہیں، برہم گیان کے لئے بے شمار کتابیں ہیں۔ بلکہ کوئی کتاب نہیں، جس میں برہم گیان نہیں، لیکن سمجھنا اور

---

[1] یہ جنت زمین اور آسمان سے ماوراء ہے۔ اس لئے زمین اور آسمان کے جغرافیوں میں اس کا نقشہ نہیں مل سکتا جیسے اندر کی جنت کا جغرافیوں میں کہیں پتہ نہیں۔

مطلب کو پانا بغیر صفائی قلب اور ذکاوتِ ذہن دشوار ہے۔ کیوں کہ کتاب اور معلم سے کسی کو علم نہیں ملتا، اگر ملتا ہے تو وہی گدھے کا علم جن پر کتابیں لاتے ہیں اور معلم پڑھتے ہیں اور عالم و فاضل بنتے ہیں۔ حالاں کہ کسی اخبار سے گدھوں کی فضیلت پائی نہیں جاتی۔ پس ثابت ہے کہ جس کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اپنے ذہن رسا سے ہوتا ہے اور کتاب و معلم صرف ارادہ کے معین ہوتے ہیں۔ ہر ولائت کے باشندوں کی تربیت اور ذہن رسائی اور دل کو روشن کرنے کو قدمائے، ہر ولائت کی زبان میں بہت کچھ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ چنانچہ ہند کے مردم کے لئے متری والمیک سوامی نے جوگ بشسٹ تصنیف کی۔ مگر افسوس کہ وہ کتاب سنسکرت زبان میں ہے اور یہ زبان فی الحال ہند میں رواج سے جاتی رہی۔ ہندوؤں کی ۳۶ قوموں کے مردم میں سے فقط ایک قوم برہمن کے بعض اشخاص پڑھتے ہیں اور جو کوئی پڑھتا ہے، وہ بھی معاش پیدا کرنے کے خیال سے۔ برہم گیان کے لئے کوئی لاکھ میں ایک شخص پڑھتا ہوگا برہم کا گیان ہر متنفس کو چاہئے، مرد ہو یا عورت، امیر ہو کہ غریب، کیوں کہ مکت (نجات) سب کو درکار ہے اور بغیر گیان کے مکت (مکتی) نہیں ہوتی۔ پس لگاتار اس درخت کو سرسبز رکھنے میں جدوجہد کرتا رہے۔ جس کا پھل عام و خاص کو ہے اور دوست و دشمن اس کے ذائقہ سے اپنی زبان کو لذت آشنا کریں۔

ہرچند مقتضائے بشری اس بات کی ہدایت کرتی ہے کہ "کار خود کن کار بیگانہ مکن"۔ لیکن فقیر کے پاس خود اپنا کوئی کام باقی نہیں رہا ہے۔ جس میں لگا رہے۔ اس لئے دل نے کہا کہ سو رہنے سے یہ کام زیادہ بہتر ہے۔ بہ خلاف عوام کے خود اپنے وقت کو ایسے کام میں لگا رکھے جس سے تمام مخلوق کو فائدہ پہنچے اور با ایں ہمہ کہ ہزار میں سے ایک کی بھی اس علم کی طرف توجہ نہیں ہوتی ہے۔ پھر بھی رجحان طبع اسی طرف مائل ہے اور جس سے کہا جاتا ہے کہ میرے مطبع میں ویدانت کی فلاں کتاب چھپی ہے۔ وہ جواب میں کہتا ہے کہ بہار دانش اور لیلیٰ مجنوں بھی تمہارے مطبع میں چھپی ہے؟ اور حاسد طرح طرح کے عیب لگاتے ہیں۔ اگرچہ گذر اوقات کے لئے بہ دشواری سامان میسر آتا ہے، لیکن دل اپنی حرکت سے باز نہیں آتا اور جو مانع ہو اُس کو اس شعر سے جواب دیتا ہے۔ ؎

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا   اسلام چھوڑ کفر کیا پھر کسی کو کیا

مترجم کی دوسری کتابیں | اس فقیر نے اس کتاب سے پہلے ایک کتاب لکھی ہے، اس کا نام "چراغ حقیقت" ہے۔ اس میں ایک ہاتھی اور پانچ اندھوں کا منظوم قصہ ہے۔

(۲) شمع معرفت" اس میں اپنے تجربہ سے قدیر کی قدرت آشکارا کیا ہے۔

(۳) بھاگ بھری" اس میں تہذیب اخلاق، ترکیب (تدبیر) منزل اور سیاست بدنی (مدنی) یعنی حکمت عملی ہے۔

(۴) انوار متناہی" اس میں ہر یک مذہب کی تعریف اور مسائل علم طبی، متعلق حکمت نظری درج ہے۔

(۵) الکھ پرکاش" بچاس آپ نے شبد اور چاروں ویدوں کا خلاصہ یعنی تصوف کے مسائل مثلاً توکل، صبر، قناعت وغیرہ پر جو رسائل لکھے گئے ہیں، ان کو یکجا کر دیا ہے۔ اس کے کل پچاس جز ہیں

(۶) الکھ امواج"، یعنی جوگ بشسٹ کا ترجمہ۔

(۷) خواب وخیال" مصنفہ شری الکھ سوامی کا ترجمہ۔

ناظرین سے گذارش مندرجہ بالا کتابیں جو مترجم کی تحریر کی گئی ہیں، اگر ناظرین کرام کی نظروں سے گذری ہوں تو براہ کرم خاکسار کو ضرور مطلع فرمائیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرح ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور وہ فارسی میں ہیں یا اردو میں مترجم نے تو سب کتابیں اردو ہی میں لکھی ہیں۔ لیکن ممکن ہے، کہ جوگ بشسٹ کی طرح وہ فارسی میں بھی ہوں۔

مترجم کے خاتمہ کی تحریر | ہندو مذہب میں چار وید ہیں، نو شاستر ہیں۔ اٹھارہ سمرتی ہیں، اٹھارہ اوپ سمرتی۔ اٹھارہ پوران اور اٹھارہ اوپ پران ہیں۔ ان سب کی تفصیل الکھ پرکاش کے دیباچہ میں شمار کر دی ہے۔ کل کتابیں بچاسی ہوئیں۔ لیکن اکیاسی کتابوں کی اصل چار وید ہیں۔ جو وید کو جان لے، تو ان کتابوں کا جاننا نہ جاننا برابر ہے۔ لیکن ویدوں کا جاننا بغیر ان کتابوں کے پڑھنے کے ناممکن ہے اور ویدوں کا خلاصہ ویدانت ہیں۔ اس فن پر بہت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر پانچ سو آپ نے کھد (آپ نے شد) بہت معتبر ہیں۔ جن کا ترجمہ الکھ پرکاش ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بھگوت گو منڈل کوشش جلد ۴ صفحہ ۱۳-۵۱۲ میں ہے کہ اُپ نشد کی کل تعداد ڈھائی سو (۲۵۰) ہیں۔ ان میں سے ایک سو آٹھ (۱۰۸) مشہور ہیں۔ جیسے "ایشوپنشد، کے نوپنشد، کٹھوپنشد، نند وغیرہ ان میں سے خاص دس کی شرحیں شری شنکر آچاریہ نے کی ہیں۔"

جس طرح ہمارے یہاں تصوف پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے زیادہ معتبر امام غزالی، مولانا روم، فریدالدین عطار، جامی، معین الدین اجمیری، بختیار کاکی، شیخ فریدالدین شکر گنج، نظام الدین اولیا، مجدد الف ثانی۔ شرف الدین یحییٰ میزی، شاہ ولی اللہ وغیرہ کی ہیں۔ اسی طرح ویدانت کی بھی کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور پھر ان کی شرحیں بھی کی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے معتبر اور قابل وثوق ایک سو آٹھ ہیں۔ اسی طرح اخلاقی کتابیں جیسے اخلاق جلالی، اخلاق ناصری، اخلاق محسنی وغیرہ جو تحریر کی گئی ہیں یہ سب اُپ نشد میں شامل ہیں۔

اُپ نشد کی تعریف وید میں معرفتِ الٰہی کی نسبت جو باتیں لکھی گئی ہیں اور وہ اخلاقی باتیں جن سے تزکیہ نفس ہو سکتا ہے، ان کو علیٰحدہ کر کے جو کتابیں تحریر ہوئیں، اُن کو "اُپ نشد" کہتے ہیں۔ ان کی تقسیم پہلے اس طرح کی گئی ہے کہ رگوید سے جو اُپ نشد بنا، اس کا نام "آئی تری یی" رکھا گیا۔ اسی طرح یجروید، شام وید اور اتھروید سے معرفت کے مضامین الگ الگ کر کے ہر ایک کا نام علاحدہ علاحدہ رکھا گیا۔ ان کو وید کا نچوڑ کہتے ہیں۔ ان کے مضامین مختلف ہیں۔ مثلاً وجودِ عالم کس طرح ہوا اور کس مقصد سے وجود میں آیا۔ موت کے بعد کیا ہوگا، عالم کا قیام کس طرح ہے۔ عالم کس طرح فنا ہوگا۔ تزکیہ نفس کس طرح ہوگا۔ انسان کس طرح نجات پاتا ہے، نجات کا مطلب کیا ہے، پھر اس کے حاصل کرنے کے ذرائع مثلاً توکل، صبر، قناعت، شجاعت، عفت وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

بعض مصنفوں نے ان سب پر مکمل کتابیں لکھی ہیں اور بعض نے ایک ایک پر الگ الگ کتاب تحریر کی ہے، اس طرح ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔

اصولی مضامین اصولی طور پر ان ویدوں میں تین قسم کے مضامین ہیں۔

(۱) گیان یعنی علم۔

(۲) اُپاشنا (یقین یا تصدیق بالقلب)

(۳) کرم کانڈ (اعمالِ صالحہ)

اس کتاب الکبوا مواج میں تینوں قسم کا خلاصہ ہے۔ مترجم نے لکھا ہے کہ جس کی جس پر رغبت ہو، اس پر وہ عمل کرے اور اس کی تشریح اس طرح کی ہے۔ کہ

(۱) اُپاشکوں (عابدوں) کو چاہیئے کہ چھٹی فصل میں دیوتا پوجن کے متعلق جو عمل بنایا ہے اسی کے موافق عمل کیا جائے اور کسی قسم کی پوجا نہ کرے کیوں کہ اور دوسری قسم کی پوجا وید کے موافق نہیں ہے۔

(۲) کرم کانڈیوں کو چاہیئے کہ جس طرح پانچویں فصل "اشٹانگ یوگ" کی ترکیب لکھی ہے صرف اسی پر عمل کرے اس کے سوا کسی قسم کی عبادت نہ کرے، کیوں کہ اور قسم کی ریاضت "کرم گیان" کے خلاف ہے

(۳) گیانیوں کو چاہیئے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھ کر شری رام چندرجی کی طرح فائدہ اٹھائیے۔

ہندو مذہب میں چاروں بیدوں سے زیادہ کوئی معتبر کتاب نہیں ہے اور ان میں صرف تین ہی قسم کے مضامین ہیں وہ سب اس کتاب میں درج ہیں اور وشسٹ (بشسٹ) برہما کے پتر (لڑکے) نے شری راجہ رام کو اس کی تعلیم دی ہے، تو اس سے زیادہ معتبر اور دوسری کون کتاب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اسی کو دستور العمل بنانا چاہیئے۔ اس کے بعد خاتمہ نگار نے یونانی فلسفہ کی حکمت نظری اور حکمت عملی پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ حکمت عملی کی بہترین شاخ سیاست مدن ہے اور سیاست مدن کا عامل وہی شخص ہو سکتا ہے جو لذت محسوسات کو حقیر اور ناچیز جان کر، سلطنت کو خدمت گذاری، رعایا اور مخلوقات خدا کی سمجھے اور اس کتاب کو پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے گا، کہ یہ کتاب "ترک تعلقات" کے لئے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اس کا مصنف صرف بداعمالی اور بدافعالی کے ترک کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ شہوت (خواہش) اور غضب کو اعتدال سے استعمال کرنے کو کہتا ہے، وہ افراط، تفریط سے اپنے کو بچانے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ دو بیویوں کو منع کرتا ہے کیوں کہ اس سے عدل میں فرق آتا ہے اور اس سے فساد کی بنیاد پڑتی ہے اور تجرد کی زندگی بھی بسر نہ کرنی چاہیئے، کہ اس سے آدم کے نسل کے منقطع ہونے کا اندیشہ ہے اور جو لوگ دنیا میں مجرد رہ کر یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کو جنت میں حوریں ملیں گی، تو یقین جانو کہ وہاں چڑیل بھی نصیب

نہ ہوں گی۔

پھر مترجم کچھ نصائح کے بعد لکھتا ہے کہ جو شخص جہالت کو حکمت (علم) سے اور شہوت کو غضب سے اور غضب کو شجاعت سے اور ظلم کو عدالت سے بدل دے، وہی حقیقی سنیاسی ہے۔ وہی پرم ہنس ہے" وہی بیراگی، اور تیاگی ہے۔ لیکن تدبیر منزل پر عامل اس سے افضل ہے اور ریاستِ مدن کا عامل اس سے بھی افضل ہے، کیوں کہ سنیاسی صرف ایک سپاہی ہے۔ اور مدبر منزل ایک کرنل کے مثل ہے اور ریاست مدن کا عامل ایک جنرل ہے۔ جو ایک ملک کو فساد اور بدامنی سے بچاکر، راہِ راست پر لاتا ہے۔ اس کے بعد مترجم نے فقیروں پر بحث کی ہے کہ کس کس قسم کے فقیر ہوتے ہیں اور کن کن اسباب کی بنا پر لوگ فقیر ہوجاتے ہیں اور سب سے بہتر فقیر وہ ہے جس میں حکمت (علم) عفت، شجاعت اور عدالت ہو۔

سبب تالیف یوگ بشسٹ | شری راجہ رام چندر جی خلف راجہ دسترتھ، بہ سبب لاعلمی اور حقیقت سے ناآشنا ہونے کے، بے قرار ہوئے، تب وشسٹ جی وزیر نے ان کو جن نصائح سے مطمئن کیا، والمیک نے ہدایت عام کے خیال سے ان کو مرتب کر کے ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کے ضمن میں راج نیتی اور تہذیب الاخلاق کو درج کیا۔ دارا شکوہ شاہزادہ شاہجہاں نے اس کی اہمیت کو سمجھ کر سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا، اس سرور کائنات (؟) یعنی دارا شکوہ کے عہد میں فارسی کا از بس رواج تھا۔ اب اس عہد میں فارسی کا رواج جاتا رہا اور عام وخاص سب ہی میں اردو پڑھنے کا رواج ہوگیا، اس لئے فقیر نے اس کو اردو کا جامہ پہنایا، حتی الامکان فارسی اور سنسکرت کا مقابلہ کر کے اس کے لفظ اور معنی کی صحت میں مبالغے سے کام لیا ہے، پھر بھی ممکن ہے کہ غلطی رہ گئی ہو۔

اس کتاب کے چھ حصے ہیں۔ ہر حصہ کا نام پرکرن (باب) ہے۔

(۱) ویراگیہ پرکرن" یعنی راگوں (خواہش) سے رہت (الگ) ہونا۔ عالم اور عالمیان کو ناپائدار سمجھ کر چھوڑ دینا اور لذتوں کو ناچیز جاننا۔

(۲) موکش پرکرن" یعنی قیود سے آزادی، تعلقات سے رستگاری، توہمات سے استغنا اور نجات

(۳) اُت پت (اُت پت تی) پرکرن" یعنی پیدائش عالم کی حقیقت جیسا کہ عارفان ہند سمجھتے ہیں۔

(۴) اِسما تھرتی پرکرن "یعنی جس طرح قیام عالم کا ہے اور اس کی ترقی۔

(۵) اُپشم (اُپ شَ م) پرکرن "یعنی اس عالم کا فنا۔

(٦) نروان پرکرن "یعنی کلمہ دکلام اور جیون وچہ اے رستگاری۔ معرفتِ نفس، روح کی حقیقت

حمد خلائق کائنات اس کے بعد مترجم نے حمد خلائق اس طرح کی ہے۔

" میں اس کو سجدہ کرتا ہوں جو زمین اور آسمان اور دونوں کے درمیان آشکارا ہے اور کل موجودات میں محیط، جزو کل کا صانع، عین دانائی، سراپا نور، نفس کل، عقل کل اور تعینات سے منزہ ہے اُس کی ماہیت کے ادراک سے حواس ظاہری اور باطنی یعنی پانچوں گیان اندری (حواس خمسہ ظاہری) اور پانچوں گیان کرم اندری (اعضائے جوارح) اور چاروں انتھ کرن (دل، عقل فکر، خودی) معرفت بہ قصور ہیں۔

جو لوگ زندانِ تعلقات میں اپنے کو گرفتار سمجھتے ہیں ان پر اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے بشرطیکہ وہ غبی اور کند ذہن نہ ہوں۔ کیوں کہ ایسے لوگوں کو یہ کتاب مفید نہ ہوگی اور ان کو بھی اس کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جن کو حق الیقین کی معرفت ہو چکی ہے، کہ ان کے لئے یہ محنت لاحاصل ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، یعنی مؤلف نے ان عنوانات کی تشریح شروع کر دی جن کا اوپر تذکرہ ہوا ان میں سے پہلا بیراگ پرکرن ہے۔

پہلا بیراگ پرکرن آزادی کی تعریف میں بھاردوج نے (بالمیک کا شاگرد) بالمیک سے سوال کیا کہ شری رام چندر عارف اور گیانی تھے اور جیون مکت کا درجہ بھی حاصل کر چکے تھے۔ پھر سلطنت کے کام یعنی دنیا داری میں کیوں مشغول رہتے تھے۔ بالمیک نے کہا کہ شری رام چندر جی عظیم الشان راجہ بہمہ صفت موصوف تھے۔ قوت نظری اور عملی سے دنیا اور عقبیٰ کو ناچیز سمجھتے تھے، لیکن جس سبب سے وہ مہمات دنیاوی اور لوازمات بشری کو سرانجام دیتے تھے۔ اس کا سبب بتاتا ہوں، اور اس کے ساتھ دنیا، عقبیٰ اور اعراف مع متعلقات کے بھی بیان کرتا ہوں۔ اس کے بعد مؤلف نے دنیا کی بے ثباتی اور اس کو خواب پریشان بتا کر تاکید کی ہے کہ ہر قسم کی لذت کا احساس دل سے نکال دے، جس سے اس کو سکون اور بھر

سرور حاصل ہو اور غم و الم، بیم و رجا سے وہ نکل جائے۔

باشنا کی تعریف — مؤلف کہتا ہے کہ آزادی اور رستگاری فقط باشنا (خواہش) کے دور کرنے سے ہوتی ہے اور اسی کو گیانی پرسش (لوگ) مکت (یا مکتی) (نجات) قرار دیتے ہیں اور باشنا دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) سدھ باشنا" (نیک خواہشات) یعنی نیک افعال کی طرف رجوع کرنا۔ جو حکمت (علم) عفت، شجاعت، عدالت، کے فروعات ہیں اور تنزلات کی طرف میلان نہ کرنا۔

(۲) ملیمن باشنا (برے خواہشات) یعنی جہل، شہوت، غضب اور ظلم میں مبتلا رہنا۔ اپنی طاقت، حسن، قوم، خاندان، پر غرور کرنا اور کاہلی اور بدکاری میں مشغول رہنا اور ایسے کام میں مشغول رہنا جو بے فائدہ، یا نقصان دہ ہو۔

شری رام چندر جی کے ابتدائی حالات — جب شری رام چندر جی تحصیل علوم معقول و منقول، تہذیب اخلاق، تعلیم آداب، دنیاداری اور جہاں داری سے شہرۂ آفاق ہوئے، تو چند روز بچوں کی طرح کھیل کود میں مصروف رہے۔ پھر ان کو سیر و سیاحت اور عجائبات دنیا دیکھنے کا شوق ہوا۔ ایک روز اپنے استاد بشسٹ کو جو ان کے والد ماجد راجہ دسترتھ کے وزیر بھی تھے، ساتھ لے کر دربار میں حاضر ہوئے، قانون سلطنت کے مطابق آداب بجا لائے۔ راجہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ شری رام چندر نے عرض کیا کہ سیر و سیاحت کو میرا دل چاہتا ہے، تاکہ عجائبات اور نوادرات دنیا کا مشاہدہ کروں اور تیرتھوں کی زیارت سے مشرف ہوں۔ راجہ نے قبول فرما کر بڑے سامان اور تزک و احتشام کے ساتھ روانہ کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد شری رام چندر جی ہندوستان کے تمام ملکوں کی سیر اور تیرتھوں کی زیارت کر کے وطن واپس تشریف لائے اور اپنے ہم عمروں اور اپنے ہم عصروں سے مندرجہ ذیل تین صفات کا ذکر زیادہ کرتے۔ رج یا رجوگن (خواہش) آفرینش عالم اور پرورش۔

(۲) تم یا تموگن"، (غصہ حسد، کینہ) فنا اور ادورد۔

(۴) ست یا ستوگن (عقل، علم، تمیز) پرورش اور بشن۔

ان تینوں صفات کے عبادت خانے جو اثنائے سفر میں دیکھے تھے، اپنے دوستوں کو اس سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے اوقات اچھے کاموں میں صرف کرتے تھے، عارف اور صاحب کمالوں سے محبت رکھتے تھے اور شاہزادوں کے لائق اچھے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ جب رام چندر جی کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور اُداس رہنے لگے۔ ہر گھڑی خاموش رہتے۔ کھانا، پینا، نہانا اور سونا وقت سے بے وقت ہونے لگا۔ راجہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت تدبیریں کیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ راجہ رام چندر جی کا دل روز بروز زیادہ افسردہ ہوتا گیا۔

بسوامتر عابد کی دربار میں آمد

بسوامتر نامی ایک بڑے مشہور عابد تھے۔ جو ریاضت، عبادت اور علم وعمل میں شہرۂ آفاق، ایک روز راجہ دسترتھ کے دربار میں حاضر ہوئے، راجہ نے ایک عابد کی جس طرح تعظیم کرنی چاہیئے، اس میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ پھر دریافت کیا کہ آپ نے تو دنیا ترک کر دی ہے اور ہر قسم کی خواہش اور طمع کو دل سے نکال دیا ہے، پھر کس غرض سے دربار میں آنے کی تکلیف گوارا کی۔ اگر مدعا فرمائیں تو جو کچھ بھی رکھتا ہوں، اور مہیا کر سکتا ہوں اس کے دینے میں بخل نہ کروں گا۔ بسوامتر نے کہا، میں نے جگ (یگ) کرنا شروع کر دیا ہے تم رام چندر کو میری مدد کے لئے میرے ہمراہ کر دو۔ تا کہ اُسر (بھوت، دیو، راکشش) نہ ستائیں۔ راجہ نے کہا کہ رام چندر ابھی ناتجربہ کار ہیں ایسے شخص کو تمہارے ساتھ کرنے سے کامیابی کی قطعاً امید نہیں ہے۔ بلکہ ناکامی سے نقصان اور سخت رسوائی ہوگی۔ اگر مدد کی ضرورت ہے تو میں خود یا کسی اور تجربہ کار افسر کو تمہارے ہمراہ کر دیتا ہوں، تا کہ تمہارا مطلب حاصل ہو۔ بسوامتر نے جواب دیا کہ علم قیافہ، نجوم، طب اور علم اشراق سے میں جانتا ہوں کہ رام چندر حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت میں بے نظیر ہیں۔ اپنے مطلب کے حاصل کرنے میں ان پر جس قدر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، دوسروں پر نہیں۔ پس بلا عذر میری درخواست قبول کیجئے اور اپنا وعدہ یاد

کیجیے، کہ جو چیز طلب کرو گے میں دوں گا۔ راجہ جسرتھ دیر تک دریائے حیرت میں غوطہ زن رہے اور سوچتے تھے کہ کس طرح ناتجربہ کار ولی عہد کو اس سخت مہم پر روانہ کروں اور جو نہ قبول کروں تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔ بسوامتر نے بار بار کہا کہ اگر آپ نے وعدہ خلافی کی، تو تمام لوگ اس عیب کو ہنر سمجھیں گے، کیوں کہ رعایا، راجہ کے علم، ادب اور خُلق کو آئین اور قانون کا درجہ دیتی ہے۔ بس ناچار راجہ نے رام چندر جی کو اس کے ساتھ بھیجنا منظور کیا۔

جب راجہ نے منظور کر لیا، تو اراکین دولت سے دریافت فرمایا، کہ راجہ رام چندر آج کل کس شغل میں ہیں۔ ان میں سے ایک جوان جو ان کا ہم راز تھا۔ اُس نے کہا کہ ان کا دل اس دنیائے فانی سے اچاٹ ہو گیا ہے اور اب کسی دنیاوی کام میں حصہ نہیں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امیر و غریب مرنے کے بعد سب برابر ہیں، وہ اکثر خاموش رہتے ہیں اور سنیاسیوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ افسوس اتنی عمر لغو کاموں میں صرف ہوئی۔ بسوامتر نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ جو نعمت ان کے پاس ہے، اس کی قدر جاتی رہی ہے اور وہ اس کو ناچیز سمجھتے ہیں اور جس دولت کی اُن کو خواہش ہے، وہ ابھی حاصل نہیں ہوئی ہے اور یہ ان کی دانائی کی دلیل ہے اور اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ خود بہ خود سلطنت کے کاموں میں دل چسپی لینے لگیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ راجہ دسرتھ کی طلب پر جب وہ دربار میں آئے تو سب کو حسب مراتب سلام کیا۔ راجہ نے کہا کہ خدا کی مہربانی سے ہر قسم کا سامان میسّر ہے اور تم کو عقل سلیم اور حکمت عطا کی گئی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ تم جاہلوں کی طرح غم میں مبتلا ہو۔

بششٹ نے کہا کہ ہم نے اپنے تمام دشمنوں کو قید اور فرماں بردار بنا لیا ہے۔ پھر تم کیوں غم و اندوہ میں غوطہ زن رہتے ہو۔

بسوامتر نے پوچھا کہ اے رام چندر! درد جو تیرے دل میں چوہے کی طرح اندر اندر سوراخ کر رہا ہے وہ کس سبب سے ہے؟

رام چندرجی نے جو بسوامتر سے گرو کی بات سنی، تو وہ خوش ہوگئے اور بسوامتر سے مخاطب ہوکر جو بولے وہ ایک بڑی طویل تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"پہلے تو انھوں نے اس بات کی تشریح کی کہ دنیا فانی اور ناپائدار ہے۔ پھر اخلاقِ ذمیمہ اور اوصافِ حسنہ بیان کرکے فرمایا، کہ جوانی میں اپنے نفس پر کنٹرول کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ شہوت (خواہش) اور عورت دو اس کی جڑیں ہیں۔ یا تو ان کو جڑ سے اکھیڑ دینا چاہئے، یا پھر ان پر قابو پاکر اعتدال کی راہ اختیار کرنی چاہئے، ورنہ یہ باتیں انسان کو بے انتہا مصائب میں مبتلا کردیتی ہیں اور اس کے سبب سے بہت سے اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہوجاتے ہیں۔ دنیا کی خوشی اور غم کی مثال ایسی ہے جیسے خواب میں شادی کرے اور اس کو احتلام ہو، یا کوئی عورت خواب میں بچہ پیدا کرے، غرض جس طرح کی خوشی اور غم فانی ہے، اسی طرح دنیا کی ہر چیز کا حال ہے۔ گو انسان کی عمر برہما کی عمر کے برابر ہو، اور برہما کی عمر کا ایک دن چار ہزار جگ کے برابر ہے اور برہما کی عمر، بشن کے ایک پل کے برابر ہے اور جگ میں سے ست جگ ۱۷ لاکھ ۲۸ ہزار سال کا ہوتا ہے" ترنیا جگ ۱۲ لاکھ چھیانوے ہزار سال کا دواپر جگ" دس لاکھ ۶۴ ہزار سال کا اور کل جگ ۴ لاکھ ۳۲ ہزار سال کا ہوتا ہے، جس کی میزان ۴۳ لاکھ ۲۰ ہزار ہوتی ہے۔ ایسے ہزار دورہ سے برہما کا ایک دن ہوتا ہے، یعنی ۴ ارب ۳۲ کروڑ کا سال ہوتا ہے۔ اس کے باوجود برہما، بشن اور ردّر بھی موت کے منہ میں جائیں گے۔ جیسے بڈوانل اگنی کے منہ میں سمندر کا پانی جاتا ہے۔ یہ ایک آگ ہے جو چار جوجن سمندر کے پانی کو روزانہ کھاتی ہے اور جوجن چار کوس طویل، عریض اور عمیق کو کہتے ہیں۔ پس جب دنیا کے فنا کا یہ حال ہو تو انسان دائمی سرور کس طرح حاصل کرسکتا ہے، آپ لوگ صاحبِ کشف ہیں اور کمالات سے آراستہ اور عالم باعمل، مجھے بتائیں کہ اگلے لوگ کس طرح اپنے مقصد کو پہنچے، تاکہ میں بھی ان کی پیروی کروں۔"

رام چندرجی کی یہ باتیں سن کر لوگ دنگ رہ گئے، کہ اس کم عمری میں بوڑھوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ دربار میں سے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ شری رام چندرجی کی بات کا جواب دے، تب بسوامتر نے کہا کہ اے رام چندر! مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم کو طفولیت ہی میں علمِ لدُنّی حاصل ہوا، جس طرح

شکھ دیو کو یہ چیز حاصل ہوئی تھی۔ کہ ان کو تعلیم و تربیت کی ضرورت نہ پڑی۔ البتہ یہ فرق ہے کہ تم کو خود اپنے علم پر اطمینان نہیں۔ یہ اطمینان پیدا کر دے تاکہ حق الیقین حاصل ہو۔

رام چندر نے دریافت کیا کہ شکھ دیو کو کیوں کر اطمینانِ قلب حاصل نہ تھا، جب کہ اس کو علم لدنی حاصل تھا اور اپنے علم پر عمل بھی کرتا تھا۔ بسوامتر نے کہا کہ اس کا حال تمہارے جیسا تھا، اس کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ دوسری دفعہ جنم نہ لے۔ وہ اگرچہ عالم کو حادث جانتا تھا اور لذاتِ محسوسات سے متنفر تھا، پھر بھی اس کو اطمینانِ قلب نہ تھا، کیوں کہ وہ حقیقت کے ادراک سے قاصر تھا۔ اُس نے ایک دفعہ اپنے باپ سے پوچھا کہ یہ عالم کس طرح ہے اور فنا کس طرح ہو گا؟ طول و عرض اس کا کس طرح ہے اور رنج و راحت کس طرح لاحق ہوتے ہیں۔ باپ کے بتانے سے اس کو تشفی نہ ہوئی، کیوں کہ جو کچھ اس نے بتایا، اس کا علم اس کو پہلے ہی سے تھا، باپ نے جب معلوم کرایا کہ اس کو تشفی نہ ہوئی، تو اس نے کہا کہ ترہٹ دیس (صوبہ بہار کے ضلع مظفر پور، دربھنگہ وغیرہ) میں "جنک" نامی ایک راجہ ہے وہاں جا، اس جگہ تیری تشفی ہو جائے گی۔ چناں چہ وہ وہاں گیا اور راجہ کو خبر دی، اس نے ایک ہفتہ انتظار کرایا۔ پھر ایک ہفتہ دربار میں حاضری کا حکم دیا۔ مگر اس سے ملا نہیں۔ پھر اس نے خلوت میں طلب کیا اور عیش و عشرت کے تمام سامان جمع کیے، ناچ، گانا، حسین عورتیں، شراب ناب وغیرہ لیکن خود اُس سے نہ ملا، اکیس دن کے بعد جب کہ اس نے دیکھ لیا کہ شکھ دیو دنیا کی کسی چیز کی طرف مائل نہیں ہوتا ہے، تو اپنے سامنے بُلا کر کہا، کہ تم نے دنیا، عُقبیٰ اور اعراف کی تمام منزلیں طے کر لی ہیں، پھر کیوں یہاں آئے ہو؟

شکھ دیو نے باپ سے جو سوالات کیے تھے، مکرر بیان کیے، اس کے جواب میں کہا کہ ایک آتما (روح) جس کو فنا نہ ہو، اس کا نہ طول و عرض ہوتا ہے نہ انتہا اور ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ نظر آتا ہے، وہ فقط وہم و خیال ہے، جب یہ وہم دل سے نکل جائے گا، تو تینوں عالم، مرت لوک (اہل دنیا) انترہ لوک (زیر زمین) اور سُرگ (سورگ) لوک (آسمانی لوگ) خود بہ خود فنا ہو جائیں گے اور مخلوق امید و بیم، رنج و راحت میں فقط اپنے وہم سے مبتلا ہے، شکھ دیو نے کہا کہ

میرے باپ نے بھی یہی بتایا تھا اور خود مجھ کو بھی پہلے سے اس کا علم ہے، مجھے تو یہ بتائیے کہ انتظامِ عالم کس طرح ہے، راجہ جنک نے کہا کہ عارفوں کے علم اشراق سے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، جو مختلف اشکال تم کو نظر آتے ہیں، ان سب کی اصل ایک ہے۔ نظر سے جو جو کثرت تم دیکھتے ہو، اسی کا نام عالم پڑ گیا ہے اور یہ تم کو محض وہم سے کثرت نظر آتا ہے، جب وہم دور ہو جائے، تو حق الیقین حاصل ہو جاتے اور یقین کے تین درجے ہیں۔

(۱) کتابوں کے پڑھنے، عالموں، عاقلوں اور تجربہ کاروں کی صحبت سے جو حاصل ہو، اس کو علم الیقین کہتے ہیں۔

(۲) حکمت نظری اور عملی کے جاننے والے حکما کو کشف اور اشراق سے جو مشاہدہ ہوتا ہے اور ماضی، حال اور استقبال سے جو حالت معلوم ہوتی ہے، اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔

(۳) ناظر اور منظور، طالب اور مطلوب، عاشق اور معشوق، ساجد اور مسجود، جب ایک ہو جائیں اور دوئی کا خیال جاتا رہے تو اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔

کیوں کہ وجودِ عالم جو وہم سے بنا ہے باقی نہیں رہتا اور جب وہم دور ہو گیا تو مکت (یا مکتی) (نجات) حاصل ہو گی۔ سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ

(۱) لذتِ محسوسات سے کنارہ ہو

(۲) تعلقات و تعینات سے آزاد ہو جائے۔ یہ معرفت کی پہلی علامت ہے اور اسی کا نام نجات ہے۔

غرض اسی قسم کی باتوں اور نصائح سے شکھ دیو کو اطمینانِ قلب ہو گیا، تمام قیود سے آزاد ہو کر مدت تک سمادھی (مراقبہ) میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ وہ عقلِ کل ہو گیا۔

اس کے بعد بسوامتر نے کہا کہ اے بشسٹ تم جملہ صفات سے موصوف ہو اور رام چندر کے خاندان پر قدیم زمانہ سے مہربان ہو، تم رام چندر کو خلق اور ادب کی تعلیم دو اور ان کے دل سے بیم ورجا کو نکال دو اور میری تمہاری عداوت کے سبب سے برہما کو جو صلح کرانی پڑی وہ تعہ

بھی سنا دو۔

حاضرینِ دربار نے اس بات کو بہت پسند کیا اور بشٹ (بشسٹ) نے رام چندر کی تلقین اپنے ذمہ لی۔

بشسٹ نے رام چندر سے کہا کہ قدیم زمانہ میں ہماری بسوامتر سے ایسی عداوت ہوئی کہ نوبت جنگ کی پہنچی، آخر برہما نے اس کا فیصلہ کیا اور دونوں میں صلح ہوگئی، اس کا مفصل ذکر بھاگوت میں موجود ہے۔ پھر ایک گائے کے کرامات کا طویل قصہ بیان کیا جو افسانوی رنگ سے بھرا ہوا ہے۔ وہ فقط افسانہ ہی افسانہ نظر آتا ہے، اور حقیقت شاید اس میں صرف اس قدر ہو کہ جو نام لئے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ پر صحیح ہوں۔

ناظرین کے لئے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، کہ عمروں کے لحاظ سے یہ دونوں بڑے خوش نصیب واقع ہوئے ہیں۔ یعنی لوگوں کا خیال ہے، کہ یہ دونوں آج تک زندہ ہیں اور کبھی کبھی یہ لوگوں کو دکھائی بھی دیتے ہیں۔

غرض خلاصہ اس باب کا یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ ہر قسم کی خواہش سے آزاد ہو جائے اور جب یہ آزادی حاصل ہوگئی تو وہ مکت ہو جائے گا، یعنی امید و بیم سے نجات پا جائے گا جو وہم و خیال سے پیدا ہوتا ہے۔

باب دوم | اس باب کا عنوان "موکش پرکرن ہے"، یعنی قِدم اور حدوث کے بیان میں، اس باب میں بھی مختلف قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں، لیکن ان کا خلاصہ یہ ہے۔

"وجود مطلق لاتعین اور الکھ ہے اور عالم اس کی صورت ہے اور وہ ہر جگہ ہر شے میں محیط ہے۔ اور ہر شے کا قوام اسی سے ہے اور وہ اکاش، اناد ھ، پرکاش، دانائی اور نور ہے، اس کی شان حدوث اور قِدم سے منزہ ہے اور وہ ہر وقت ہر حال میں یکساں ہے، خواہ قیامت برپا ہو، یا دنیا آبادی اور مسرتوں سے بھرپور ہو۔

بشسٹ اس عالم سے قبل مثل کنول کے پھول کے ہوا۔ پھر برہما ہوا اور برہما سے تمام موجودات کا وجود ہوا اور پھر برہما نے تمام موجودات کو اس طرح پیدا کیا، جس طرح آدمی عالمِ خیال میں تمام جہان کی

سیر کرتا ہے۔ اس کے بعد برہما سے بھرت کھنڈ (ہندوستان) کی ہدایت کے لئے "بشسٹ" پیدا ہوا تاکہ نیک اعمال کے ذریعہ ملک کا انتظام ہو۔ آگے چل کر یہ نصیحت لکھی ہے کہ جو بات دلیل سے ثابت نہ ہو اگر برہما کا قول ہو تب بھی باور نہ کرو اور جو بات دلیل سے ثابت ہو، وہ اگر طفلِ شیر خوار کہے تو اس کو سُرتی اور سمرتی سے اشرف جانو، تب تم گیانی بنوگے۔ اس کے بعد آخر میں اس باب کا خلاصہ اس طرح لکھا ہے کہ یاد رکھو! جو کچھ تحریر یا تقریر میں آوے، یا لفظ، رنگ، بو، مزہ، لمس، رکھتا ہے وہ حادث ہے اور جو ان سب سے منزہ ہے وہ قدیم ہے، راقم الحروف کہتا ہے کہ کاش جو کچھ اس باب میں دعویٰ کیا گیا ہے اس کی بھی کوئی دلیل دی ہوتی۔

باب سوم | اتپتی (اُ ت پ ت ی) پرکرن، یعنی پیدائش عالم کی تعریف میں۔

ان کھوت، بیدن، پرت پت، کے معنے "پرتجھ" کے ہیں اور پرتجھ مُدرکِ معقولات کو کہتے ہیں۔ یہی روح اور یہی پرم آتما کے نام سے موسوم ہے۔ پرتجھ کے دوسرے معنے "سب میں بھرا ہوا" اور اسی کو پرش بھی لے نامزد کرتے ہیں اور اسی کے سبب سے ہر شخص اپنی نسبت اس کی طرف کرتا ہے[1]۔ اسی کا نام "اہنکار" ہے، یہ زمان، مکان اور جسم کچھ نہیں رکھتا، محض برائے نام ہے، وجودِ عالم سے پہلے وہ اکارن تھا، جب باشنا یعنی مایا ہوئی تو بہت نام اور نشان سے موسوم ہوا اور وہی صورت آئینہ ہستی کی نمایاں ہوئی۔ دیکھو! کہر، ببلہ، برف، اولہ، اوس، کہاسا، شکل و صورت اور نام جدا جدا رکھتے ہیں۔ مگر اصل سب کی پانی ہے۔

کوئی کہے کہ برہم صانع عالم ہے اور برہم کی تعریف کرتے ہیں کہ عین پرکاش اور عین گیان سروپ ہے اور روح صانع کے نہیں ہے پس یہ دونوں ایک کیوں کر ہوسکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ برہم صانع عالم کا نہ تھا۔ جب اس کو خواہش ہوئی کہ وحدت سے کثرت ہو، صانع عالم کہلایا۔ اسی وجہ سے ظاہر ہے کہ صانع عالم کی خواہش یعنی مایا بھی برہم ہے اور عالم کی صورت اُس کی ذات میں بالقوۃ موجود تھی، جب کثرت ہوئی بالفعل ظاہر ہوئی جیسے کہ عالمِ خواب اور بیداری میں اور مثل ہوا کے

---

[1] اسی کو خودی کہتے ہیں۔

رفاہ عام

جناب مولوی محمد انظر شاہ صاحب۔ استاذ دارالعلوم دیوبند

مسلمانوں نے اپنے ارتقائی دور میں اپنی حکومت، وسلطنت، شوکت وحشمت، وجاہت واقتدار اور دولتوں کے معمور خزانوں سے رفاہیت عامہ کے جو کارنامے انجام دیئے اور جس طرح لاکھوں اور کروڑہا کروڑ کی رقم سے خدا کی مخلوق کے آرام وراحت کے سامان بہم پہنچائے، تنزل و انحطاط کے اس دور میں جب کہ، اقتصادی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے، رفاہِ عامہ سے متعلق ان کے شاندار کارنامے بہ ظاہر مورخین کے طبعزاد مضامین اور ان کی جولانیِ قلم کے بے حقیقت خاکے معلوم ہوتے ہیں، لیکن پچھلوں پر قیاس کر کے، اگلوں سے متعلق داستانوں کو، کذب بیانیوں کا طومار قرار دینا، صائب عقل کا فیصلہ نہیں۔ حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت ہے، چند لوگوں کے نہ ماننے سے، حقائق ہرگز نہیں بدلتے، تاریخ پڑھتے جائیے اور ہر صفحہ پر رفاہ عام کے حیرت انگیز کارنامے دیکھتے جائیے، ہزارہا نہریں کھود ڈالیں، سینکڑوں چشمے اور کنویں بنا ڈالے، حوض وتالاب کا سلسلہ قائم کر دیا۔ آبپاشی وآب رسانی کے لئے خزانوں کا منھ کھول دیا۔ پل بنوائے، سڑکوں کا جال بچھا دیا، مسافروں کے لئے مامون ومحفوظ راستے بہم پہنچانے کی خاطر، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی رقم صرف کر دی، سیلاب سے حفاظت کے لئے بندوں کا طویل سلسلہ کھڑا کر دیا، لنگر خانے، مسافر خانے، اوقاف و وظائف! شفاخانے، محتاج گھر، کون سا رفاہِ خلق کا وہ شعبہ ہے جس کے تذکرے، مسلمانوں کی تابناک تاریخ میں نہیں ملتے، مگر مصیبت یہ ہے کہ معاند مورخ کی نظر سب کچھ دیکھتی ہے، لیکن وہی چیزیں جس سے دنیا کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کو کیا نقصان پہنچا، مورخ کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور اگر کبھی نظر پڑ بھی جاتی ہے، تو تعصب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ان

کارناموں کو جن سے تاریخ کے صفحات جگمگا رہے ہیں دوسروں تک ان کی اطلاع پہنچائی جائے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ان زریں کارناموں کو چھپا کر، انسانیت پر ایک بڑا ظلم کیا جا رہا ہے، آج بھی اگر مسلمان اپنے اسلاف کی رفاہِ خلق کے سلسلہ میں خدمات سے واقف ہو کر اقتصادی الجھنوں کے باوجود رفاہیت کے یہی مفید کام انجام دینے لگیں تو اپنوں کو نہیں بلکہ غیروں تک کو ان کے ان کاموں سے یقیناً فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا!

دنیا قطعاً اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ اسلام نام ہر ایک ایسے خوش گوار نظام کا ہے جس سے پوری انسانیت فائدہ اٹھائے اور وہی حقیقتاً مسلمان ہے جو اپنی جدوجہد سے بلا تفریق انسانوں کی خدمت کر سکے، کاش کہ اغیار خود بھی اس کو سوچتے اور مسلمانوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے اور اس طرح رکا ہوا قافلہ، آگے بڑھ کر، انسانیت کی کسی امتیاز کے بغیر خدمت کرتا مسلمانوں کو ان کی تاریخ سے ناواقف رکھ کر، ان کو معطل رکھنے والے، خود اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ اس حقیقت کو اگر آج نہیں تو بڑھتی ہوئی انسانیت ایک نہ ایک دن ضرور سمجھے گی، بہر حال وہ کام جو دوسروں کو اپنی فلاح وصلاح کے لئے انجام دینا چاہئے تھا، جب نہیں دیا جا رہا ہے تو پھر ہم کو ہی چاہئے کہ تاریخ کے دریچے کھول کر، مسلمانوں کو ان کے کارنامے دکھا دیے جائیں۔ کیا عجب ہے کہ ہمیں کی یہ کوشش، بروقت ہو اور اس طرح منزل سے پس ماندہ قافلہ، جادہ پیمائی کی توانائی وقوت استعمال کر کے، منزل کی جانب تیز قدم اٹھالے! یہی کچھ مقاصد ہیں جن کی خاطر یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ اب رفاہیتِ عامہ کی تفصیل کو پڑھتے جائیے اور سوچئے کہ اپنے محدود وسائل وذرائع کو کام میں لا کر ہم بھی اپنے وجود سے، اس کراہتی ہوئی دنیا کو کیا کیا فائدے پہنچا سکتے ہیں اور کس طرح اس کائناتِ انسانی کی خدمت انجام دی جا سکتی ہے! رفاہِ خلق کے سلسلہ میں سب سے پہلے نہروں کے متعلق مورخین کی ان تفصیلات کو پیش کرتا ہوں، جو نہروں کی کھدائی اور اس طرح لاکھوں ٹن، پانی کے بہم رسانی کے منصوبے مسلمانوں نے قائم کئے اور انسانوں کی عام آبادی کے لئے اس سے کیا فائدہ پہنچا!

نہروں کی کھدائی والیانِ سلطنت، امراء اور حاکمانِ ذی اقتدار نے، آبادیوں اور بستیوں میں نہروں

کا ایک ایسا جال بچھا دیا ہے کہ آج جب کہ سائنسی ترقیوں نے اس قسم کے کام انجام دینے کے لئے سیکڑوں ذرائع ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں پھر بھی سائنس کے اس ارتقائی دور میں اتنی طویل خدمات ممکن نہیں۔ کہیں پہاڑوں کو چیر کر نہریں بنائی گئیں اور کبھی بڑے بڑے دریاؤں سے میلوں کے فاصلے پر نہروں کو زرِ کثیر صرف کر کے لے جایا گیا، کبھی سنگلاخ وادیوں میں کر ورہا من پانی بہا دیا۔ اور پھر کبھی ریگستانی علاقوں کے سینوں پر پانی کے ذخیروں کے منہ کھول دیئے۔ مسلمانوں میں یہ مذاق اس درجہ عام رہا کہ ہر سیاح اور ہر مورخ نے اپنے سیاحت ناموں اور تاریخوں میں نہروں کے متعلق بڑے تفصیلی بیان دیئے ہیں۔ نہروں سے متعلق مسلمانوں کی اس عام دلچسپی کی وجہ المقدسی نے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"اظنہ بناھا علی ما سمع من اخبار الجنۃ" (احسن التقاسیم ص۱۲۵)

میں خیال کرتا ہوں کہ جنت کے متعلق جو خبریں ان لوگوں نے سنی ہیں انھیں خبروں نے ان نہروں کا خیال ان میں پیدا کیا۔

مگر ——— المقدسی کی اس توجیہ سے قلب مطمئن نہیں ہوتا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ نہروں کے جال بچھائے جا رہے تھے صرف اس لئے کہ جنت کے تذکروں میں اس قسم کے ذکر اور واقعات کثرت کے ساتھ مسلمانوں کو سنائے گئے اگر یہی بات ہے تو کیا جنت نام ہے صرف اسی ایک نہروں کے طول وطویل سلسلوں کا ہرگز نہیں بلکہ خداوند قدوس کی جمالی کیفیتوں کا یہ مظہر جس کو ہم جنت و فردوس کے نام سے یاد کرتے ہیں خداوند تعالیٰ کی ان کثیر و خوش گوار نعمتوں پر محیط ہے جن کو نہ کانوں نے سنا اور نہ آنکھوں نے دیکھا اور جن کے تذکروں سے آسمانی کتابیں تقریباً لبریز ہیں، تو پھر کیا مسلمانوں نے خدا کے انھیں انعام واکرام کی خبروں کو سن سنا کر اس دنیا کے سینہ پر اس کی نقل اتارنے اور خاکہ اڑانے کی کوشش کی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر سوچنا چاہئے کہ المقدسی کی یہ توجیہ کس حد تک صحیح ہے۔ اور نہروں کا یہ عام مذاق مسلمانوں میں آخر کیوں پھیلا؟

میں جس حد تک سمجھ سکا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ انسان کی زندگی جن چند چیزوں پر قایم ہے

ان میں ضرورت کے موافق اکل وشرب یعنی کھانے پینے کا بڑی حد تک دخل ہے، کھانے پینے کا یہی سلسلہ جس پر انسانی زندگی کا دار ومدار ہے اس سلسلہ کو غیر ضروری قرار دے کر پھر سوچئے کیا انسان زندہ رہ سکتا ہے؟ اور چھوڑ یئے انسان کو ہر وہ ذی روح، جس کی بقاء و حیات اکل وشرب پر قایم ہے کیا کھائے پئے بغیر وہ زندہ رہ جائے گا؟ اور پھر پانی کی ضرورت، کون سادہ شعبہ ہے جس میں آپ محسوس نہیں کرتے، انسانوں کے لئے غلے، ترکاریاں اور پھل، چرندوں کے لئے گھاس اور چارہ وغیرہ کیا اس پانی کے بغیر تیار ہو سکتے ہیں۔ بہرحال آپ سوچئے کہ پانی کے بغیر زندگی کا تصور نہ صرف ناقص اور ادھورا ہے بلکہ سرے سے تصور کیا ہی نہیں جا سکتا، کسی خاص ریاضت ومجاہدہ کے تحت پانی کی ضرورت سے بے نیاز ہونا دوسری بات ہے، عام حالات میں پانی سے استغنا و بے نیازی ذرا اسی پر غور کیجئے۔

حیوانی زندگی میں پانی کی یہی ضرورت جس کو اپنی حد تک میں نے سمجھانے کی کوشش کی ہے اس کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ مسلمانوں کے اس عام مذاق کے متعلق مقدس کی توجیہ کس حد تک وقیع ہے؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ انسانیت کا وہی خادم، جو مسلمان کی صورت میں تیار کیا گیا ہے اس کا فریضہ تھا کہ انسان اور غیر انسان کی اس سب سے بڑی ضرورت پر اپنی جد وجہد کی تمام طاقتیں اور اپنے ذرائع ووسائل کی تمام توانائیاں صرف کر دے، اور زندگی کے اس سب سے بڑے جز کو بہم پہنچانے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی اس سے سرزد نہ ہو جس امت کا رسول امت کو پانی کی اسی عام ضرورت کو ان پیرایوں سے سمجھا رہا تھا کہ "جو شخص پانی روکے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے رحمت روک لے گا" (احکام السلطانیہ ص ۲۹۳) کیا امت کے افراد کی پھر یہ مجال تھی کہ پانی کے اس بیش بہا دولت کے خزانوں کو عام نہ کریں، اور ایسی کوششیں ان کی طرف سے نہ ہوں جن میں خدا کی اس نعمت سے فوائد اُٹھانے کے لئے موثر اور عام ذرائع سب کو حاصل ہوں۔ نبی کے انھیں تنبیہی ارشادات کا نتیجہ تھا کہ صلح کے معاہدوں میں بھی دوسری چیزوں کے ساتھ، پانی کے حصول کی عام رعایتیں ملحوظ رہتی تھیں عمر رضی اللہ عنہ نے معاہدہ صلح کیا تو اس میں خاص طور پر اس کا ذکر تھا

"راہ گیر پانی اور سایہ کے حق دار ہیں" (فتوح البلدان ج ۱ ص۲۵)

بلکہ عمر رضی اللہ عنہ ہی نے ایک ایسے شخص کا خون بہا ادا کرکے چھوڑا جس نے پیاس کے عالم میں ایک قوم سے پانی مانگا اور اس نے نہ دیا نتیجہ میں

"وہ غریب پیاس سے مرگیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے خون بہا کا مطالبہ کیا"۔ احکام السلطانیہ صـ۲۹۳

امام شافعی رحمتہ اللہ عنہ کا عمرؓ کے اسی فیصلہ پر یہ فتویٰ ہے

"آدمیوں اور جانوروں کو پانی پلانا واجب ہے" (دیکھو کتاب مذکور صـ۲۹۳)

اور تو اور سعید بن مسیب اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں

"چشموں اور کنوؤں کی بیع جائز نہیں ان کی قیمت حرام ہے"۔ کتاب مذکور صـ۲۹۵

بہر حال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز میں پانی کی ضرورت سمجھائی تھی اس کا اقتضاء تھا کہ صحابہؓ بے دریغ کثیر رقم صرف کرتے اور کنویں خرید کر وقف کرتے، پانی کے ذخیروں سے عام انسانوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیتے، ان تمام گوشوں پر غور کرنے کے بعد بڑی آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے، کہ مسلمانوں میں انہار کا یہ شوق و ذوق آخر کیوں اس درجہ عام تھا! اور اس طرح "المقدسی" کی بیان کردہ توجیہ بے وقیع ہو کر رہ جاتی، سینکڑوں نہریں، تالاب، کنویں، حوض، چشمے اور جا بجا ایسی سبیلیں جن سے پیاسے اپنی پیاس و تشنگی بجھا سکیں، یہ تمام انتظامات اور اہتمام اصل میں صرف انہی تنبیہی ارشادات کا اثر و نتیجہ ہے جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کی ضرورت اور اس سے عام طور پر فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ چناں چہ جب کبھی بھی مسلمانوں کو موقع ملا تو خاص اس چیز میں انھوں نے اپنی اولوالعزمیوں کے ایسے ثبوت دیئے کہ انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ بصرہ والوں کا ایک وفد احنف بن قیس کے ساتھ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل وفد سے دریافت کیا کہ تم لوگوں کے آنے کی کیا وجہ ہے؟ اور اس کے بعد احنف سے جو موٹے، موٹے کپڑے پہنے ہوئے ایک گوشہ میں چپ بیٹھے تھے دریافت کیا کہ تم بھی کچھ کہو گے؟ عمرؓ کے اس سوال پر احنف نے ایک طویل بیان دیتے ہوئے آخر میں کہا

"ہمیں پانی کے لئے دو فرسخ دور جانا پڑتا ہے جو ضعیف ہوں ان کے لئے یہ کیسی مصیبت ہے، جب کوئی عورت پانی لانے جاتی ہے تو اس خوف سے کہ کہیں دشمن نہ آپڑے یا درندہ اس کے بچہ کو نہ پھاڑ کھائے، اپنے بچہ کو گلے سے باندھ لیتی ہے، جس طرح بکری کا بچہ باندھا جاتا ہے اگر امیر المومنین نے ہماری اس مصیبت کو دور نہ کیا تو ہم اس قوم کی طرح ہوجائیں گے جو ہلاک ہوجائے" (فتوح البلدان جلد ۲ صفحہ ۵)

لکھا ہے کہ احنف کی اس درخواست پر فاروق رضی اللہ عنہ نے، ابو موسیٰ الاشعری کو حکم دیا کہ فوراً

"ان کے لئے نہر کھدوائیں" (ایضاً)

چنانچہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل کی، اجانہ سے ابتدا کی اور تین فرسخ تک کھود کر، نہر بصرہ تک پہنچادی اور اس طرح بصرہ کے ان باشندوں کو جو پانی کو حاصل کرنے میں بڑا تعب اٹھاتے اور میلوں دور جاکر پانی لاتے تھے جیسا کہ بلاذری ہی نے لکھا ہے

"جب یہ نہر نہ تھی تو لوگ الابلہ سے چار فرسخ کے فاصلہ پر ایک مقام ہے جسے دیر قادوس کہتے ہیں، پانی لاتے تھے" (ایضاً ص ۵۲)

اس تمام گو و کاوش سے نجات مل گئی اور ایک حضرت عمر ہی کی کیا خصوصیت ہے ان میں سے جس کو بھی جب کبھی موقع مل گیا تو آب رسانی کے لئے نہروں کو کھودنے کی ضرورت بھی تو بے تامل خزانہ کا منھ کھول دیا، لکھا ہے کہ عمرو بن عاص نے دریائے نیل سے نکال کر ایک نہر قلزم میں ڈال دی۔ یہ وہ نہر تھی جس کو سیتی اول خاندان (۱۹) نے شروع کیا تھا اور جس کی تکمیل نکاو خاندان (۲۶) کے ہاتھوں ہوئی تھی، بعد میں رومیوں کی غفلت سے یہ اٹ گئی اور بالکل ناقابل استعمال حالت میں پہنچ گئی تھی لیکن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے

"فسطاط کے کنارے سے اس کو کھودنا شروع کیا اور عین شمس اور وادی طمیلات سے لاکر قلزم کے متصل بحیرہ میں گرادیا، اس کا طول اسّی میل تھا" (تاریخ امت جلد ۶ صفحہ ۵۳)

دو چار میل نہیں، دس اور بیس میل بھی نہیں بلکہ پورے اسّی میل کے طول و طویل علاقہ میں یہ نہر جو کھینچ کر

عمرو بن عاصؓ نے پہنچائی لیکن وقت جو اس عظیم الشان کام میں صرف ہوا ہو بقول مورخ

"صرف چھ مہینہ میں تیار ہو گئی" (ایضاً)

سائنس کے اس حیرت انگیز ترقیاتی دور میں میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس قدر عجلت اور قلیل مدت میں اتنا بڑا کام بن پڑ سکے، اگرچہ عمرو بن عاص نے عرب کے اس مشہور قحط میں جو عام الرادہ کے نام سے مشہور ہے، غلہ کو برآمد کرنے کے لئے اس نہر کو کھدوایا تھا چنانچہ پہلے ہی سال اس کے ذریعہ سے ساٹھ ہزار اردب غلہ مصر سے عرب میں پہنچا لیکن سوچئے کہ کیا پھر دنیا نے اس نہر کو صرف اسی ایک منفعت کے لئے استعمال کیا؟ آب پاشی، آب رسانی، مویشیوں کو پانی پلانا اور مسافروں کا اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھانا، کیا سب کچھ فائدے دنیا نے نہ اٹھائے ہوں گے؟ آخر بتایا جائے کہ کون سی وہ نہر ہے جس سے سینکڑوں طرح پر فائدے اٹھانے والے فائدے حاصل نہیں کرتے۔

سیرت معاویہؓ میں کبھی مورخ کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ نظر پڑتے ہیں کہ معاویہؓ نے

"بہت سی نہریں جاری کرائیں" تاریخ اسلام ص ۲۱ جلد ۲

اور یہی یزید بن معاویہؓ جو کربلائی حادثہ کی وجہ سے تمام ہی مسلمانوں میں مشہور و رسوا ہو گیا اپنے ان تمام خونریز اور سفاکانہ ہنگاموں کے باوجود، عام مسلمانوں کے اس ذوقِ انہار سے بے بہرہ نہیں تھا بلکہ اس سلسلہ میں اس کی تاریخ میں بھی نہر کھدوانے کے واقعات اور ہزاروں لاکھوں عوام کو پانی پہنچانے کے انتظامات کی اطلاعیں ہم تک پہنچی ہیں، بلادِ فلسطین و شام نامی کتاب میں دمشق کے حالات کو ذکر کرنے کے بعد انگریز مصنف لکھتا ہے

"دمشق کی ندیاں ایک مقام سے جو کنیۃ الفجہ کے نیچے واقع ہے اور جس جگہ عین بردا جبل سنیر سے نکل کر آگرا ہے آگے چڑھتی ہیں اور اس چشمے کے کنارے سے اور بہت سے چشمے پھوٹتے ہیں الفیجہ پر اس کا پانی ایک بانس چوڑا اور ایک درع گہرا ہے، لیکن اسی جگہ کے نیچے خلیفہ یزید ابن معاویہ نے ایک بڑی نہر کھدوائی تھی جو اتنی گہری ہے کہ آدمی اس میں غوطہ لگا سکتا ہے ص ۲۸۴

عراق کا ارتفاع نہروں کی کھدائی کے اسی غیر معمولی ذوق کو پورا کرنے میں، میں نے جیسا کہ عرض کیا ہے

کہ مسلمانوں نے اپنی دولت بے دریغ لٹادی اور زر کثیر صرف کرکے، عام انسانوں کے لئے سہولت و راحت کے سامان کئے، میرے اس دعوے پر، یہ واقعہ جو تاریخ ہی کے صفحات سے نقل کیا جارہا ہے شاہد ہے لکھا ہے کہ یزید بن الولید کی جانب سے عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز العراق کے عامل ہوئے تو لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ ان کے شہر کا پانی شور ہے اور شکایت کرنے والے اپنے ساتھ دو شیشیاں بھی لائے تھے، ایک میں بصرہ کا پانی تھا اور دوسری میں بطیحہ کا۔ عبد اللہ نے دونوں کا مزہ چکھا تو واقعی پانی بے حد شور پایا۔ لوگوں نے کہا کہ اگر ہمارے لئے ایک نہر بنوادی جائے تو ہم میٹھے اور خوش گوار پانی سے شادکام ہوسکیں گے۔ عبد اللہ نے اجازت طلبی کے لئے، یزید کو لکھا تو وہاں سے جواب آیا

"ان کے لئے نہر بنوادو"

جن دنوں نہر کا کام جاری تھا۔ کسی شخص نے، عبد اللہ کی مجلس میں کہا کہ اس نہر کے مصارف کا تخمینہ تین لاکھ درہم تک ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے، اس اندازہ و تخمینہ کو سن کر عبد اللہ نے جو کچھ کہا میں اسی کو سنانا چاہتا تھا لکھا ہے کہ عبد اللہ نے جواب میں کہا کہ

"اگر اس کام میں عراق کا پورا ارتفاع بھی خرچ ہوجائے تو بھی میں خرچ کروں گا اور نہر بنواؤں گا" (فتوح البلدان ص ۱۷ جلد ۲)

مسلمانوں کی اولو العزمیوں کی یہی وہ داستان ہے جس پر سننے والے دیانت و انصاف کے ساتھ اگر فیصلہ کرنا چاہیں، تو اپنے خصوصیات و امتیازات میں بلاشبہ، اس بلند کردار قوم، کو اقوام و ملل سے جدا پائیں گے۔

شاہی خرچ بنو امیہ نے رملہ کی نہروں پر جو کثیر خرچ کیا اس کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے

"بنی امیہ نے الرملہ کی نہروں اور کنووں پر بھی بہت روپیہ خرچ کیا اور عباسیوں کا دور آیا تو وہ بھی زر کثیر صرف کرتے رہے۔ اور ہر خلیفہ کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا رہا یہاں تک کہ خلیفہ معتصم باللہ کا زمانہ آیا تو اس نے ان مصارف کے لئے مستقل انتظام کردیا تاکہ بار بار جو درخواستیں آیا کرتی تھیں ان کی

ضرورت نہ رہے" (بلاد فلسطین و شام ص۱۷،۳)

مسلمان بادشاہوں پر عیاشی، و تنعم، لذت کوشی اور لطف اندوزی کے اعتراضات تو بہت کئے جاتے ہیں لیکن معاند مورخ کو اس قدر اخلاقی جرات نہیں کہ ان سلاطین و حکام کے یہ کارنامے بھی جو رفاہِ عام سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے تمام انسانوں نے کسی امتیاز کے بغیر فائدہ اٹھایا ظاہر کر دیں اور یہی کیا بلکہ ان کی تاریخ میں تو یہاں تک ملتا ہے کہ صرف

ایک محلہ | میں چار چار نہریں پہنچا دیں۔ منصور کے حالات میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ اس نے

"اس کی داغ بیل دجلہ اور فرات کے مابین، نہر صرہ کے کنارہ پر ڈالی اور اس کو اپنے مرتب کئے ہوئے نقشہ کے مطابق آباد کیا شہر کی بنیاد مدور رکھی اور دو فصیلیں بنائیں ایک اندر جو قصر اور کارخانہ جات خلافت کے احاطہ کے لئے تھی دوسرے شہر کے باہر، پھر ایک نہر دجلہ سے اور دوسری فرات کی شاخ کرخایا سے نکال کر شہر میں پہنچائی جن کے ذریعہ سے ہر جگہ پانی بہنے لگا"

مورخ نے یہ بھی سنایا ہے کہ صرف ایک محلہ کرخ میں

"چار نہریں پہنچائی گئیں، نہر دجاج، قلائین، طابق، بزازین (تاریخ امت جلد ۴ ص۵)

اسلامی عہد میں رفاہِ عام کے یہ کارنامے، اس قوم کی تاریخ کا زریں باب ہے، میری حیرت کی تو انتہا نہ رہی جب ابن حوقل کے ان بیانات کو دیکھنے کا موقع ملا اگر یہ تاریخی وثائق، معتبر ذریعوں سے ہم تک نہ پہنچتے تو سچی بات یہ ہے کہ دی ہوئی ان خبروں پر اعتبار کرنا ہی دشوار ہوتا،

"پہاڑوں پر نہروں کا جال" | یعنی اسی ابن حوقل نے، مغرب اقصےٰ کے ایک دور دراز پہاڑی شہر جس کا نام جبل نفوسہ بتایا جاتا ہے اور جس کی چڑھائی تین دن کی ہے، ابن حوقل نے اوپر چڑھ کر جو کچھ دیکھا اس کو بیان کرتے ہوئے اپنے مشہور سیاحت نامہ میں لکھتا ہے

"پانی کی نہروں کا جال وہاں بھی بچھا ہوا ہے شہر کے اطراف بڑے بڑے نخلستانوں سے معمور ہیں جن میں بہترین انگور لگتے ہیں اور انجیر بھی اس علاقہ کے حد سے زیادہ پر مغز ہیں"

(ابن حوقل ص۱۰۶ بحوالہ ہزار سال پہلے)

کوئی وجہ نہیں کہ ابن حوقل کے اس بیان پر اعتماد نہ کیا جائے، جس قوم کو سمجھایا ہی یہی گیا تھا کہ انسانیت کی خدمت سب سے بڑا تمہارا شعار ہے۔ اپنے محدود وسائل و ذرائع کو استعمال میں لاکر اگر انھوں نے پہاڑوں پر بھی نہروں کا جال بچھا دیا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ جو پہاڑوں کو چیر کر، ان کے سینوں میں سے پانی کے مخفی خزانے نکال لائے، اگر وہی بلند بلند پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں پر نہروں کا سلسلہ قایم کردیں تو کیا استعجاب ہے، مسلمانوں نے تو اپنے اس ذوق سے نہ صرف سرد سیر ممالک کو فائدہ پہنچایا بلکہ انھوں نے تو اپنے اس آبی ذوق سے، مغربی افریقہ کے گرم اور حار منطقہ میں بھی نہروں کے یہ سلسلہ قایم کرکے خشک علاقوں کو شاداب و خوش گوار بنا دیا جیسا کہ میری ہی تفصیل سے آیندہ آپ کو معلوم ہوگا

بعض خاص خاص عنوانات کے تحت معلومات کا یہ مختصر سا ذخیرہ جو تاریخ کے صفحات نقل کرکے آپ تک پہنچایا گیا ہے اس سے میں یہی چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے شاندار کارناموں کے حدود دز وایا آپ کے ذہن میں آجائیں۔ کہ کس طرح انھوں نے زرکثیر صرف کیا، کہاں کہاں تک آبی جال بچھائے، اور کس کس طرح انسانوں کے لئے پانی کے ذخیرے عام کردیئے۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں کہ اس تفصیل سے مسلمانوں کے کام کی نوعیت آپ کے ذہنوں میں آچکی ہوگی، اس لئے اب ان نہروں کے کام اور مختصر حالات پڑھئے جو اسلامی عہد میں کھدوائی گئیں اور تیار ہوئیں۔

"نہر معقل"۔ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰؓ کو حکم دیا کہ ایک نہر کھود دی جائے، اور یہ بھی لکھا کہ اس کام پر بطور نگراں کے معقل بن یسارؓ کو متعین کیا جائے اس وجہ سے یہ نہر معقل کی طرف منسوب ہوئی اور اس کا نام ہی نہر معقل مشہور ہوگیا، اور بعض دوسرے لوگوں نے بیان کیا ہے کہ یہ نہر عبدالرحمن بن ابی بکرہؓ کی نگرانی میں تیار ہوئی اور تیار ہونے کے بعد اس کا افتتاح، حضرت معقل بن یسارؓ سے جو صحابی ہیں کرایا گیا اس لئے نہر معقل کے نام سے مشہور ہے۔[عہ] (فتوح البلدان جلد ۲ ص۵۳)

عہ مسلمانوں میں نہروں کے کھدواتے اور رفاہیت عامہ کے اس طرح کے کاموں سے جو عام دلچسپی پیدا ہوگئی تھی یہی وجہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ رفاہ خلق کے کام میری طرف منسوب ہوں چنانچہ اسی نہر کے سلسلہ میں یہ بھی عجیب لطیفہ بلاذری نے لکھا ہے کہ زیاد نے جو معاویہ بن سفیان کی جانب سے بصرہ کا والی تھا ایک شخص کو ہزار درہم دیئے اور کہا کہ دجلہ تک جاؤ اور راستہ میں جو ملے اس سے پوچھو یہ نہر کس نے بنائی ہے، اگر کوئی کہے یہ نہر زیاد نے بنائی ہے تو اسے ہزار درہم دے دینا! وہ شخص دجلہ تک گیا اور واپس آگیا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

نہر دجاجہ | عبد اللہ بن عامر نے اپنی دجاجہ کے نام پر یہ نہر بنوائی اور غیلان بن خرشتہ الضبی کو نگران متعین کیا، حارثہ بن بدر الغدانی نے اسی نہر کے متعلق عبد اللہ بن عامر سے کہا تھا

"میں نے اس سے زیادہ برکت والی نہر نہیں دیکھی، ضعفاء اپنے گھروں کے دروازوں پر اس سے پانی لیتے ہیں یہ ان کے کھیتوں کو پانی دیتی ہے اور ان کے کھیتوں کی پیداوار اس میں بہتی ہوئی ان کے گھروں تک پہنچ جاتی ہے۔" (فتوح البلدان ص۵۵)

نہر مرّہ | مرّہ، عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام اور بڑے فیاض تھے، انھیں مرّہ نے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیاد کے نام ایک سفارشی مکتوب چاہا اور کہا کہ، سرنامہ میں زیاد کا نام لکھدیں۔ ام المومنین نے زیاد کے نام رقعہ لکھ دیا اور مرّہ کی اس میں بے حد توصیف و تعریف کی اور سرنامہ یوں تحریر فرمایا کہ "الی زیاد بن ابی سفیان من عائشہ ام المومنین" جب یہ سفارشی مکتوب زیاد کے پاس پہنچا تو وہ اس کو دیکھ کر بے حد مسرور و خوش ہوا اور ہر شخص کو خط دکھاتا تھا اور کہتا تھا کہ "دیکھو ام المومنین نے اپنے ہاتھ سے یہ خط لکھا ہے اور ابو سفیان سے مجھ کو نسبت دی ہے۔ زیاد مرّہ کے ساتھ بڑے لطف و کرم سے پیش آئے اور نہر الابلہ پر سو جریب زمین جاگیر میں دی اور کہا کہ اپنی زمین میں نہر بناؤ، مرّہ نے یہ نہر بنائی اور انہیں کی طرف منسوب ہوئی۔ (ایضاً ص۵۷)

نہر بشّار | بشّار بن مسلم بن عمرو الباہلی کی طرف منسوب ہے یہ بشّار قتیبہ کا بھائی تھا، اس نے حجاج کو بدلے کے طور پر ایک گھوڑا دیا تھا حجاج نے اس کو سات سو جریب زمین عطا کی، بشّار نے یہ نہر اسی زمین کے لئے بنوائی (ایضاً ص۵۷)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور کہا کہ مجھے جو ملا اس نہر کو نہر معقل ہی کہتا تھا، زیاد نے یہ سن کر کہا کہ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء یعنی یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے"، رفاہیت عامہ کے امور سے دلچسپی جس حد تک مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس قسم کے واقعات سے خوب کیا جا سکتا ہے"۔ منہ

عہ بلاذری ہی میں ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا قرآن شریف پڑھتی تھیں مگر لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ دیکھو بلاذری ص۳ زیاد نے نامہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مکتوب کو جو کسی دوسرے سے لکھوایا گیا تھا، عائشہ کی طرف منسوب کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خط حفصؓ یا ام کلثومؓ سے لکھوایا گیا ہے کہ یہ دونوں بھی جانتی تھیں۔

نہر مسلم | مسلم بن زیاد بن ابی سفیان کی طرف منسوب ہے۔

نہر نافذ | عبداللہ بن عامر نے بنوائی تھی اور اپنے آزاد کردہ غلام نافذ کو اس کا متولی کیا تھا اس وجہ سے یہ نہر نافذ کی طرف منسوب ہوئی۔ (ایضاً ص۵۶)

نہر البنات | البلاذری نے کہا ہے کہ یہ زیاد کی بیٹیوں کی طرف منسوب ہے، زیاد نے اپنی ہر بیٹی کو ۶۰ جریب زمین دی تھی اور انھوں نے یہ نہر بنوائی۔ (ایضاً ص۶۱)

نہر سعید الخیر | سعید بن عبدالملک بن مروان جو سعید الخیر کے نام سے شہرت یافتہ ہیں بڑے زاہد دنیا کیا زآدمی تھے، الولید نے زمین ان کو جاگیر میں دی اور انھوں نے یہاں پر یہ نہر کھدوائی، یہاں پر سعید نے کچھ عمارتیں بھی بنوائی تھیں، بقول بلاذری جو

"اب تک موجود ہیں" (ایضاً جلد ا ص۲۹۵)

النہی والمری | ہشام بن عبدالملک نے رصافہ آباد کیا تو وہاں پر یہ دو نہریں بنوائیں اور ان سے جاگیروں کو قابل زراعت بنایا (ایضاً ص۲۹۵)

نہر سعد بن عمرو بن حسام | الانبار کے دہقانوں نے سعد بن ابی وقاص سے درخواست کی کہ وہ ان کے لئے نہر کھدوادیں اسی قسم کی درخواست الانبار کے دہقان، عظیم الفرس (کسریٰ) سے بھی کرچکے تھے، سعد نے سعد بن عمرو بن حرام کو لکھا کہ الانبار کے دہقانوں کے لئے نہر کھدواؤ، انھوں نے اس کام کے لئے مزدوروں کو جمع کیا اور کھدائی کا کام شروع ہوا یہاں تک کہ وہ ایک پہاڑ پر پہنچے جسے شق کرنا ممکن نہ ہوا، اس لئے کام بند کردیا گیا، پھر جب حجاج، عراق کا گورنر ہوا تو اس نے ہر طرف سے لوگوں کو جمع کیا اور اپنے انجنیروں کو حکم دیا کہ کھودنے والوں میں سے ہر شخص جتنا کھاتا ہے اس کی قیمت کا اندازہ کرو اگر اس کی خوراک اس کے روزانہ کام کے برابر ہو تو کام کو جاری رکھو! اس کام پر روپیہ برابر خرچ ہوتا رہا یہاں تک کہ پہاڑ کو چیر کر نہر نکال لی گئی، بعد میں یہ پہاڑ، حجاج کی طرف منسوب ہوا اور نہر سعد بن عمرو بن حسام کے نام سے مشہور ہوئی۔ (ایضاً ص۲۷۳)

(باقی آئندہ)

ادبیات

نذرِ عقیدت

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومتِ ہند کے انتقال پُر ملال پر

از

(جناب فانی مرادآبادی - لائل پور)

خلق و احسان کا پیغام رساں تھا آزاد
اپنے اجداد کی عظمت کا نشاں تھا آزاد

جاں نثارِ ادب و شعر و زباں تھا آزاد
تاجِ اُردو کے لئے لعلِ گراں تھا آزاد

اُس کے اُٹھ جانے سے ہے بزمِ شرافت تاریک
ماہِ کامل کی طرح جلوہ فشاں تھا آزاد

نہ رہا وہ تو یہ معلوم ہوا دُنیا کو
مخزنِ علم کا ایک نقدِ گراں تھا آزاد

وجد میں آ گئے۔ اپنے بھی۔ بیگانے بھی
سازِ اخلاق پہ یوں نغمہ فشاں تھا آزاد

یوں تو ہم عصر تھے اربابِ سخن اور مگر
ہے خدا لگتی کہ ممتازِ جہاں تھا آزاد

پاک دل - پاک نظر - پاک نفس - پاک نہاد
فخرِ دیں - فخرِ وطن - فخرِ جہاں تھا آزاد

خادمِ علم و ادب اور بھی ہیں دنیا میں
یہ حقیقت ہے مگر سنگِ نشاں تھا آزاد

صدیوں کے بعد ہوا کرتا ہے جو بے پردہ
اک وہ اندازِ جہانِ گزراں تھا آزاد

اُس کی خدمات میں ہیں نقوش حقائق کے نشاں
کون کہتا ہے فقط وہم و گماں تھا آزاد

جس پہ اخلاقِ کریمانہ تصدق ہو جائے
وہی انداز - وہی حُسنِ بیاں تھا آزاد

رام کر لیتا تھا جو دشمنِ جاں کے دل کو
ایک ایسا اثرِ سوزِ نہاں تھا آزاد

ایسے بے لوث بشر اب نہیں ملتے فانی
بے نیازِ اثرِ سود و زیاں تھا آزاد

غزل

(جناب الم مظفر نگری)

الم آدابِ ضبطِ غم سے جو معذور ہو جائیں
انا الحق کہہ کے وہ ہم مشربِ منصور ہو جائیں

اگر آنکھیں حریفِ جلوہ گاہِ نور ہو جائیں
نظر کے سامنے بے پردہ لاکھوں طور ہو جائیں

تعین کی حدوں سے وہ اگر کچھ دور ہو جائیں
تو بزمِ زندگی کی رونقیں بے نور ہو جائیں

ادب ہے یہ بھی اک منجملۂ آدابِ مے نوشی
تری محفل میں ساقی بے پیئے مخمور ہو جائیں

سمجھ لو انقلاب آنے کو ہے کوئی زمانے میں
جب ہم فریاد کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں

مذاقِ خود روی گر رہبرِ منزل نہ بن جائے
بھٹک کر قافلے منزل سے کوسوں دور ہو جائیں

ازل میں ہو چکا ہے طے کہ جو آئینِ فطرت ہیں
وہی سب زندگیِ عشق کے دستور ہو جائیں

ٹھہر اے دل بڑھیں گے جلوہ گاہِ ناز تک اُن کی
ذرا پہلے ہم آگاہِ مذاقِ طور ہو جائیں

یہ ہے کیا راز جس محفل میں وہ ہوتے ہیں بے پردہ
وہیں پھر منہ چھپانے کے لئے مجبور ہو جائیں

بہار آئی ہے اس کے خیر مقدم کے لئے ساقی
مے گلرنگ سے جام و سبو معمور ہو جائیں

جو مستی میں انا الموجود کہہ اُٹھوں کسی دن میں
مرے نالے جوابِ نالۂ منصور ہو جائیں

وہ جلوے ہیں فریبِ جلوہ در پردۂ ہستی میں
عیاں ہو کر جو ہر پردے سے پھر مستور ہو جائیں

نظر پڑنے لگے ان پر نہ کیوں اہلِ زمانہ کی
الم کی طرح جو اربابِ فن مشہور ہو جائیں

تبصرے

دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب از شیخ محمد معین السندی (عربی)

تقطیع متوسط ضخامت ۴۷۲ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد بارہ روپیہ پتہ: لجنۃ احیاء الادب السندی - بندر روڈ کراچی (پاکستان)

سندھ ایک مدت تک اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا ہے اور اس سرزمین سے بڑے بڑے علماء فضلا۔ شعراء اور ادبا پیدا ہوئے ہیں لیکن ان حضرات کی علمی اور ادبی یادگاریں گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں یہاں تک کہ سندھ کے علاوہ دوسرے علاقوں کے لوگوں کو ان میں سے اکثر حضرات کے نام بھی معلوم نہیں ہوں گے اس بنا پر ضرورت تھی کہ ایک ایسا ادارہ قایم کیا جاتا جو ان یادگاروں کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کرتا اور اہلِ علم اُن سے متعارف و مستفیض ہوتے۔ خوشی کی بات ہے کہ لجنۃ احیاء الادب السندی کا قیام اسی غرض کے لئے ہوا ہے اور اُس نے عربی، فارسی اور اُردو میں سندھ کے ارباب علم و فضل کی باقیات صالحات کو بڑے اہتمام و انتظام کے ساتھ شائع کرنے کا ایک وسیع پروگرام بنایا ہے جس پر وہ مقامی حکومت کی امداد و اعانت سے سرگرمی کے ساتھ گامزن ہے۔ زیر تبصرہ کتاب عربی مطبوعات کے سلسلہ کی پہلی اور عام ترتیب کے اعتبار سے پانچویں کتاب ہے جو اس انجمن کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف شیخ محمد معین السندی ہیں جو بارہویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔ ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی۔ موصوف نے اپنے شیوخ اور اساتذہ کی فہرست میں حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کو بھی شمار کیا ہے۔ عربی اور فارسی زبان و ادب اور اسلامی علوم و فنون کے بڑے فاضل اور کثیر التصانیف تھے اُن کے والد محمد امین خود بڑے عالم اور اپنے عہد کے مشہور فاضل تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ والد کے کٹر حنفی ہونے کے باوجود شیخ محمد معین

سخت قسم کے غیر مقلد یا آج کل کی اصطلاح میں اہلِ حدیث ہو گئے چنانچہ موصوف کی یہ کتاب جو بارہ ابواب (دراسات) پر مشتمل ہے اسی موضوع پر ہے اس میں انھوں نے تقلید شخصی کی سخت مخالفت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی امام کے قول پر عمل کرنے کے بجائے حدیث صحیح پر عمل کرنا ہی صواب اور درست ہے اگرچہ مصنف کے اس دعوی سے تقلید شخصی کا عدم جواز ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جس امام کے قول پر عمل کیا جاتا ہے وہ لامحالہ استنباطِ احکام کے اصولِ اربعہ میں سے کسی ایک اصل پر ہی مبنی ہوتا ہے اور اس کا کوئی قائل نہیں ہے کہ کسی امام کے قول کو جو کسی اصلِ شرعی پر مبنی نہ ہو بہرحال صحیح حدیث پر ترجیح دینی چاہیے لیکن بہرحال چوں کہ یہ کتاب تقلیدِ شخصی کی مخالفت اور انکار میں لکھی گئی ہے اس بنا پر نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلاء میں اس کی بڑی تعریف کی ہے اور مولانا سید نذیر حسین الدہلوی نے اپنا ایک آدمی لاہور بھیج کر ۱۲۸۴ھ میں اس کتاب کو وہاں سے پہلی مرتبہ شائع کرایا۔ اگر معاملہ صرف تقلید کی مخالفت تک محدود رہتا تو پھر بھی غنیمت تھا، لیکن افسوس یہ ہے کہ مصنف کے افکار و خیالات نہایت پراگندہ اور منتشر ہیں۔ ایک طرف وہ عمل بالحدیث پر اس قدر زور دیتے ہیں اور دوسری جانب حضرت علی اور حضرت فاطمہ نے حضرت ابوبکر صدیق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ کا جو مطالبہ کیا تھا اور جس کو حضرت ابوبکر نے "نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" والی حدیث سنا کر رد کر دیا تھا۔ مصنف اس مطالبہ کو صحیح قرار دیتے ہیں اور اس کی دلیل صرف یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ معصوم تھے اس بنا پر ان سے غلطی نہیں ہو سکتی اور حضرت ابوبکر اس معاملہ میں حق پر نہیں تھے۔ پھر صرف یہی نہیں بلکہ مصنف کی رائے میں وہ تمام صحابہ جنھوں نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ کی مخالفت کی سب خطا پر تھے اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ ہی نہیں بلکہ بارہ کے بارہ امام سب معصوم ہیں۔ مصنف نے یہ ساری بحث کتاب کے صفحہ ۴۱۲ سے ۴۳۴ تک کی ہے اور اس میں کوئی علمی اور منطقی بات نہیں کہی بلکہ جو کچھ لکھا ہے خالص جذباتی انداز میں لکھا ہے۔ علاوہ بریں مصنف نے غضب یہ کیا ہے کہ لکھتے ہیں "صدر من الخاطئ المہدی مستحیل" اس کے علاوہ بعض شیعی

حضرات کے ہاں جو عقیدہ الرجعت پایا جاتا ہے مصنف نے اس کو بھی صحیح بتایا ہے۔ محرم کے مہینہ میں تعزیہ داری اور سیاہ لباس پہننا مصنف اس کو بھی درست بتاتے ہیں اور اسد الغابہ کے حوالہ سے دلیل یہ ہے کہ امام حسن کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے سوگ منایا اور سیاہ لباس پہنا تھا اور حضرت امام حسین نے لوگوں کو اس سے منع نہیں فرمایا۔ مصنف اجماع کے حجت ہونے کا بھی قائل نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک ائمۂ اہلبیت میں سے کسی امام کے بغیر اجماع کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ دو نمازوں کے درمیان مطلقاً جمع کرنا بھی درست ہے۔ اہلبیت نبوی میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلبی اولاد شامل ہے۔ ازواجِ مطہرات ان میں داخل نہیں۔ غرض کہ یہ اور اسی قسم کی لغو اور غلط باتیں اس کتاب میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود مصنف کے دو ہم عصر فاضلوں مولانا عبد اللطیف ٹھٹوی اور ان کے فرزند مولانا ابراہیم نے علی الترتیب "ذب ذبابات الدراسات" اور "القسطاس المستقیم" لکھ کر مصنف کا سخت رد کیا اور اس کی رکاکت کا پردہ اسی زمانہ میں فاش کیا تھا۔ ان میں سے اول الذکر کافی ضخیم کتاب ہے اور لجنۃ کا ارادہ اس کتاب کو بھی شائع کرنے کا ہے۔ مولانا عبد الحئی صاحب فرنگی محلی اور دوسرے علماء اعلام نے بھی مصنف کی شدید مذمت کی ہے۔ اگرچہ کتاب کے لغو ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا لیکن چوں کہ لجنۃ اس کا مفصل رد یعنی "ذب" بھی شائع کر رہی ہے اس لئے دونوں کتابوں کو پڑھنے کے بعد ایک طالبِ تحقیق علی وجہ البصیرت حق اور باطل کا فیصلہ کر سکتا ہے اور غالباً لجنۃ کا مقصد بھی اس کتاب کی اشاعت سے یہی ہے۔ کتاب کے آخر میں مختلف فہرستیں ہیں اور اس کے بعد مولانا عبد الرشید نعمانی کے قلم سے عربی زبان میں ہی تقریباً سو صفحات کا ایک مقدمہ ہے جس میں مصنف کے حالات و سوانح۔ شیوخ و تلامذہ۔ تصنیفات و تالیفات اور اُن کے متعلق علماء کی مختلف آرا ان سب کا تذکرہ فاضلانہ انداز میں کیا گیا ہے علمی اعتبار سے یہ مقدمہ اصل کتاب سے کہیں زیادہ وقیع اور معلومات آفریں ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ حواشی بھی ہیں جو مفید ہیں۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ اُن کو حضرت شاہ ولی اللہ سے تلمذ ہے لیکن یہ دعویٰ بہت کچھ محلِ نظر اور ثبوت طلب ہے اور اس پر مستقل بحث کی ضرورت ہے

مقالات الشعرا از میر علی شیر قانع ٹھٹوی تقطیع متوسط ضخامت ۱۰۹۶ صفحات زبان فارسی ٹائپ جلی اور روشن۔ قیمت مجلد عنہ۲ روپیہ۔

یہ کتاب بھی لجنۃ احیاء الادب السندی نے بڑے اہتمام و انتظام سے شائع کی ہے میر علی شیر قانع سندھ کا مشہور فاضل اور کثیر التصانیف مصنف ہے تحفۃ الکرام اُس کی مشہور کتاب ہے موصوف نے شعرائے سندھ کا ایک نہایت ضخیم تذکرہ بھی لکھا تھا جس میں سندھ کے "سات سو انتیس" فارسی کے شاعروں کے حالات اور اُن کے کلام کے نمونے درج کئے تھے۔ اس موضوع پر اگرچہ پہلے بھی دو تین کتابیں لکھی جا چکی تھیں لیکن اول تو وہ اس قدر مبسوط و مفصل نہیں تھیں اور پھر وہ دستیاب بھی نہیں ہیں اس بنا پر اس کو اپنے موضوع پر پہلی کتاب سمجھنا چاہیئے کتاب کا نام مقالات الشعرا تاریخی نام ہے۔ سید حسام الدین صاحب راشدی نے اس کو بڑی محنت اور قابلیت کے ساتھ اڈٹ کیا ہے اور اس پر مقدمہ اور حواشی لکھے ہیں جو معلومات آفریں اور محققانہ ہیں اس کے علاوہ کتاب میں آرٹ پیپر پر چونتیس ۳۴ تصویریں بھی ہیں جو تاریخی طور پر بجائے خود نہایت اہم اور نادر ہیں، آخر کتاب میں متعدد فہرستیں مآخذ کی اور اسماء و اعلام کی ہیں، مصنف نے شعرا کے ساتھ ساتھ کسی ایک مناسبت سے بعض ایسے لوگوں کا بھی تذکرہ کر دیا ہے جو شاعر نہیں تھے مثلاً جلال الدین اکبر بادشاہ یا شاعر تھے مگر اُن کو سندھ سے بہت دور کی نسبت تھی مثلاً میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ بابر ظہیر الدین بادشاہ۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں یہ تذکرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس بنا پر لجنہ اس کی اشاعت پر اور وہ بھی با ایں اہتمام و انتظام لائق مبارکباد ہے امید ہے کہ ارباب علم و ذوق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

بیان بابت ملکیت وتفصیلات متعلقہ ماہنامہ برہان دہلی

جو ہر سال ختم فروری کے بعد سب سے پہلی اشاعت میں چھپے گا

فارم چہارم

(دیکھو قاعدہ ۸)

۱۔ مقامِ اشاعت	اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
۲۔ وقفۂ اشاعت	ماہانہ
۳۔ طابع کا نام	حکیم مولوی محمد ظفر احمد
قومیت	ہندستانی
سکونت	اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
۴۔ ناشر کا نام	حکیم مولوی محمد ظفر احمد
قومیت	ہندستانی
سکونت	اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
۵۔ ایڈیٹر کا نام	مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ ایم۔ اے
قومیت	ہندستانی
سکونت	۱۰۔ حاجی محمد محسن روڈ۔ کلکتہ ۱۶
۶۔ مالک	ندوۃ المصنفین۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶

میں محمد ظفر احمد ذریعہ ہذا اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔

مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۵۸ء   دستخط ناشر   محمد ظفر احمد عثمانی

برہان

جلد ۴۰ — شمارہ ۴

اپریل ۱۹۵۸ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق بھی پچھلے دنوں ستاون ۵۷ برس کی عمر میں راہی ملک
بقا ہوگئے۔ شمالی ہند کے عوام میں تو کم ہی لوگ ہوں گے جو مرحوم کو جانتے ہوں۔ البتہ جنوبی ہند
میں ایک ایک بچہ اُن سے واقف تھا اور مسلمان تو اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ جنوبی ہند کے "سر سید"
کہلاتے تھے۔ کیوں کہ انھوں نے مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کے سات اسکول اور کالج مدراس میں
اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ علوم قدیمہ وجدیدہ دونوں کے متبحر عالم تھے۔ پہلے کانپور کے ایک مدرسہ
میں درس نظامی کی باقاعدہ تکمیل کی اور اس کے بعد انگریزی کے امتحانات کی طرف متوجہ ہوئے
تو آکسفرڈ یونیورسٹی سے ڈی فل کرکے ہی دم لیا۔ واپسی پر پہلے محمڈن کالج مدراس کے پروفیسر عربی اور
پھر پرنسپل مقرر ہوئے اس کے بعد مدراس کے گورنمنٹ پریسیڈنسی کالج کے پرنسپل ہوئے۔ یہاں
سے پنشن لینے کے بعد مدراس کے پبلک سروس کمیشن کے ممبر اور آخر میں صدر بھی ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ
نے مرحوم کو علمی اور عملی دونوں قسم کے کمالات سے نوازا تھا علوم قدیمہ وجدیدہ کے نامور فاضل ہونے
کے ساتھ صورۃً وسیرۃً نہایت راسخ العقیدہ مسلمان اور سچ مچ ایک مومن قانت تھے نہایت جری
اور دبنگ تھے حق بات کے کہنے اور کرنے میں کسی کی ذرا پروا نہیں کرتے تھے۔ برہان کے شروع سے
خریدار اور ندوۃ المصنفین کے بڑے قدردان تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کچھ دنوں پرو وائس چانسلر
بھی رہے تھے۔ انھیں دنوں میں کلکتہ یونیورسٹی کی ایک ضرورت سے کلکتہ تشریف لائے تو دیرینہ
تعلق کے پاس خاطر سے غریب خانہ کو بھی شرف قدوم سے نوازا۔ ملاقات ہوئی اور شرف ہم طعامی
بھی حاصل ہوا۔ اس کے بعد مرحوم نے علی گڈھ میں مسلمان طلباء کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں
جو اقدامات کئے تھے وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ سنانے شروع کئے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ یہ
روئداد سنتے سنتے بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ "تو بس ڈاکٹر صاحب! آپ گئے اب علی گڈھ

میں نہیں رہ سکتے" مرحوم نے پوچھا "آخر کیسے ؟" میں نے عرض کیا "میں نے جو کچھ کہا ہے اُس کو مجذوب کی ایک بڑ سمجھئے۔ اور مجذوب کا حال یہ ہے کہ بات تو پتہ کی کہتا ہے۔ لیکن "کیوں" اور "کیسے" سے واسطہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم علی گڈھ پہنچے اور وہاں سے غالباً ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی واپس ہو گئے۔ مدراس پہنچ کر مرحوم نے مجھ کو لکھا "میں آپ کے علمی اور ادبی کمالات کا تو پہلے سے معترف تھا مگر اب آپ کی ولایت کا بھی قائل ہو گیا۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ" مرحوم اس زمانہ میں "دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر انیست" کا سب سے بہتر نمونہ تھے۔ پورے ہند و پاک میں ان جیسے لوگ کم ہی ملیں گے، حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور اُن کی قبر ٹھنڈی رکھے۔ آمین۔

ڈاکٹر عبدالکریم گرمانوس ہنگری کے مشہور مستشرق اور اسلامیات کے نامور فاضل اور محقق ہیں۔ ایک ربع صدی قبل وسوا بھارتی (شانتی نکیتن) میں اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے کئی سال تک مقیم رہ چکے ہیں۔ اسی زمانہ میں دلی کی جامع مسجد میں مشرف باسلام ہوئے۔ اب آج کل ان کے بقول پورے ملک ہنگری میں وہ اور ان کی بیوی بس یہ دونوں ہی تنہا مسلمان ہیں۔ اسلام کی وجہ سے ہنگری کے گذشتہ انقلاب میں دونوں کو کچھ سختیاں بھی جھیلنی پڑیں۔ لیکن انھوں نے ذرا پروانہ کی اور دین قیم پر قائم رہے۔ پچھلے دنوں حکومتِ ہند کی دعوت پر سرکاری مہمان کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے مع اپنی بیوی کے ملک کے مختلف بڑے بڑے شہروں اور یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور ہر جگہ اسلامیات یا عربی زبان و ادب پر لکچر دیئے۔ اسی سلسلہ میں موصوف کلکتہ بھی آئے تھے اور یہاں یونیورسٹی میں جدید عربی ادب پر چار لکچر دیئے۔ ایک دن مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے اساتذہ اور طلباء کو خاص مصری لب و لہجہ میں عربی میں خطاب کیا۔ موصوف کا کلکتہ میں قیام چار روز رہا اس لئے ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور اطمینان سے گفتگو کرنے کا کافی موقع ملا۔ موصوف کی عمر تہتّر سال ہے۔

لیکن صحت اور توانائی۔ شگفتہ روئی اور خندہ جبینی کی وجہ سے بالکل ۳۵ یا ۴۰ برس کے معلوم ہوتے ہیں۔ اس عمر میں بھی آج کل چودہ گھنٹہ روزانہ ان کے کام کا اوسط رہتا ہے علم و فضل کے علاوہ ہفت زبانی کا یہ عالم ہے کہ جرمنی، فرانسیسی، عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ انگریزی اور ہنگری ان سب زبانوں سے نہ صرف یہ کہ واقف ہیں بلکہ اُن میں بے تکلف تقریر کر سکتے ہیں اور ان زبانوں کے مصنف ہیں۔ آج کل جدید عربی ادب کی تاریخ جرمنی زبان میں لکھ رہے ہیں پانسو صفحہ کی پہلی جلد لکھی جا چکی ہے۔ اسی ضخامت کی ابھی دو جلدیں اور لکھی جائیں گی۔ ڈاکٹر گرمانوس کو دیکھ کر اس لحاظ سے بڑی حسرت ہوئی کہ ایک ہم ہیں کہ یہاں خالص علمی زندگی بسر کرنے کے معنی ہیں خودکشی کرنا۔ نہ اُس کی صحت درست۔ نہ معاشی اطمینان اسے حاصل۔ نہ قوم میں اُس کی پوچھ اور نہ حکومت میں اُس کا وقار۔ لیکن اس کے برخلاف ایک یہ لوگ ہیں کہ نفس مطمئنہ کی دولت و سعادت انھیں حاصل ہے۔ اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر شب و روز علمی تحقیق و اکتشاف کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس تہتر برس کی عمر میں بھی موصوف میں وہ چستی۔ پھرتی۔ انرجی اور کام کرنے کی طاقت ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر گرمانوس ہی سے یہ معلوم ہوا کہ اُن کی بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں تر سٹھ لڑکیاں اور لڑکے ہیں جنہوں نے بی۔ اے میں اسلامی تاریخ کا مضمون لے رکھا ہے اور تین طلباء ہیں جو عربی ادب میں یونیورسٹی کے سب سے بڑے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں! کوئی بتائے کہ ان مضمونوں میں طلباء کی اتنی بڑی تعداد ہند کی کسی یونیورسٹی میں بھی ہے؟ جہاں اب بھی مسلمان ساڑھے چار کروڑ کی تعداد میں موجود ہیں۔ افسوس!

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس   ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

پچھلے دنوں کلکتہ میں جو آل انڈیا لنگویج کانفرنس ہوئی۔ اور اس کے بعد مغربی بنگال کی اسمبلی میں زبان سے متعلق ریاست کے وزیر اعظم ڈاکٹر رائے نے خصوصاً اور دوسرے ممبران

نے عموماً جو تقریریں کیں ان سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ ہندی کی شدید مخالفت کا حلقہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور حلقہ کی وسعت کے ساتھ مخالفت کے لب و لہجہ میں بھی غیظ و غضب اور نفرت و عداوت کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی تقریروں میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہندی ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں غیر ترقی یافتہ ہے۔ اقلیت یعنی صرف ۴۲ فی صدی آدمیوں کی زبان ہے۔ اور اگر انگریزی غیر ملکی زبان ہے تو ہند کی اکثر آبادی کے لئے ہندی بھی ایسی ہی ایک اجنبی زبان ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہندی ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ ۱۹۶۵ء میں انگریزی کی جگہ لے اور ملک کی سرکاری زبان بنے۔ اب اس فضا اور اس ماحول میں غریب اردو کے لئے بجز اس کے کیا چارہ ہے کہ اپنی بہن کے عاقبت نااندیش پجاریوں کو خطاب کر کے کہے۔

توبخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

"ندوۃ المصنفین کی تازہ ترین کتاب"

"صدیق اکبر رضی اللہ عنہ"

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نہایت مفصل و مبسوط اور محققانہ تذکرہ جس میں آپ کے حالات و سوانح، عظیم الشان کارناموں، دینی اور سیاسی خدمات، مکارم و اخلاق اور عہدِ صدیقی کے تمام واقعات کے علاوہ اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی مباحث و مسائل پر سیر حاصل کلام کیا ہے۔ "صدیق اکبر" اپنے اسلوب بیان اور انداز تحقیق کے اعتبار سے ایک لاثانی کتاب ہے جس کی خصوصیتوں کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

صفحات تقریباً ۵۰۰ بڑی تقطیع کتابت و طباعت نہایت نفیس و دیدہ زیب۔
قیمت غیر مجلد سات روپے۔ مجلد آٹھ روپے۔

اسلامی صنائع لطیفہ اور یورپی صنائع پر ان کا اثر

از
(اے ایچ کرسٹی)
مترجمہ
(جناب سید مبارز الدین صاحب رفعتؔ، لکچرر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس گلبرگہ)

(۳)

شام کے زجاج کاروں کا سب سے بڑا کارنامہ چراغ یا شمع دان بنانا تھا۔ ان شمع دانوں کے اندر تیل رکھنے کے چھوٹے چھوٹے ظروف کو ایک حلقہ میں بٹھا کر چاندی یا پیتل کی زنجیروں کے ذریعہ آویزاں کیا جاتا ہے۔ یہ زنجیریں شمع دان کے جسم سے کڑیوں کے ذریعہ وابستہ رہتی ہیں۔ اس طرح روشن ہو کر یہ شمع دان بہت سی عظیم الشان مسجدوں کی تاریکی میں جواہرات کی سی آب و تاب کے ساتھ جگمگاتے تھے انہیں عام طور پر پٹیوں کے کام سے سجایا جاتا ہے پھر ان پٹیوں میں دائرے اور کتبے ہوتے ہیں ان پر رسمی گل کاری ہوتی ہے اس طرح کا ایک شمع دان دار الآثار العربیہ قاہرہ میں محفوظ ہے۔ یہ شام کا بنا ہوا چودھویں صدی کا شمع دان ہے۔ ایسا ہی ایک اور شمع دان لاورے کے عجائب گھر میں محفوظ ہے لیکن اس شمع دان کے اوپر کسی نامعلوم مسجد کے لئے اس شمع دان کو وقف کرنے والے کا نام اس کے خاندانی نشان کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

مسلمان امرا ایک قدیم مشرقی روایت کی اتباع میں اپنی مملوکہ اشیاء پر عام طور پر اپنے خاندان کے مخصوص نشان بنوانے لگے اس طرح کی علامات نے مغربی خاندانی نشانوں کو متاثر کیا اور حروب صلیبیہ کے دنوں میں ان نشانوں نے ترقی کر کے اپنی خاص فنی اصطلاحوں کے ساتھ ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی۔ اس فن میں نیلے رنگ کے لئے "AZURE" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے یہ لفظ فارسی لفظ "لاجورد" سے لیا گیا ہے جو نیلے رنگ کے ایک پتھر کا مترادف ہے یورپی اور مشرقی خاندانی نشانات کے سلسلہ میں اور بھی دلچسپ کڑیاں ملتی ہیں جیسے دوہرے سر والے عقاب کی عجیب و غریب شکل جو پہلی بار قدیم زمانے کے حتیوں کے آثار پر ملتی ہے اس شکل کو بارھویں صدی کی ابتدا میں

سلجوق سلطان نے اپنا نشان بنایا اور چودھویں صدی میں مقدس رومی شہنشاہوں نے اسے اپنے شعار کے طور پر اختیار کیا۔

مسلمانوں کے خاندانی نشان سپر بناکر حلقوں کی صورت میں بنائے گئے ہیں بالکل اسی طرح جیسے کرلادرے کے عجائب گھر والے شمع دان پر خاندانی نشان بنا ہوا ہے یا پھر یہ نشان نوک دار شکل میں نچلے حصہ پر بنے ہیں جیسا کہ برٹش میوزیم کی لمبی گردن والی صراحی پر بنا ہوا خاندانی نشان مینا کاری میں بنایا گیا ہے رمز یہ پرندوں اور درندوں کے سوا اور بھی مختلف قسم کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ عقاب کی شکل بہت عام تھی۔ شیر کی شکل کو مملوک سلطان بیبرس نے اختیار کیا تھا۔ دوسری شکلوں میں کچھ شکلیں دربار کی بعض خدمات سے وابستہ تھیں جیسے جام بردار، داروغہ چوگان اور فوج کے مختلف شعبوں کے صدور۔ یہ شکلیں اپنے عہدے کا اظہار کرتی ہیں۔

یہاں ہم ایسی چند شکلیں پیش کر رہے ہیں۔ ان شکلوں میں ساغر نما پیالے اور چوگان کے معنیٰ تو واضح ہیں لیکن آخری شکل بہت دنوں تک حیران کن مسئلہ بنی رہی کبھی تو خیال کیا گیا کہ قدیم مصری خط تصویر کی یہ اسلامی آرٹ میں تنہا باقیات ہے لیکن اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ قلم دان کا نقشہ ہے جو اندرونی تنصیبات

دکھارہا ہے جس کا نقشہ ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔

لمبی گردن والی صراحی کے اوپر جو نوک دار سپر بنا ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک شخصی نشان (یعنی عقاب) سرکاری نشان کے ساتھ بھی ظاہر ہوتا ہے مسلمانوں کے خاندانی نشانات کو جن ذرائع سے ظاہر کیا جاتا تھا وہ اگر اجازت دیتے تو ہمیشہ روشن رنگوں میں بنائے جاتے تھے کیونکہ امراء کے مخصوص رنگ بھی ان کے خاندانی نشان کا اہم جزء ہوتے تھے۔

اب ہم پارچہ بافی کی صنعت کو لیتے ہیں ایران، شام اور مصر کو جب عربوں نے فتح کیا ہے اس وقت

ان ملکوں میں پارچہ بافی کی صنعت انتہائی ترقی یافتہ فنی کا درجہ حاصل کر چکی تھی ان ملکوں سے متصل بازنطینی سلطنت کے صوبوں میں پارچہ بافی کے اہم مراکز قائم تھے اور ان میں حیرت انگیز نفاست کے ساتھ ریشم و حریر کے پارچے بنے جا رہے تھے۔ ان مرکزوں کے نصرانیوں نے جب اپنے ہمسایوں کی صناعی کی نقل شروع کی تو انھوں نے اپنے نمونوں میں بہت سے ساسانی عوامل کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اگرچہ رسول اللہ صلعم نے واضح طور پر ریشم کے استعمال پر (مردوں کے لئے) تحدید عائد کر دی تھی لیکن مسلمانوں نے نہ صرف ان ملکوں میں موجود ریشم کی کارگاہوں کی ہمت افزائی کی بلکہ جہاں کہیں بھی وہ گئے وہاں انھوں نے اس کے کارخانے قائم کئے۔ اس متوع مال تعیش سے ان کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ جلد ہی انھوں نے قرون وسطیٰ کے ریشم و حریر بننے والوں میں سب سے ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔ قرون وسطیٰ میں یہ کپڑے جن ناموں سے یاد کئے جاتے تھے جو تجارتی اصطلاحیں ان کے لئے استعمال کی جاتی تھیں اور جن میں سے بعض آج تک بھی باقی چلی آ رہی ہیں ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ ان سے اب دور دراز مقاموں کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں ابتداً میں بعض خاص قسم کے کپڑے بنے جاتے تھے یا ان منڈیوں کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں سے یہ کپڑے حاصل کئے جاتے تھے۔ انگریز شاعر چاسر کے عہد میں جو کپڑا "فسطیان" (FUSTIAN) کہلاتا تھا مصر کے پہلے اسلامی دار الحکومت فسطاط سے آتا تھا آج ہم جن کپڑوں کو "ڈمسک" (DAMASK) کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ دمشق ہے جو تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا اور مغرب نے بہت سی چیزوں کو اس سے منسوب کر دیا تھا جو خاص طور پر وہاں تیار نہیں ہوتی تھیں۔ انگریزی زبان میں ململ کے لئے (MUSLIN) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اطالوی تاجر موصل سے جو کپڑا لاتے تھے اسے وہ MUSSOLINA کہتے تھے MUSLIN کا لفظ اطالوی تاجروں کی اسی اصطلاح سے انگریزی میں آیا ہے۔ بغداد کو اہل اطالیہ BALDACCO کہتے تھے۔ بغداد سے جو ریشمی کپڑے لائے جاتے تھے ان کو یہی نام دیا جاتا تھا علاوہ ازیں بعض کلیساؤں کی قربان گاہوں پر جو ریشمی چتر آویزاں کئے جاتے تھے وہ BALDACCHINO کہلاتے تھے بعد کے عہدوں میں جو کپڑے غرناطہ سے آتے تھے وہ یورپ کی دکانوں میں GRENADINES کے نام سے بکتے تھے ان دکانوں میں خواتین ایرانی تافتہ TAFTA

کے نام سے خریدتی تھیں۔

بغداد کا ایک محلہ تھا عتابیہ۔ یہاں عتاب کی آل و اولاد رہا کرتی تھی جو رسول اللہ (صلعم) کے ایک صحابی کے پڑپوتے تھے۔ بارھویں صدی میں یہ محلہ ایک خاص قسم کے کپڑے کے لئے بہت مشہور ہو گیا تھا۔ اس کپڑے کی اندلس میں نقل ہوتی تھی اور وہاں یہ کپڑا 'حریر العتابی' کہلاتا تھا۔ اندلس اور اطالیہ نے اسے "تابس" (Tabis) کے نام سے جانا اور اسی تجارتی نام سے یہ کپڑا پورے یورپ میں مقبول ہوا۔ انگریزی زبان کے مشہور ڈائری نگار سموئل پیپس (S. Pepys) نے اتوار نومبر ۱۶۶۱ء کو اپنی ڈائری میں درج کیا ہے: "آج میں نے سنہری جھالر لگی ہوئی جھوٹے 'ٹیابی' (Tabis) کی صدری پہنی۔" ظاہر ہے یہ لکھتے وقت وہ اس لفظ کی قدیم تاریخ سے ناآشنا تھا۔ ۱۷۸۶ء میں مس برنی (Miss Burney) نے قصر ونڈسر میں منعقدہ جشن سالگرہ شاہانہ میں 'لیلک ٹیابی' (lilac Tabby) کا گون پہن کر شرکت کی تھی۔ یہ "لیلک" اصل میں ایک رنگ تھا جسے اہل ایران "لیلج" کہتے تھے اور وہیں سے یہ رنگ اسی نام کے پھول دار پودے کے ساتھ مغرب میں درآمد ہوا تھا۔ اب اس قسم کے آب دار ریشمی کپڑوں کے پہننے کا رواج باقی نہیں رہا۔ لیکن بادامی اور زرد رنگ کا ایک عتابی نمونہ اب بھی پہنا جاتا ہے جو عام طور پر (Tabby cat) کہلاتا ہے۔[1]

اگرچہ برلن میں ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے پر خلیفہ ہارون رشید کا سحر انگیز نام لکھا ملتا ہے پھر بھی بغداد سے وابستہ ریشمی کپڑے حد درجہ نایاب ہیں۔ شہر لیون (فرانس) کے کولی جیٹ داساں اسی دورو (Leon, colegiala de San Isidoro) میں ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا محفوظ ہے اس پر جو عبارت درج ہے اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ یہ کپڑا بغداد میں بُنا گیا۔ غالباً اس کا بُننے والا کوئی استاد ابو نصر تھا۔ یہ نام مٹے ہوئے حروف میں اس جگہ لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے جو بافندے کا نام لکھنے کے لئے بہت موزوں ہو سکتا تھا

---

[1] ملاحظہ ہو لی اسٹرینج کی کتاب 'بغداد بعہد خلفائے عباسیہ'، آکسفورڈ، ۱۹۰۰ء

یہ کپڑا سُرخ، زرد، سیاہ اور سفید رنگوں میں بُنا گیا ہے۔ اس کا ڈزائین دسویں صدی کے آخر کے دلیں اسلامی نمونوں کا نمائندہ ہے۔ اس پر پرندے اور درندے بنائے گئے ہیں اور لہراتی گل کاری کی گئی ہے جو کسی قدیم روایت سے ورثے میں حاصل کی گئی تھی کپڑے پر یہ تمام شکلیں بڑے بڑے دائرے کے اندر اور اطراف بنائی گئی ہیں۔ ایک نمایاں عنصر ہاتھی ہے جو غالباً ہندوستان سے لیا گیا ہے۔ یہ جانور اس سے کچھ پہلے کے بُنے ہوئے ایک ایرانی ریشمی کپڑے پر بھی پایا گیا ہے جو آج سے کچھ سال پہلے فرانس کے شہر (Calais) کے قریب ایک دیہاتی کلیسا میں دریافت ہوا تھا اور اب لاؤر کے عجائب گھر کی بیش قرار اشیا میں گنا جاتا ہے۔ ایرانیوں نے باز نطینی کپڑوں کی نقل میں جو کپڑے بنائے ہیں، ان میں سے بہتوں پر بھی اس جانور کی شکل دکھائی دیتی ہے۔ ایسے کپڑوں میں قابلِ لحاظ ریشم کا وہ کپڑا ہے جو بمقام اسپین شارلیمین کے مقبرے میں محفوظ ہے

جیسے جیسے مشرقی تجارت کو فروغ حاصل ہوتا گیا، یورپ میں قیمتی ریشمی کپڑوں کی مانگ تیزی سے بڑھتی گئی۔ اسلامی ملکوں سے نفیس بنے ہوئے کپڑے اتنی زیادہ مقدار میں آنے لگے کہ مغرب کے تاجروں نے اس پر منفعت صنعت کے ذریعہ دولت کمانے کے زبردست مواقع کو محسوس کر لیا۔ انھوں نے مختلف مراکز پر ریشم بننے کے کارخانے قایم کر ڈالے اور مشرقی اور اسپینی کارخانوں سے جم کر مقابلہ کرنے لگے۔ صقلیہ میں مسلم فاتحوں نے پالرمو کے قصر شاہی میں ایک مشہور کارگاہِ حریر قایم کر رکھی تھی یہ کارگاہ اس وقت تک قایم و دائم رہی جب کہ اس جزیرے پر نارمنوں نے قبضہ کر لیا اور اس پر نارمنیوں کی حکومت دوبارہ قایم ہوگئی۔ بہت بڑی حد تک اسی صقلیہ ہی سے پہلے اطالوی کاری گروں نے اس صنعت کی فنی معلومات اور اپنے ڈزائنوں کے نمونے حاصل کئے نارمنوں کے تسلط کے دوران میں باز نطینی روایات، دبستانِ صقلیہ میں دوبارہ اس وقت داخل ہوئیں جب بحر ارخبیل (Aegean Sea) پر ۱۱۴۷ء میں ایک تاخت کے دوران میں بہت سے یونانی باشندے پکڑے گئے اور انھیں قصر کی کارگاہوں میں کام پر لگایا گیا۔ تیرھویں صدی کی ابتدا میں ریشمی پارچہ بافی بہت سے دولت مند اطالوی شہروں کی اہم صنعت بن گئی تھی۔ ان شہروں

میں صقلیہ کے بُنے ہوئے کپڑوں کی ایسی نقل کی جاتی تھی کہ اصل اور نقل میں تمیز دشوار تھی اور یہ کپڑے بڑی مقدار میں باہر دساور بھیجے جاتے تھے۔

چودھویں صدی میں اطالیہ کے ریشمی کپڑے نئے اثرات کی عکاسی کرنے لگے۔ یہ وہ اثرات تھے جو مسلم آرٹ کو متاثر کر رہے تھے۔ وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں ریشم کا ایک کپڑا محفوظ ہے جو چودھویں صدی میں اطالیہ میں بُنا گیا تھا یہ نیلے اور سفید رنگ کا ریشمی کپڑا ہے۔ اس پر نہ صرف شیر، چھوٹے کھجور کے پیڑ (Palme Mes) لہریئے دار پتے، اور عربی تحریریں کاڑھی گئی ہیں بلکہ دوسرے مشرقی عوامل بھی اس پر دکھائی دیتے ہیں جو اس دور کے اطالوی کام میں عام ہیں اس پر مخصوص قسم کے چینی پرندے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یورپ میں ان کا وجود ان حوادث کا رہین منت ہے جنہوں نے مشرق بعید میں زبردست تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ ۱۲۸۰ء میں خانہ بدوش منگولوں نے ہلاکو کے بھائی قبلائی خاں کی سرگردگی میں چین پر حملہ کیا اور ینگ خاندان کی بنیاد رکھی جو ۱۳۶۷ء تک برسر اقتدار رہا۔ ادھر ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔ ان فتوحات کے نتیجے کے طور پر ایشیا کا وہ وسیع علاقہ جو ایران سے لے کر بحرالکاہل تک پھیلا ہوا تھا، تقریباً ایک صدی تک ایک ہی منگول خاندان کے مختلف افراد کے زیر نگیں رہا۔ اس واقعہ کی وجہ سے مشرقی اور مغربی ایشیا کے درمیان فنوں کی روایتوں کا بڑی کثرت سے تبادلہ ہوا۔ چین میں تیانگ خاندان کی فرمانروائی کے دوران میں جو نوآبادیاں قائم ہوئیں ان میں مسلمانوں کی آبادی بکثرت تھی اور مسلم آبادی عربی زبان استعمال کرتی تھی۔ جہاں کہیں بھی اسلام پھیلا ہے یہی ہوا ہے۔ ان نوآبادیوں کے بسنے والوں میں بہت سے صناع بھی تھے۔ ان میں حریر باف بھی تھے۔ انھیں ریشم پیدا کرنے والے قدیمی مخزن کی آبائی مہارت حاصل تھی۔ یہ حریر باف کم نام مراکز میں کپڑے تیار کر رہے تھے جن کی پوری اسلامی دنیا میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ ان کے بُنے ہوئے خوبصورت کپڑے ان کے مغربی بھائیوں کو اتنے پسند تھے کہ انھوں نے ہر جگہ اسلامی پارچہ بافی کے ڈزائین کو متاثر کیا اور اس ذریعہ سے مغربی یورپ کی پارچہ بافی کے ڈزائین پر اثر انداز

ہوئے - عہدِ وسطیٰ کی کاری گری کے بعض شاندار نمونے ہم تک پہنچے ہیں - ان میں غالباً سب سے زیادہ شاندار ریشمی کپڑا وہ ہے جو اب ڈانزگ میں محفوظ ہے - یہ کپڑا مصر کے مملوک سلطان الناصر محمد ابن قلاؤن کے لیے خاص طور پر بنایا گیا تھا - اس سلطان کا نام اس کپڑے کے اندر کاڑھا گیا ہے - وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں تیرھویں یا چودھویں صدی کا بنا ہوا ایک ریشمی کپڑا محفوظ ہے - اس ریشمی کپڑے کی بُنت اور اس پر کا زری کا کام چینی الاصل ہے اس کے نقش و نگار میں ابوالہول، کھجور کے چھوٹے پیڑ اور عربی تحریریں شامل ہیں - یہ شکلیں بیچ بیچ میں رسمی آرائش کی پٹیاں دے کر بنائی گئی ہیں - ڈزائین میں جو پرندہ بنایا گیا ہے وہ اس طرز کی غمازی کر رہا ہے جہاں سے اصل میں یہ ڈزائین لیا گیا ہے -

نہ صرف قرونِ وسطیٰ میں بلکہ بعد کے زمانوں میں بھی مشرق کے ریشمی کپڑے کلیسا کے ملبوسات کے لئے استعمال ہوتے رہے - فنون و صنائع کے عجائب گھر پیرس میں ایرانی طرز کا زردوز ایک ریشمی چیزوبل (chasuble = عیسائیوں کی عید قرباں و فطر کے موقع پر رسوم ادا کرنے والے کے پشت دوش کا حلّہ عبادت) محفوظ ہے یہ حلّہ سولھویں صدی کے آخر یا سترھویں صدی کی ابتدا کے بنے ہوئے ایرانی کپڑے سے بنایا گیا ہے - جس غرض کے لیے یہ کپڑا استعمال ہوا ہے اس مقصد کے لئے اس پر بنے ہوئے نقش و نگار قطعاً ناموزوں ہیں اور مسجد میں تو انھیں کسی طرح برداشت ہی نہیں کیا جا سکتا تھا - ان نقوش میں سب سے نمایاں چیز نوجوانوں کی قطاریں ہیں جو درباری لباس میں ملبوس، ہاتھوں میں جام و سبو لئے کھڑے ہیں - انھیں لہراتی بیلوں کے درمیان دکھایا گیا ہے جن پر اس طرح کے پھول پتے بنے ہوئے ہیں جن کی اس زمانے میں ترکی کوزہ گر ہو بہو نقل کر رہے تھے درمیانی جگہوں میں جانداروں کچھ اس انداز سے بنائی گئی ہیں کہ یہ انداز ان کے چینی الاصل ہونے کی غمازی کر رہا ہے - یہ ڈزائین اس قسم کے شوخ نمونوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جس کا صفوی دور کی زردوزی میں عام طور پر رواج تھا - دیدہ ریزی اور نزاکت سے جو کام ہوتا تھا اس میں مرقع کاری نمایاں رہتی تھی اس میں کہیں رومانی داستانوں

سے کر مختلف مناظر دکھائے جاتے جیسے خسرو اور شیریں کی ملاقات یا لیلی مجنوں کی دردانگیز داستان کبھی پھولوں سے لدے پیڑوں اور پودے والے میدان دکھائے جاتے جن میں ہر قسم کے دلکش چرند پرند اور ڈراؤنے درندے اڑتے اور گھومتے پھرتے دکھائے جاتے۔ یہ سب تصویریں بڑی چابک دستی کے ساتھ اتاری جاتی تھیں اور انھیں مسحور کن تابناکی کے ساتھ رنگ دیا جاتا تھا۔

بھاری جھالر دار کلیسائی لباس (Orphrey) میں استعمال ہونے والی ریشم کی پٹیوں کے اوپر بنائے جانے والے نمونوں نے ایسے زمانے میں پارچہ بافی کے بہت سے دلچسپ نمونوں کے سلسلہ کو جنم دیا جب کہ ترکی اور اطالوی باشندے ایسی سرگرمی اور ایسی کامیابی کے ساتھ ایک دوسرے کے پارچوں کی نقل کر رہے تھے کہ ماہروں کے لئے بھی ایسے کپڑوں کا قطعی طور پر یورپی الاصل یا مشرقی الاصل بتانا دشوار ہو گیا۔ مذکورۂ بالا کپڑا ابعد کے زمانے کا اور بظاہر یورپی الاصل معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ایسی طرز کا نمونہ بنا ہوا ہے جو پندرہویں صدی میں ایشیائے کوچک میں نمودار ہوا تھا۔ اپنی سیدھی سادی شکل میں یہ نمونے سادی یا مزین پٹیوں سے مرکب ہیں۔ یہ پٹیاں کھڑی ہوتی ہیں اور لہراتی ہوئی جگہ جگہ ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں ان کے اس طرح آپس میں ایک دوسرے کو قطع کرنے سے جال نما تزئین بن جاتا ہے۔ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں کم وبیش رسمی تزئین جال کے خانوں کے اندر کی گئی ہے۔ یہ ایسی ہی تزئین ہے جیسی کہ بھاری جھالر دار کلیسائی لباسوں پر ملتی ہے۔ دوسرے نمونوں میں اس جگہ کچھ اور ایسے ہی عوامل نمودار ہوئے جہاں پٹیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ اس طرح کی نقش کاری کا ایک نمونہ فنون و صنائع کے عجائب گھر پیرس میں محفوظ ہے۔ یہ کپڑا سولھویں صدی کے قریب ایشیائے کوچک میں بنا ہے۔ ریشم کے اس کپڑے پر زربفت کا کام کیا گیا ہے اس میں نمونہ زرے بنایا گیا ہے۔ اس کا خاکہ نیلے رنگ سے بنا ہے اور اس کی زمین سرخ ہے۔ پٹیوں کے ایک دوسرے کو قطع کرنے سے جو درمیانی جگہ بنتی ہے اس میں ایک اور ذیلی جال کا کام بنایا گیا ہے۔ اس کے اندر گلاب کے پھول، گل لالہ، قرنفل اور نرگس کی کلیاں بنائی گئی ہیں۔

اس ڈیزائن میں سب سے اہم عنصر پھولوں کی کلیاں ہیں۔ ان کلیوں سے اطالوی بافندوں نے اور طرح کے گل کاری ڈیزائن پیدا کئے۔ سولہویں صدی کا بنا ہوا اس طرح کا گل کار اطالوی ریشمی مخمل کا ایک نمونہ وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ سولہویں صدی کے دوران میں یورپ اور ترکی بافندے ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے رہے۔ انہوں نے جال اور کلیوں کے نمونے بنانے میں بڑی نزاکتیں پیدا کیں۔ بھاری کام سے مزین مخمل کو، جس کا ان دنوں بہت رواج تھا، انھوں نے ایک خصوصی نمونہ عطا کر دیا جو رسماً ان ہی سے وابستہ ہو گیا۔ یہ اسی طرح کا نمونہ تھا جو ولیم مورس نے بھاری زربفت کے کام والے مخمل پر بنایا تھا۔ یہ مخمل اس نے نیلے، نارنجی، سفید اور سنہری رنگوں میں بنایا تھا۔ اس طرح کا نمونہ بنانے سے اس کا واحد مقصد اس قسم کے قیمتی کپڑوں کو پھر سے رواج دینا تھا۔

قالین کا شمار اب پورے عالم میں ضروریات میں ہونے لگا ہے۔ پہلی بار یہی قالین مشرق ہی سے یورپ آیا۔ پہلے پہل یہ نوادرات جمع کرنے والے دولت مندوں کے عیش کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ یہ لوگ اسے استعمال کی چیزوں میں نہیں بلکہ نوادرات میں شمار کرتے تھے۔ قالین دو طرح کے بنے جاتے تھے۔ ایک طرح کے قالین وہ ہوتے تھے جن کی سطح شجر کی طرح نرم ہوتی تھی۔ دوسری قسم کے قالین وہ ہوتے تھے جن میں دھاگوں کو گرہیں دے کر بُنا جاتا تھا اور ان کی سطح پر مخمل جیسا رواں ہوتا تھا۔ مشرق میں یہ دونوں قسم کے قالین بہت قدیم زمانے سے بنتے چلے آ رہے ہیں۔ مشرق میں انھیں بچھا کر سونے کی دیواروں پر آویزاں کرنے اور فرش فروش کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اطالوی تصویروں میں مشرقی قالینوں کے جو عکس نظر آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چودھویں صدی میں تو قالین یورپ آ گئے تھے۔ سولہویں صدی میں یہ تجارت کا باقاعدہ عنوان بن گئے تھے۔ تاریخ میں یہ واقعہ محفوظ چلا آتا ہے کہ ۱۵۲۱ء میں کارڈینل ولزی نے وینسی سفیر کے توسط سے ہامٹن کورٹ میں اپنے محل کے لئے ساٹھ مشرقی قالین حاصل کئے تھے۔ یہ قالین غالباً ویسے ہی تھے جیسے کہ ہالبین (Holbein) کی بنائی ہوئی تصویروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

.... اس عہد کے ایشیائے کوچک کے بنے ہوئے موجود قالینوں سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نارتھو ہامٹن شائر کے بوٹن ہاؤز Boughton House میں روئیں دار تین قالین محفوظ ہیں، جو خاص طور پر سر اڈورڈ مانٹیگ کے لئے بنائے گئے تھے۔ ان قالینوں کے حاشئے پر ۱۵۸۴ء کا سنہ اور سر مانٹیگ کا خاندانی نشان بُنا گیا ہے۔ یہ قالین اسی وضع کے ہیں جو اب "ترکی قالین" کہلاتی ہیں۔ انھیں دل کش تزئینی شکلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ان شکلوں کو نیلا رنگ دیا گیا ہے اور سرخ زمین میں ان کی تفصیلات زرد رنگ میں، بنا کر انھیں ابھارا گیا ہے۔

سولھویں صدی میں ایرانی صناعوں نے قالین بافی کی صنعت کو اس معراج تک پہنچا دیا تھا کہ اس سے پہلے قالین بافی کی صنعت اس معراج تک پہنچی تھی اور نہ اس کے بعد اسے یہ معراج پھر کبھی نصیب ہوئی۔ اس عہد میں اعجاز کی حد تک پہنچی ہوئی مہارت اور کمال سے ایسے ایسے نمونے تیار کئے گئے کہ ان کے حسن و جمال کی نظیر ڈھونڈے سے کہیں نہیں ملتی۔ ایسے ہی شاہکاروں میں سے ایک شاہکار اب وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ یہ قالین اردبیل سے لایا گیا ہے جہاں یہ صدیوں تک شاہان صفویہ کے مقدس جد اعلیٰ شیخ صفی کی مسجد میں رکھا ہوا تھا۔ یہ قالین بہت بڑا ہے اور اس پر غیر معمولی دیدہ ریزی سے کام کیا گیا ہے۔ اس کے اندر ایک کروڑ پانچ لاکھ سے زیادہ گرہیں اور ہر مربع انچ کے اندر تین سو اسی گرہیں آتی ہیں۔ اس کے وسط میں ایک بڑا کنگورے دار تمغہ ہے۔ اس کے اطراف نوک دار بیضوی تمغے ہیں۔ ان سب کے اندر روغن رنگوں میں گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ مرکزی نقشے کا ایک چوتھائی نقشہ اس مستطیل قالین کے ہر کونے پر دہرایا گیا ہے۔ پورے قالین کا رنگ گہرا نیلا ہے اور لہراتی شاخوں سے نکلتے ہوئے خوب صورت پھولوں سے پٹا ہوا ہے۔ ان کے درمیان ہوا میں لٹکتے ہوئے دو شمع دان ہیں جو ذیلی مراکز بن جاتے ہیں۔ حاشیہ سیدھی جدولی لکیروں سے بنایا گیا ہے۔ اس کے اندر کنگورے دار دائرے اور مستطیل بنے ہوئے ہیں اور ان کی زمین کی طرح انھیں بھی گلکاری سے خوب مزین کیا گیا ہے۔ اس قالین کے ایک کنارے پر بیضوی دائرے کے اندر حافظ کا ایک شعر[1] لکھا ہے اور اس کے نیچے یہ عبارت لکھی ہے: "عمل بندۂ درگاہ مقصود کاشانی

---

[1] حافظ کا جو شعر اس قالین پر لکھا ہے یہ ہے:

جز آستان تو ام در جہاں پناہے نیست — سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست (مترجم)

سنہ ۹۴۹ھ (مطابق ۱۵۴۲ء) اگرچہ اس قالین سے بھی قدیم قالین موجود ہیں، لیکن یہ قالین عرصۂ دراز تک قدیم ترین مورخہ قالین مانا جاتا رہا۔ لیکن اب یہ افتخار ایک اور نفیس قالین کو حاصل ہو گیا ہے جو شہر میلان کے پولائی پزولی عجائب گھر میں رکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قالین کو غیاث الدین جامی نے ۱۵۲۲ء میں بُنا تھا۔

یورپی صناعوں نے روئیں دار قالین بُننا مسلمانوں سے سیکھا۔ پہلے پہل تو وہ مشرق کی روایتی دستی مہارت سے کام لیتے رہے۔ اس کے بعد خالص مشینی طریقوں پر قالین تیار کرنے لگے۔ مشین کے بُنے ہوئے قالین اب پوری دنیا میں استعمال ہونے لگے ہیں، ان قالینوں پر وہ ڈزائن عام طور پر نظر آتے ہیں جن کی اصل اسلامی ہے۔ لیکن یہ ڈزائن روایتی باقیات سے زیادہ فیشن کے رہینِ منت ہیں۔ ہمارے زمانے کی قالین بافی کو قدیم قالین بافی سے جو سب سے زیادہ قابل قدر ورثہ ملا ہے وہ اس کے ڈزائن ہیں بلکہ اس کی مخمل جیسی نفیس بُنت ہے۔

سطوح مستوی کی تزئین سے گزر کر جب ہم ابھرواں کام کی تزئین کاری کی طرف آتے ہیں تو مسلمان کندہ کاروں اور نمونہ سازوں کو ڈزائن کا وہی نظام اختیار کئے ہوئے دیکھتے ہیں جو ان کے دوسرے فنی اظہاروں میں جاری و ساری تھا۔ یورپ کے ابھرواں کام میں جو رنگا رنگی دکھائی دیتی ہے وہی رنگا رنگی اسلامی کندہ کاری اور نمونہ سازی میں مفقود ہے۔ پارچہ بافی، ملبت کاری یا مصوری میں جو نگاری نقش استعمال ہوتے ہیں وہ یورپی رواج کے لئے بالکل نئے تھے۔ ایک ڈزائین جو کسی مصور قلمی کتاب کے صفحۂ اول کو آراستہ کرنے کے لئے موزوں ہوتا، یا ریشم کے کپڑے بنانے کے لئے مناسب سمجھا جاتا، وہی ڈزائین کسی قبر کی بیرونی آرائش یا مسجد کی دیواروں کی تزئین کے لئے بھی یکساں طور پر موزوں خیال کیا جاتا۔ وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں سنگ رخام کا بنا ہوا ایک حوض محفوظ ہے۔ اس پر ۱۲۷۷ء کا سال اور سلطان حماۃ محمد ثانی کا نام کندہ ہے جو مشہور مورخ ابوالفداء کا چچا تھا۔ اس حوض کے نقش و نگار سے معلوم ہوتا ہے کہ کندہ کار نے اس خاص کام کے لئے ڈزائین کی وہ عام قسم کس طرح استعمال کی ہے جو بہت سی صنعتوں

میں مستعمل تھی۔ یہ اسکیم بنیادی طور پر تکراری نقشے کی ہے۔ اس کے عناصر غیر مختتم طور پر افقاً حاشیے یا آرائشی پٹی کے طور پر یا عموداً اور افقاً مجموعی ڈزائین کی حیثیت سے پھیلائے جا سکتے ہیں ایسی ہی آرائشی تزئین ایک چوبی صندوق کی لمبی آرائشی پٹیوں اور دلوں پر ملتی ہے۔ یہ صندوق قاہرہ میں ایک شیخ کے مقبرے میں ملا ہے جنہوں نے ۱۲۱۶ء میں وفات پائی ہے۔ اس غیر معمولی طور پر مزین نمونے کا ایک حصہ ساؤتھ کنگسٹن میں ہے اور باقی حصے قاہرہ میں ہیں۔ فاطمی عہد کی کندہ کاری میں زمین کو بہت زیادہ گہرا کھودا جاتا تھا جس سے تقریباً چھدے ہوئے کام کا سا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ قاہرہ کے دار الآثار العربیہ میں دسویں یا گیارہویں صدی کا بنا ہوا ایک چوبی دلا محفوظ ہے۔ پالرمو کے قومی عجائب گھر میں ایک کندہ کار چوبی چھت محفوظ ہے۔ یہ چھت اگرچہ صقلیہ میں بنی ہے لیکن اس کی طرز فاطمی ہے۔ اس چوبی چھت سے نہ صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ ایسے گہرے کندہ کار دتے کتنے اثر انگیز ہوتے ہیں بلکہ اس کی تزئینی گلکاری کے اندر مختلف قسم کے پرندے اور حیوان بھی نظر آتے ہیں۔ یہ شکلیں فاطمی دور کی درباری یا غیر مذہبی تزئین کاری میں عام طور پر نظر آتی ہیں۔ اس میں انسانی شکلیں بھی آزادی سے استعمال کی گئی ہیں۔

مذکورہ بالا چھت سے تعمیر کاری کی اس مخصوص طرز کا بھی پتہ چلتا ہے جو مسلمان نجاروں نے اختیار کی تھی۔ تعمیر کا یہ ڈھنگ عملی بھی تھا اور تزئینی بھی۔ موسمی اثرات، لکڑی میں سکڑاؤ یا کھاؤ کے اندیشے اور موزوں لکڑی کی قلت کی وجہ سے دلوں کو ممکنہ حد تک چھوٹے پیمانے پر گھٹا دیا گیا اور اس کے جواب میں اس کے امدادی چوکھٹے کو بڑھا دیا گیا۔ اس کو مستحکم بنانے اور ڈزائین میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش میں چھوٹے دلوں کو جمع کرنے کا ایک حیرت انگیز نظام ہی بتدریج ارتقا پا گیا اس نظام کی بنیاد اصل میں تعمیری مقاصد کو نقشوں کے ذریعہ پورا کرنا ہے اور طرح طرح کے نقشوں سے مسلمان گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ستارے کے اطراف بنے ہوئے کثیر ضلعوں والی شکلوں کے ڈزائین تزئینی آرٹ میں مسلمانوں کا غالباً سب سے نمایاں عطیہ ہے۔ چوبی کام نے اس طرز کو ارتقا دینے میں زبردست حصہ لیا ہے اور اسی کام میں اس کے مکمل ترین نمونے ملتے ہیں

لیکن ان نقشوں کو مختلف صنعتوں میں کام کرنے والے صناع بھی استعمال کرتے تھے۔ پوری دنیائے اسلام میں ان کے ڈزائین بنانے میں غیر معمولی طباعی کا اظہار ہوا ہے۔ اور اگر بعد کے زمانوں میں یہ ڈزائین اکتا دینے کی حد تک پیچیدہ اور نازک ہوتے گئے ہیں اور زوال پاکر نظری ہند سے کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں تب بھی ان کی سادہ شکلیں رنگوں کی ترتیب کے لحاظ سے نہایت پر اثر رہی ہیں اور اس فن میں مسلمانوں کی بداعت ہمیشہ بہت اونچے درجے پر رہی ہے۔

اس قسم کے نقشوں میں ایک نقشہ وہ ہے جو بارہ نکیلے ستاروں کو ایک بارہ ضلعی شکل کے اندر نہایت دل کشی کے ساتھ بٹھایا گیا ہے۔ ایسا نقشہ ایران کے شاہی معمار مرزا اکبر کے یہاں بھی ملتا ہے جو انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے اور جس کے بنائے ہوتے بہت سے خاکے وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ اس خاکے کے اندر کسی نوک دار آلے سے کاغذ کو چھیل کر ہندسی شکل بنائی گئی ہے اور نمونہ روشنائی سے اسی کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے یہ طریقہ کاری گروں کی ہدایت کے لئے اختیار کیا گیا ہے اور غالباً قدیم کارخانوں کی روایت کی شہادت دے رہا ہے۔ ان خاکوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی ڈزائین بنانے والے کس طرح ایسا کام کرتے تھے جو مختلف طریقوں پر برتا جا سکتا تھا۔ اس بات کی تصدیق اس وسیع ادب سے بھی ہوتی ہے جو اس طرح کے نمونوں کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

---

[1] م سرج۔ بورگان نے اپنی کتاب la trait dis an he laco (پیرس ۱۸۷۹ء) میں اس طرح کے کوئی دو سو عجیب و غریب ڈزائینوں کا تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ای۔ ہ۔ ہانکن نے اپنی کتاب The Drawings of Geometric Pattern in Saracenic Art (کلکتہ ۱۹۲۵ء) میں ساحرانہ مہارت سے بعض نہایت ہی پیچیدہ مثالوں کی وضاحت کی ہے

(باقی آئندہ)

جوگ بشسٹ

از

(جناب پروفیسر سید ابو ظفر صاحب ندوی احمد آباد)

(۲)

کوئی کہے اس دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم عین حق ہے، پس اجزائے عالم کو مثل اجرام فلکی اور اور اجسام ارضی کے بھی حق تصور کرنا چاہئے اور جب ان کو حق سمجھا جائے تو زمان و مکان وغیرہ کو حق سمجھنا پڑے گا، اور جیسے حق ہمیشہ یکساں ہے، ان کو بھی ہمیشہ یکساں ہونا چاہیے۔ جواب یہ ہے کہ حق نے ہر وقت اور ہر مکان میں جو لباس پہنا، دوسری جگہ وہ نہیں پہنا، اور اس مکان و زمان میں بھی لباس کا پہننا برائے نام فرض ہوا ہے۔ اور عالم کے ظاہر ہونے سے پہلے وہ اکارن تھا، یعنی اپنا صانع ہونا نہیں رکھتا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ مرتبہ علم میں تھا۔ اور ظاہر ہے کہ صور علمیہ جناب باری کا کہ یہ اشارہ اعیان نامہ حقائق اشیاء سے ہے، کسی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ جب اس نے ارادہ کیا کہ یہ عالم ظاہر ہوئے "پرتجھ ہوا" اطلاق اس نام کا اس سبب سے ہوا، کہ جو کچھ نظر آتا ہے وجود حق کا ہے، اور کچھ نہیں ہے اور جو کچھ صورت اور شکل سے نظر آتا ہے، اور عقل و تصور میں سماتا ہے، وہ حقیقت کچھ نہیں رکھتا، پس علت ظہور عالم کا، دوست رکھنا حق کا ہے، اور جو ایسوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ دو نوع سے ہے۔

(۱) شبد، (۲) انمان،

(۱) شبد سے مراد دلیل نقلی ہے جس کو منقول کہتے ہیں۔ اظہار اس کا بید (وید) اور مقدسوں کے اقوال سے ہے۔

(۲) انمان سے مراد دلیل عقلی ہے، جس کو معقول کہتے ہیں یعنی دلیل سے ثابت کرنا جیسے کوئی دھواں دیکھ کر آگ کا وجود ثابت کرے۔ چوں کہ شبد اور انمان پرتجھ سے ظاہر ہوئے، اس وجہ

سے تینوں حق ہیں۔ اور علم حقیقت کو منسوب حق سے کرو۔ خواہ خلق سے، عین حق ہے۔ جو حق سے غیر ہے وہ جہل اور غفلت ہے۔ مکث کا مقام اُس وقت تک نہیں ملتا، جب تک غیر اس کی کسی شئی کو دیکھے پس چاہیئے کہ ہر شے کو اس طرح خیال کرے جیسا کہ کوئی شخص خواب میں دیکھے اور بیداری میں وہ معدوم ہو جائے، موجوداتِ عالم بھی اسی طرح تصور کرنے سے نظر آتی ہے۔ اور عرفان سے معدوم ہو جاتی ہے کوئی کہے کہ موجودات بوقت قیامت اور موت کے فانی ہوتی ہے، اگر یہ حق ہے تو صفت فنا و عدم حق پر عائد ہوئے، تو جواب یہ ہے کہ ہر سم کی ہستی محض ہے اور نقص عدم اس کے واسطے نہیں ہے اور کوئی اپنے واسطے نقص روا نہیں رکھتا۔ یہ عالم فقط اعتباری اور صفاتی حق سے نسبت رکھتا ہے ورنہ جو آثار صفات، نشان اور نام رکھتا ہے، سب کو زوال اور فنا ہے، جیسے دنیا کو قیامت ہوگی، بہشت دوزخ اور جو کچھ بھی نام رکھتا ہے، فنا ہوگا اور حق سب جگہ ہے، اس کو حرکت اور انتقال نہیں، جیسے پہاڑ اور بحر نا پیداکنار، اور اس کا کچھ نام و نشان بھی نہیں اور عقل و حواس کو اس کے نزدیک پہنچنے کی رسائی بھی نہیں۔ اس کی یہی علامت ہے، کہ علامت بیان نہیں ہو سکتی، اور یہی نام ہے، کہ کوئی نام نہیں، اور لائق اشارہ بھی نہیں۔ مگر کچھ ہے اور بوقتِ وقوع قیامتِ کبریٰ تمام موجودات و مفہومات کو فنا ہوتی ہے، اس حالت میں جو فنا سے محفوظ رہتا ہے، وہ حق ہے، اس سے زیادہ طاقت بیان کی نہیں ہے۔

اس باب کے شروع سے یہاں تک مسلسل ۲½ صفحے میں نے اس خیال سے نقل کیے کہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ مصنف کے بیان کا کیا طرز ہے، اس کے بعد مختلف قسم کے سوال و جواب ہیں۔ مثلاً قیامتِ کبریٰ کے بعد اس عالم کا کیا حال ہوگا۔ یا جب خالق اور خلق کو ایک فرض کر لیا جائے تو فنا اور بقا کی دونوں صفتیں دونوں کے لئے یکساں ہوں گی، اس کے بعد وہی خواہش سے آزادی، بیم ورجا سے رستگاری کی تلقین شروع کر دی ہے، اور ایک قصہ ملک الموت اور ایک درشنی کا بیان کیا ہے یعنی ملک الموت نے اس کو مارنا چاہا تو ناکامیاب رہا، کیوں کہ اس نے دائمی زندگی حاصل کر لی تھی۔[1]

---

[1] یہ بہت طویل مگر بے حد لچر قصہ ہے فقط طوالت کے خیال سے حذف کر دیا ہے۔

پھر لکھا ہے کہ مکت یا مکتی (نجات) کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جیون مکت یعنی زندگی ہی میں آزادی حاصل ہو جائے۔

(۲) بدیہہ مکت، یعنی بعد انتقال کے آزادی حاصل ہو، اور بدیہہ مکت اس کو حاصل ہوتا ہے، جو جیون مکت پہلے حاصل کرلے۔

ایک سوال کے جواب میں کہ توحید کی تعریف کرو، لکھتا ہے کہ "ہستی بحت جو قیامت کبریٰ کے بعد باقی رہتی ہے، وہی صاحب عالم اور عالمیان کا ہے، وہ عین دانائی اور سراپا نور ہے اس کے بعد ایک طویل قصہ ایک عورت لیلا نامی کا ہے۔ جو اپنے شوہر کو ہمیشہ جوان اور زندہ رکھنا چاہتی ہے غرض حکایات، سوال وجواب اور مختلف علمی بحثیں مثلاً، اکھان بھومکا کے سات درجوں کی تعریف یا گیان بھومکا کے سات درجوں کی تعریف وغیرہ پر یہ باب ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس باب کے عنوان پیدائش عالم کے متعلق مسلسل بحث و دلیل کہیں پتہ نہیں۔ اسی لئے اس فن کے علمائے ہند کا قول ہے کہ اس میں تصوف کم اور دوسری باتیں زیادہ ہیں۔

چوتھا استھیہ پرکرن یعنی جس طرح قیام اس عالم کا ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ تصویر اس عالم کی خود بخود بنی ہے، اگر اس کا مصور تصویر کے لئے فرض کیا جائے، تو دوئی لازم آتی ہے، حالاں کہ یہ بے رنگ، اور بے شکل جو کچھ مفروض ہے، وہ دل ہے، بجز اس کے کوئی نہیں۔ اور یہ بھی وہم ہے، اور عالم کا دل، آتما کا آئینہ ہے۔ اور آتما کا دل، عالم کا آئینہ ہے۔ اور آتما آئینہ دل کا۔ اگر کوئی اپنی صورت آئینہ میں دیکھے اور اس کی صورت اور آئینہ کا عکس دوسرے آئینہ میں پڑے، تو صورت کا تفاوت کچھ نہ ہوگا۔ فقط یہ سبب دو آئینہ کے دو نظر آئیں گے، اب سمجھو کہ آتما نرمل اور روشن صورت ہے، مثل آئینہ کے۔ اور آئینہ دل کا تھوڑا تاریک ہے۔ اس وجہ سے جیسی کہ صورت ہے، نظر نہیں آتی ہے، جب صاف ہو جائے صورت اصلی نظر آئے جیسے کہ آئینہ کو صورت کا دیکھنا، آئینہ کے ارادے اور اختیار سے نہیں ہے، اسی طرح آتما پیدا کرنے کا عالم کو اختیار نہیں ہے اور نمود عالم کی آتما ہی خود بخود ہوتی ہے اور ظہور وجود عالم کا لازمی، عادتی اور طبعی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خالق اور مخلوق دو نہیں ہیں۔ اور عدم اور وجود عالم کا ارادہ سے نہیں ہوتا ہے، عادتاً اسی طرح سے ہے۔

یہ بیان مصنف کا ہے، مترجم کہتا ہے کہ نیائے شاستر والے کہتے ہیں، کہ خالق تکوینِ عالم میں خود مختار ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے، مجبور نہیں ہے، یعنی پہلے مذکورہ نظریہ کے برعکس۔ پھر کہتا ہے کہ ہر یک شاستر اور ہر ملک کے حکما اپنے اپنے طرز پر اس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن وہ دلیل جو حیرت کو دور کرے اور حق الیقین کا مرتبہ پیدا کرے، کوئی پیش نہ کر سکا۔ وجہ یہ ہے کہ"

"چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

مصنف کہتا ہے کہ حق نہ کارن ہے نہ کارج، یعنی نہ خالق نہ مخلوق۔ مگر ایسی چیز ہے کہ سب کا دل اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ پس تو بھی اپنے دل کو آرام دینا چاہتا ہے تو اس کی طرف رجوع کر سب اسی کا ظہور ہے۔ اس کے سوا جو مفہوم ہوتا ہے وہ وہم و خیال ہے۔ جیسے پتھر کے تختے صاف ہوں، ویسے ہی حق ہے، جب ہاتھ، قلم اور رنگ کے سبب سے اس میں نوع بہ نوع کے نقش و نگار ہوں ویسا یہ عالم ہے۔

مترجم کہتا ہے کہ انسان کی انتہائی نظر آسمان تک ہے۔ اس کے بعد اس طرف کیا ہے، یہ معلوم کرنا امکان بشر سے باہر ہے اسی سبب سے کسی نے کچھ خبر نہ دی۔ اور جس نے کچھ بتایا اس کا ثبوت بہم نہیں پہنچایا۔ اس وجہ سے کہتا ہوں کہ اس کی نفی اور اثبات مجبور اور مختار کے معاملہ میں بحث کرنا یا اس کی تعریف اور مذمت میں لب کھولنا محض نادانی ہے لیکن تحقیقات سے باز رہنا پست ہمتی ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ اس معاملہ میں افراط اور تفریط کو دخل نہ دے، مگر آسمان کی اس طرف پہنچنے کا قصد رکھے۔ شعر

دست از طلب ندارم تا کام من بر نہ آید یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن بر آید

بالیقین جانتا ہوں، کہ جس کو آسمان کے اوپر کا علم ہوا، وہ خاموش ہو گیا، اور جب تک گویا ہے، وہ آسمان کے اسی طرف ہے، اُس طرف نہیں گیا۔ پس وہ اندھا ہے، اور حیرت میں مبتلا ہے، آسمان کے اندر کی بات وہ معتبر ہے جو دلیل سے ثابت ہو، اور تہذیبِ اخلاق، تدبیر منزل، سیاستِ مدن، علمِ طبعی، ریاضی، اور مابعد الطبعیات کے موافق ہو۔

مصنف اور مترجم کی بعینہٖ عبارت راقم الحروف نے نقل کر دی ہے، ناظرین خود اندازہ لگالیں کہ اس باب کا جو عنوان ہے اس کے متعلق کیا دلیل دی گئی۔ اس کے بعد "بھرگ رِشی اور اس کے لڑکے سکر" کی ایک طویل حکایت ہے، جس نے راجہ اندر کے دربار کی ایک پری کو دیکھ کر عاشق ہو جانے کے سبب اپنی روح قالب سے خالی کر لی۔ اور اس کے دربار میں پہنچا، اور اس سے وصل کر کے جب واپس ہونے لگا تو اکاش میں اس کی روح پانی بن کر بنگالہ میں گری۔ اور اناج بن کر ایک برہمن کی خوراک ہوئی، اور نطفہ بن کر عورت کے بطن سے پیدا ہوا، باسدیو نام رکھا گیا، بڑا عالم فاضل بن کر ایک پہاڑ پر خدا کی عبادت میں مصروف ہو گیا، ادھر اس کا باپ جب مراقبہ سے فارغ ہوا، تو لڑکے کو مردہ دیکھ کر بہت غصہ ہوا، اور ملک الموت کو بد دعا دینا چاہا۔ ملک الموت نے ایک لمبی تقریر کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو عدم سے وجود میں آتا ہے وہ سب میری خوراک ہے، اس میں نہ میرا کچھ دخل ہے، نہ تیرا۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا پاتا ہے، تیرے لڑکے نے جیسا کیا پایا۔

اس کے بعد مصنف نے ایک طویل نصیحت نقل کی ہے، جو شری رام کو کی گئی ہے اس کا خلاصہ اِسی قدر ہے کہ تم خواہشات کو دل سے نکال ڈالو۔ اور بیم و رجا سے مبرا ہو جاؤ۔ اور جس طرح ایک شریف آدمی اپنے بُرے پڑوسی سے اس کی بُرائی جاننے کے باوجود، اچھا برتاؤ کرتا ہے، یا انسان کو جائے ضرور میں جانا ہی پڑتا ہے، اسی طرح تم اہل و عیال کے ساتھ دنیاداری کے کام انجام دو۔ اور سلطنت کی دیکھ بھال کرو۔

اس کے بعد ایک طویل قصہ راجہ پاتال کا ہے جو زیر زمین ہے، اس نے کئی بار اندر راجہ کو شکست دے کر ملک لے لینا چاہا۔ لیکن خود شکست کھا کر واپس گیا۔ آخر اس نے ایسے تین دیو پیدا کئے جو لذات و محسوسات سے ناواقف تھے، انھوں نے راجہ اندر کو شکست دے کر ملک پر قبضہ کر لیا۔ راجہ اندر پہاڑوں میں چھپ گیا اور دیوتاؤں سے مدد مانگی۔ لیکن کئی بار ان دیوتاؤں کو بھی شکست دی گئی۔ آخر دیوتاؤں نے برہما سے مدد مانگی۔ برہما نے کہا ذرا انتظار کرو، کچھ ہی عرصہ کے بعد ان میں خواہشات پیدا ہو جائیں گے، اُس وقت تم ان پر کامیاب ہو جاؤ گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی قصہ کو سامنے رکھ کر شری رام کو نصیحت کی جاتی ہے کہ تم ہمیشہ اس کا خیال رکھو کہ تم میں خواہش نہ پیدا ہونے پائے، اس کے بعد متعدد حکایتیں، کہانیاں، اور شری رام جی کو نصیحتیں ہیں۔ راقم الحروف تخلیق کے سلسلہ کا ذکر کر کے اس باب کو ختم کرتا ہے۔

جب چتن سروپ نے ارادہ کیا کہ وحدت سے کثرت ہو، بدن سے تعلق کیا، جیو آتما" نام ہوا۔ جب پہلے سے زیادہ متعلق ہوا۔ اہنکار نام ہوا۔ اس سے جب زیادہ متعلق ہوا، "بدھ" کہلایا، پھر بدھ کے سنکلپ سے من پیدا ہوا، اس نے پانچوں گیان اندری (حواس خمسہ ظاہری)، اس نے پانچوں کرم اندری (ہاتھ، پاؤں، نطق، مقعد، آلہ تناسل) پھر تمام جسم کو پیدا کیا۔ پھر آتما نے یہ قید خود از خود قبول کی۔ جیسے پیلا کیڑہ ریشم کو اپنے لعابِ دہن سے بناتا ہے، چتن سروپ نے تمام قیود بھی اپنے آپ برآمد کیں۔ جیسے تخم نے درخت کو اپنے وجود سے آپ پیدا کیا اور جس طرح درخت میں تخم پوشیدہ ہو گیا۔ اسی طرح سے برہم کائنات میں چھپ گیا۔ دل غموں کی آگ جلا، اور اور خواہش کی ہوا سے پژمردہ ہوا، اور تردد کی موجوں میں ڈوبا، اور غرور کی خاک میں گر گیا۔ جب ہر طرف سے ایسی آفتوں میں مبتلا ہوا، اوسان باختہ ہوتے اپنی اصل کو بھول گیا، یعنی خود خدا جب انسانی شکل میں آ گیا اور بشریت اس پر غالب آ گئی، تو وہ فراموش کر گیا کہ میری اصل پرماتما ہے)

اور سب سے پہلے پرم آتما سے جیو آتما ہوا، اور پرم آتما سے مراد "روح مطلق" ہے ان دونوں کے تعلق اور تصرف سے دل پیدا ہوا۔ دل نے سب سے پہلے شبد (لفظ یا آواز) پیدا کیا۔ اس کا مادہ خلا یعنی آسمان ہے، اور قوت سامعہ اسی سے متعلق ہے۔ آسمان نے سپرس یعنی قوت لامسہ کو پیدا کیا، اس کا مادہ ہوا سے ہے۔ اور یہ تمام جسم میں ہے، ہوا نے خلا سے اتصال کیا، تو آگ کو پیدا کیا، اس سے قوت باصرہ ہوئی، آگ سے پانی پیدا ہوا، اور اس سے رس یعنی ذائقہ جو زبان سے معلوم ہوتا ہے پیدا ہوا۔ پانی سے بو پیدا ہوئی۔ اس کا مادہ خاک سے ہے، پانچوں عنصر مع اپنے خواص کے جب موجود ہوئے، ان کی آمیزش اور اختلاط سے ایک مزاج پیدا ہوا، جیسے آگ سے چنگاری" جس وقت اس چنگاری نے اہنکار، عقل اور حواس سے امداد پائی۔ بیل کی پھل کی طرح

بڑا ہوگیا، اور دل میں (جو بصورت نیلوفر فرض کیا گیا ہے) متمکن ہوا۔ پھر اس کا نام برہما یعنی من قرار پایا۔ پھر جسم ہوا، رفتہ رفتہ متعدد ناموں سے موسوم ہوا۔ جیسے سنار مختلف قسم کے زیور سونے سے بناتا ہے، اور اس کا جُدا جُدا نام رکھا جاتا ہے۔

جو علم، عقل، سرداری، نیک خواہش اور ادراک معقولات رکھتا ہے وہ برہما ہے، برہما کو تردد ہوا کہ میں کس واسطے پیدا کیا گیا؟ جب غور و فکر کیا، کشف ہوا کہ جو پہلے برہما نے کیا وہی کرنا چاہیئے، جب یہ دل میں قرار پایا، ہر قسم کی موجودات کو صورت خانہ سے جلوت خانہ میں حاضر کیا۔ اور واسطے انتظام مخلوق کے، کہ شر و فساد نہ ہو، اور عدل سے کام لیتے رہیں، کوئی اپنے حق سے محروم نہ رہے، اور حتی الامکان جنگ وجدل نہ ہو۔ اور ہر شخص آزادی سے خوش گذران کرے، چار وید، اٹھارہ سمرتی، چھ شاستر، اور اٹھارہ پوران بنائے، تاکہ ہر کوئی اس کے موافق نیک عمل کرے۔

باب پنجم اتشیم پرکرن | یعنی عالم کے فنا ہونے کے بیان میں = لیکن تمام باب آپ پڑھ جائیں، اس عنوان پر کوئی معقول بحث نظر نہ آئے گی۔ اس میں تمثیل کے طور پر کہانیاں، افسانے اور غیر معقول باتوں کا ذکر اگرچہ ضمناً ہے، مگر بہت زیادہ ہے۔ زیادہ زور اسی بات پر ہے کہ دنیا ایک وہم و خیال ہے، انسان اپنے پانچوں حواس پر قابو پاکر مکت (نجات) پاسکتا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عبادت کے آسن کس طرح جمانا چاہیئے، یعنی عبادت کے لئے بیٹھک کا کیا کیا طریقہ استعمال میں لانا چاہیئے اور اس کی کتنی قسمیں ہیں۔ اور ہر قسم کو کس طرح عمل میں لانا چاہیئے . . . . . .

. . . . اور ہر ایک کے فوائد کیا ہیں۔ پھر شری رام چندر جی کو ہدایت کی گئی ہے کہ تم تمام دنیاوی امور سلطنت اسی طرح انجام دو جس طرح دوسرے کرتے ہیں۔ مگر تمھارا دل ان میں سے کسی سے اٹکا نہ ہو۔ بلکہ بالکل بے تعلق ہو۔

باب ششم تروان پرکرم | یعنی کلمہ و کلام سے آزادی اور چون وچرا سے رستگاری، معرفت نفس اور روح کی حقیقت کے بیان میں ہے۔

مصنف نے اس باب میں بھی اصل مقصد کے بجائے دوسرے مضامین سے بحث شروع

کی ہے، مثلاً اُس نے لکھا ہے کہ ویدانتوں کے نزدیک "اَوِدیا" تین صفتوں سے مرکب ہے، رجوگن (خواہش یا ارادہ) تموگن (غصہ) ستوگن (تمیز یا عقل) پس اگر یہ تینوں صفتیں برابر ہوں تو اس کو "پراکرت" کہتے ہیں، اور یہ درجہ خدائے لایزال کا ہے لیکن اگر عقل غالب ہو اور خواہش اور غصہ برابر ہو تو یہ مرتبہ برہما، بشن، اور رودر کا ہے، پھر ستوگن اگر دونوں پر غالب ہو اور رجوگن، تموگن پر غالب ہو تو اس مرتبہ پر بشسٹ اور بسوامتر ہوتے ہیں پھر ستوگن دونوں پر غالب ہو اور تموگن، رجوگن پر غالب ہو تو اس مرتبہ پر سیس اور باسک وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور رجوگن دونوں پر غالب ہو اور ستوگن اور تموگن باہم برابر ہوں تو اس مرتبہ پر رام چندر اور جنک وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور رجوگن دونوں پر غالب ہو اور ستوگن، تموگن پر غالب ہو تو اس مرتبہ پر بالمیک اور ویاس وغیرہ ہوتے، اور رجوگن دونوں پر غالب ہو اور تموگن، ستوگن پر غالب ہو تو اس مرتبہ پر کبھدر ہوتے، اور تموگن دونوں پر غالب ہو اور ستوگن اور رجوگن دونوں برابر ہوں تو اس مرتبہ پر نباتات اور جمادات ہیں۔ تموگن دونوں پر غالب ہو اور ستوگن، رجوگن پر غالب ہو، تو اس مرتبہ پر گائے بیل وغیرہ ہوتے ہیں تموگن دونوں پر غالب ہو، اور رجوگن، ستوگن پر، تو اس مرتبہ پر سانپ، سُور اور درندے ہوتے ہیں۔

غرض مصنف نے عالم موجودات میں جو کچھ ہے ان کے صفات کو بیان کیا ہے کہ ان مخلوقات میں یہ یہ صفات پائے جاتے ہیں۔ مصنّف نے اس کے بعد کرم جوگ کا بیان شروع کر دیا ہے، اور بتایا ہے کہ بعض لوگ کرم جوگ کو آسان سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ گیان جوگ پر عمل کرتے ہیں۔ پھر کرم جوگ کو سمجھانے کے لئے طویل قصہ ایک کوّے کا بیان کیا ہے۔ کہ اس کی عمر اس قدر طویل تھی کہ دنیا کئی دفعہ پیدا ہوئی اور فنا ہوئی مگر وہ زندہ رہا۔ اور یہ کرم جوگ کے بدولت تھا لیکن راقم الحروف نے کئی دفعہ یہ حکایت پڑھی۔ پر یہ نہ معلوم کر سکا کہ کرم جوگ کی بدولت اس کو یہ دولت کیوں کر حاصل ہوئی۔ کرم جوگ کے معنے "اپنے اعمال حسنہ کے ذریعہ نجات پانا ہے" مگر اس قصہ کے پڑھنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوّے کو یہ دولت اُس کے آقا نے محض ازراہِ کرم عنایت فرمائی۔

اس کے بعد بشسٹ نے اس کوّے سے ملاقات کی، اور کہا کہ دنیا کے جو عجائبات تم نے دیکھے ہیں ان میں سے کچھ بیان کرو، اس نے کہا کہ ایک وقت وہ تھا کہ پہاڑ اور درخت تھے، لیکن حیوان اور انسان نہ تھے، ایک زمانہ میں خاک تھی، پر پہاڑ اور درخت نہ تھے، ایک دفعہ بندھیاچل پہاڑ نے آفتاب کی آمد ورفت بند کردی، پھر "اگسسٹ" پیدا ہوا، اور اپنے علم وعقل سے بندھیاچل کو اس کی اصلی صورت پر لے آیا۔ کیوں کہ آفتاب کی آمد ورفت کے بند ہونے سے دنیا میں خلل پڑ گیا تھا، کسی طرف رات ہی رات تھی اور کسی طرف دن ہی دن۔

ایک وقت ایسا تھا کہ ستارہ سُہیل نہ تھا۔ ایک زمانہ میں شراب شریفوں کے لئے جائز تھی اور رذیلوں کے لئے حرام، ایک زمانہ میں عورت دوسروں کے ساتھ ہم بستر ہوکر بھی پاک سمجھی جاتی تھی۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ برہما، بشن، رودر، آفتاب اور چاند پیدا کرکے اُن کے نام رکھے گئے، ایسا بھی واقعہ گذرا ہے، کہ "ہرناچھ" دنیا کو اٹھاکر دوسری جگہ لے گیا، پھر "باراہ" اوتار نے اُس کو مار ڈالا، اور زمین کو اپنی جگہ واپس لائے۔ کبھی ایسے راجے بھی ہوئے ہیں کہ جن کی سلطنت بتّیس کروڑ، ۶۷ سرسٹھ لاکھ برس تک رہی ہے۔ ۳۲۶۷۰۰۰۰۰۰ ایک دفعہ "سنکھاسر دیبت" نے ویدوں کو دریا میں غرق کردیا، اور مچھ اوتار نے اس کو دریا سے نکالا۔ بشسٹ، مہادیو، گنیش، پاربتی، سرستی لچھمن وغیرہ سات دفعہ میرے سامنے پیدا ہوئے، وید بارہا غائب ہوئے، اور ان کا عمل جاتا رہا۔ اور ترمیم وتنسیخ اس میں ہوئی۔ دس مرتبہ مہادیو نے اندر کی سلطنت چھین لی، اور پھر واپس کردی، کئی مرتبہ ویدوں کا مضمون تبدیل ہوا۔ بارہ مرتبہ رامائن اور جوگ بشسٹ بالمیک نے تصنیف کی۔ اور سات مرتبہ مہابھارت تصنیف ہوئی، گیارہ مرتبہ راما اوتار جسرتھ کے گھر پیدا ہوئے، اور بارہا مشرق مغرب ہوا، اور مغرب مشرق بن گیا۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ قصہ بھی بیان کیا ہے جو ناظرین کے تفریحِ طبع کے لئے درج کرتا ہوں۔

"پاربتی" زوجہ مہادیو کے باپ (جگ وچھ) نے ایک دفعہ جگ (یگ یا یگن) کیا۔ انھوں نے تمام رئیسوں کو بلایا مگر مہادیو کو خبر تک نہ کی۔ پاربتی نے اپنے باپ سے شکایت کی۔ باپ نے کہا کہ مہادیو

بد وضع ہیں، ہر وقت نشہ میں چور رہتے ہیں۔ سانپ گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔ اور لوگوں کے سر کاٹ کر ہر وقت گلے میں بطور مالا کے استعمال کرتے ہیں۔ چوں کہ ان کی وضع عوام کے خلاف ہے اس لئے ایک کو خوش رکھنے کے لئے سب کو ناراض کرنا خلافِ عقل ہے، اسی سبب سے جان بوجھ کر شرکت کی دعوت نہ دی، پاربتی نے اس میں اپنی حقارت اور ذلت محسوس کی، اور خود کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا۔ مہادیو کو جب اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے اس مجلس ہی کو درہم برہم کر ڈالا۔

بششٹ نے کوّے سے درازیِ عمر کی وجہ دریافت کی، اُس نے جواب دیا کہ جو شخص طبعی نفرت و محبت کو دل سے نکال ڈالے اور اخلاق ذمیمہ سے بچتا رہے وہ معرفت کا آبِ حیات پی لیتا ہے جس پر موت قابو نہیں پاتی۔ اور اس کے ساتھ ہیں نے حبسِ دم کا عمل بھی جاری رکھا ہے۔ اس کے بعد حبسِ دم کے متعلق اس نے تشریح کی اور آخر میں اس نے کہا کہ اسی سے میں نے جاودانی زندگی حاصل کی ہے۔

میرے خیال میں غالباً مصنف نے اس قصہ سے کرم جوگ کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ کوّے نے دل سے نفرت و محبت کو نکال دیا اور اخلاق ذمیمہ سے بچتا رہا۔ حبس دم بھی کیا، یہی کرم جوگ کیا جس سے وہ کامیاب رہا۔

اس کے بعد متعدد دوسرے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً نکرت جیون کی علامت کیا ہے، مہادیو کی پرستش کس طرح کرنی چاہیئے بُت پرستی عوام کے لئے ہے، خواص کے لئے نہیں۔ چوں کہ عوام کم عقل ہوتے ہیں اور محسوسات ہی کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے دھیان کو قایم رکھنے کے لئے محسوس (یعنی بُت یا مورتی) کا سامنے رہنا خدا کے گیان کے لئے ضروری ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد بششٹ نے کہا کہ ای رام چندر! جو کچھ میں نے کہا اور بتایا اس پر عمل کر، اور اب زیادہ کوئی سوال نہ کرنا، کان، آنکھ، لب کو بند کر لے اور دل ساکن (مطمئن) رکھ اور ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کر۔

لہ ناظرین کے معلومات میں اضافہ کے لئے یہ بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اندر کے دربار کی چند پریاں ہنس پر سوار ہو کر ایک پہاڑ پر اُتریں وہاں چند کوّے بھی تھے، انھوں نے ان ہنسوں کو حاملہ کر دیا۔ ان سے جو بچے ہوئے ان میں سے ایک یہ حضرت بھی ہیں جو بششٹ سے باتیں کر رہے ہیں۔

بھاردوج نے مصنف کتاب شری بالمیک سے سوال کیا کہ پھر رام چندر دنیا کی طرف کس طرح مائل ہوئے، بالمیک نے کہا کہ رام چندر جب بشسٹ کی تعلیم سے عارف ہوگئے اور گوشہ نشین ہونا چاہا، تو بسوامتر نے کہا کہ جس کام کے لیے میں آیا ہوں، اس کو پورا کرنا چاہیے۔ عارف اگر گوشہ نشین ہوجائے تو مخلوق کو کیا فائدہ پہنچے۔

بشسٹ نے کہا کہ اے رام چندر! فضل الٰہی سے اب تم گیانی ہوگئے، اس کا شکر ادا کرو، اور مخلوق کو گیانی بناؤ۔ رام چندر نے بشسٹ کے قدم چومے، اور بشسٹ نے ان کو دعا دی۔ حاضرین دربار نے بشسٹ کو آفریں کہا، اور رام چندر کو مبارک باد دی۔ پھر رام چندر نے بسوامتر کے ہمراہ جاکر اس کا کام انجام دیا اور واپس آکر سلطنت کے کاروبار راجوں کی طرح انجام دیتے رہے، کیوں کہ دل میں اب کسی قسم کی خواہش باقی نہیں رہی تھی۔ دنیا اور اُس کی تمام چیزیں اُن کی آنکھوں میں حقیر اور فانی نظر آتی تھیں۔

اس مضمون پر اصل کتاب جوگ بشسٹ ختم ہوگئی۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ جوگ بشسٹ کا اصلی حصہ ہے صرف وہی ہے جس میں شری رام چندر جی کو مخاطب کیا گیا ہے، باقی تمام قصص و حکایات اور امثال وغیرہ سب الحاقی ہیں۔ جو بعد میں داخل کردیے گئے ہیں۔ والعلم عند اللہ۔ وما توفیقی الا باللہ۔

رفاہ عام

از

(جناب مولوی محمد انظر شاہ صاحب استاذ دار العلوم دیوبند)

(۲)

نہر الصین | واسط کی بنا سے پہلے حجاج کا ارادہ کسکر کے علاقہ میں "الصین" میں رہنے کا تھا، چنانچہ یہاں اس نے، ایک نہر کھدوانے کا حکم دیا لکھا ہے کہ جب کاری گر جمع ہو گئے تو حجاج نے حکم دیا کہ ان سب کو ایک ساتھ باندھ دیا جائے تاکہ ان میں سے کوئی بھاگ نہ جائے، اور اس طرح نہر الصین کو اس نے کھدوایا۔ ایضاً ص ۲۹۸

نہر النیل اور نہر زابی بھی اسی کی کھدوائی ہوئی ہیں۔

نہر المبارک | خالد بن عبد اللہ قسری نے نہر المبارک کھدوائی، مشہور شاعر الفرزدق نے اس پر یہ شعر ک

کانّک بالمبارک بعد شهر   تخوض غموره بقع الکلاب

یعنی تو مہینہ بھر بعد نہر مبارک میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی سیاہ گہرائیوں میں چت کبرا پن پیدا ہو گیا ہے۔" پھر اسی فرزدق نے ایک طویل قصیدہ میں کہا کہ

اعطی خلیفته بقوة خالد   نهراً یفیض له علی الانهار

إنّ المبارك کاسمه یسقی به   حرث السواد وناعم الجبّار

وکانّ دجلة حین اقبل مدّها   نابئمة له مجبل قطار

یعنی خالد کے بازو سے اس کے خلیفہ کو ایسی نہر عطا کی گئی ہے جو لبریز بہتی ہے مبارک سے جیسا کہ اس کا نام ہے دجلہ کے مد کے وقت میں السواد کی کھیتیاں اور بڑے بڑے درخت سیراب ہوتے ہیں۔

ایضاً ص ۲۹۹

نہر میمون | اس کو ام جعفر زبیدہ بنت جعفر بن منصور کے وکیل سعید بن زید نے کھدوایا اس کا دہا

ایک گاؤں کے پاس تھا، جس گاؤں کا نام میمون مشہور ہے، عمر بن فرج الرخجی نے اس کا دہانہ بدل دیا لیکن اس کا نام نہر میمون رکھا تاکہ یمن (سعادت) کا ذکر اس سے جدا نہ ہو۔ ایضاً ص۵

نہر الصلہ | امیرالمومنین المہدی نے کھودنے کا حکم دیا، کھودی گئی اور اس کی وجہ سے آس پاس کی زمینیں قابل کاشت ہوگئیں، اس کی آمدنی اہل حرمین کی مدد معاشوں اور روزینوں کے لئے مخصوص کردی۔ ایضاً ص۵

نہر بردہ | جب سلیمان بن عبدالملک نے الرملہ میں اپنے لئے قصر بنوایا اور لوگوں کو بھی مکانات بنانے کا حکم دیا تو اہل رملہ کے لئے یہ نہر کھدوائی اور کنویں بھی کھدوائے سلیمان سے قبل رملہ مدینہ میں تھا بلکہ صرف رملہ یعنی راہ گزر تھا اس کے دور میں یہ ترقی کرتے کرتے ایک وسیع اور آباد شہر ہوگیا۔

ایضاً ص۲۳۱

نہر مسلمہ | جب مسلمہ بن عبدالملک بن مروان روم پر حملہ آور ہوا تو اس نے بالس کو اپنی فوجی چھاؤنی بناکر یہاں قیام کیا یہاں کے باشندے اور بالس کے دیہات میں دوسرے لوگ آئے اور اس سے درخواست کی کہ ہمارے لئے فرات میں سے ایک نہر کھدوا دو اس نے نہر کھدوادی اور یہ نہر مسلمہ کے نام سے مشہور ہے"۔ ایضاً ص۲۴۴

اسلامی عہد میں جو ہزاروں نہریں تیار ہوئیں، ان سب کی نشاندہی میں نہیں کرسکا، جس حد تک جستجو و تلاش کی گئی بلا مبالغہ تاریخ کے صفحات میں ہزاروں نہروں کے تذکرے نظر سے گذرے جو مسلمان بادشاہوں، امراء، عورتوں اور آزاد کردہ غلاموں کے ہاتھوں تیار ہوئیں اگر ان سب کا ذکر کیا جاتا تو خواہ مخواہ کی طوالت ہوتی اور غالباً پڑھنے والوں کی طبیعت بھی اکتا جاتی، ان چند نہروں کے ذکر سے یہ سمجھنا کہ اسلامی عہد میں یہی چند نہریں کھدوائی گئیں قطعاً غلط ہوگا، ابن حوقل نے تو بصرہ کے علاقہ کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ایک لاکھ بیس ہزار نہریں جاری تھیں ان میں سے ایک ہزار نہروں کی وسعت اتنی تھی کہ بآسانی ان میں کشتیاں چلتی تھیں" ص۱۶۰

بہت ممکن ہے ابن حوقل کے اس بیان سے یہ سمجھا جائے کہ یہ نہریں قدرتی طور پر تیار ہوگئی تھیں اور مسلمانوں نے جُزوی طور پر تھوڑا بہت کام کر کے ان کو استعمال کے قابل بنا لیا لیکن ابن حوقل ہی نے بعد میں چل کر جو کچھ لکھا ہے اس کے بعد یہ خیال کہ نہریں قدرتی طور پر سامنے آگئی تھیں غلط معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ سیاح کچھ اس طرح اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لاکھ بیس ہزار نہریں مسلمانوں نے ہی اپنے وسائل و ذرائع کو استعمال کر کے کھدائی تھیں، ابن حوقل کے بعینہ الفاظ یہ ہیں کہ

"اندازہ کیا جا سکتا ہے ان اولوالعزمیوں کا جو ان نہروں کے کھدوانے والوں میں کارفرما تھیں" سچ اٹھ ہزار سالہ ص ۱۶

مورخ کی ان تصریحات کے بعد، کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ان نہروں کی کھدائی کی نسبت براہ راست ہم مسلمانوں کی طرف نہ کریں۔ اور چند ہی تاریخی کتابوں میں مسلمانوں کے رفاہیت عامہ سے متعلق کاموں کی تفصیل جو میں نے تلاش کی اور اس سلسلہ میں نہروں کا جس کثرت سے ذکر آیا اس کے بعد ابن حوقل کی ان اطلاعات کو باور کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔ اب ان چشموں کی بھی تفصیل پر ایک نظر ڈال لی جائے جو مسلمانوں کے عہد میں مسلمانوں ہی کے حکم سے جابجا تیار کئے گئے چشمے انسانوں کے لئے پانی کے ذخیروں کو عام کرنے کی یہ دوسری رفاہی جدوجہد تھی جو مسلمانوں نے انجام دیے سیکڑوں چشمے تیار کئے گئے، چند کا ذکر میں بھی کرتا ہوں، مصنف نے امیر معاویہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

"ان کے حکم سے اطراف مدینہ میں چشمے نکالے گئے اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جہاں پانی جمع ہوتا تھا بند بندھوائے گئے ان سے کھیتوں اور نخلستانوں کی آبپاشی ہوتی تھی" (تاریخ ان جلد ۳ صفحہ ۱۲)

علی بن عیسیٰ جو امرائے بغداد میں سے تھے، نہایت عقلمند اور باوقار و بارعب رئیس تھا رفاہیت عامہ کے بہت سے کام اس نے کئے جن کی کچھ تفصیل جستہ جستہ ہم بھی کریں گے، مورخ اسی کے تذکرے میں لکھتا ہے کہ

"اس نے ایک چشمہ بھی مکہ تک پہنچایا جس سے قلت آب کی شکایت جاتی رہی" ایضاً جلد ۵ صفحہ

بلاذری، لکھتا ہے کہ اسحاق بن ابراہیم بن مصعب، المتوکل علی اللہ کی جانب سے جب السواد کا والی ہوا تو اس کے دور میں السواد میں کثرت سے چشمے تیار ہوئے ان سب چشموں کا ذکر کرنے کے بعد بلاذری نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"مسلمانوں نے یہاں اور بھی چشمے کھود دے اور ان سے سیراب ہونے والی زمینوں کا بھی انتظام کیا جو ان چشموں سے سیراب ہونے والی زمینوں کا انتظام کیا تھا" (بلاذری جلد ا ص۳۵۱)

عین الجمل | بلاذری لکھتا ہے کہ اس چشمے کے پاس ایک اونٹ مرگیا تھا اس وجہ سے اس کا نام عین الجمل پڑا لیکن واسط کے بعض لوگوں نے بلاذری سے بیان کیا کہ جمل نامی ایک شخص تھا جس نے یہ چشمہ کھدوایا تھا اسی کی جانب یہ منسوب ہے۔ (ایضاً)

عین الصید | بلاذری نے لکھا ہے کہ کریزیوں میں سے ایک شخص نے مجھ کو بتایا کہ عین الصیدان چشموں میں تھا جو بند کر دئے گئے تھے ایک مرتبہ یہاں سے کسی مسلمان کا گذر ہوا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں دھنس گئے، وہ فوراً گھوڑے سے اُترا اور اس جگہ کھودنے لگا تو یہاں سے یہ چشمہ نکل آیا۔ ایضاً

اس واقعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ رفاہِ خلق کے کاموں میں مسلمان کیسی دلچسپی اور ذوق وشوق سے حصہ لیتے تھے، کہ چلتے چلتے مسافرت وغربت میں چشمے پر گذر ہو، اور کچھ علاموں سے صرف اس کا ادراک کر کے کہ یہاں چشمہ ہوگا! سفر ختم کر دیا گیا اور چشمہ کھودنے میں مسافر لگ جاتا ہے، صدیوں تک اپنے اقتدار کے دور میں مسلمان اسی طرح، خلقِ خدا کو آرام پہنچاتے رہے اب جب کہ شمال وجنوب، مشرق ومغرب میں ان کی زبوں حالتی حد سے بڑھی جاتی ہے۔ تو تاریخ کے صفحات سے ان کارناموں کو بھی کھرچا جارہا ہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنے ارتقائی دور میں وسائل وذرائع کی حد تک اس قوم نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے تھے، اسی قسم کا ایک اور واقعہ دیکھئے۔

عین الرجبہ | یہ چشمہ بھی انھیں چشموں میں سے تھا جو بند کر دیئے گئے تھے، کرمان کے حاجیوں میں سے کسی حاجی نے یہاں پانی آتے ہوئے دیکھا تو حج سے واپسی پر عیسیٰ بن موسیٰ کو جا کر اس کی اطلاع

دی۔ اسی کرمانی نے یہ جگہ اور اس کے قرب وجوار کی دوسری زمینیں جاگیر کے طور پر عیسیٰ سے مانگ لیں، اور اس چشمے کو صاف کر کے استعمال کے قابل بنایا۔" ایضاً ص

ہمدان کے ذکر میں ابن حوقل نے لکھا ہے کہ

" یہ نیا بسایا ہوا اسلامی شہر ہے اس کی چاروں طرف فصیل بھی ہے، چار دروازے ہیں جن پر لوہے کے پھاٹک چڑھے ہوئے ہیں ان کے یہاں بھی پانی کی کثرت ہے اور بہتے ہوئے چشموں سے کھیتی ہوتی ہے۔"

" ابن حوقل صہ ۲۶ "

سجستان کے ایک مرکزی شہر جس کا نام ابن حوقل زرنج بتاتا ہے اس کے حالات میں اس نے لکھا ہے کہ

" اس کے اندر ایک چشمہ ہے اور دوسرے چشمے بھی آ کر گرتے ہیں۔" ایضاً

ظاہر ہے کہ یہ چشمے بھی جو ان دور دست علاقوں میں ابن حوقل نے اپنی سیاحت کے دوران میں دیکھے مسلمانوں کی انھی رفاہی جد و جہد کا نتیجہ ہوں گے جن کے ذکر سے تاریخ کے صفحات جگمگا رہے ہیں۔ ابن حوقل اگرچہ اس سلسلہ میں کچھ وضاحت نہیں کرتا لیکن اس کی دی ہوئی اطلاعات سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ چشمے مسلمانوں ہی کے تیار کردہ ہیں۔

کنوئیں | آب رسانی و آبپاشی یا پانی کو حاصل کرنے کا تیسرا معروف و مشہور طریقہ یہ ہے کہ کنوئیں کھدوائے جائیں، جن جگہوں میں نہروں کے کھودنے کا امکان نہیں تھا یا چشموں کو تیار کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مسلمانوں نے ایسے علاقوں میں جا بجا کثرت سے کنوئیں تیار کرائے، بعض ایسے مواقع جہاں پانی کو دستیاب کرنا بڑا دشوار تھا، مسلمانوں نے کثیر رقم صرف کر کے نہایت گہرے گہرے کنوؤں کو کھدوانے کا انتظام کیا، ان کی ان کوششوں سے عوام کو جو کچھ راحت و سہولت حاصل ہوئی اس کے طویل تذکرے مورخین کرتے ہیں، لیکن میں مختصر طور پر ان کنوؤں کا ذکر کرتا ہوں جو مسلمانوں کے ہاتھوں تیار ہوئے۔

ولید بن عبد الملک کے تذکرہ میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں کہ

"ولید کو امت کی خوشحالی کا بہت خیال تھا اس نے تمام اسلامی صوبوں میں سڑکیں نکلوائیں جابجا دریاؤں اور چشموں پر پل بندھوائے راستے درست کئے ازاں میں جہاں ضرورت دیکھی کنوئیں کھدوائے نیز ہر قسم کے خطرات سے ان کو محفوظ رکھنے کا بھی سامان کیا" (تاریخ امت جلد ۳ ص۱۱)

اسی کتاب میں ہشام بن عبدالملک کے رفاہِ عام سے متعلق کارناموں کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ

"ہشام نے اپنے عہد میں مکہ مکرمہ کے راستہ میں زائرین کے پانی پینے کے لئے جابجا حوض بنوائے اور کنوئیں کھدوائے" (ایضاً ص۲۷)

اور مہدی جس کے زمانہ میں عباسی خلافت کی جڑیں بڑی مضبوط ہو چکی تھیں اور خلافت کے جس قدر حریف اور مدعی تھے سب کا استیصال ہو چکا تھا اس کا عہد خوشحالی و فارغ البالی کا دور ہے، نہ باغیوں کی سرکوبی کے ہنگامے، اور نہ مخالف طاقتوں سے تصادم کا سوال، اس لئے مہدی کی تمام تر توجہات، داخلی امور کی طرف رہے اور ملک میں رفاہِ عام کے ساتھ مفید اصلاحات کے وہ زبردست کام انجام دیئے جس کی بناء پر تمدن وارتقار کی تہذیب میں اس کے یہ شاہ کار ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ رفاہِ عام کے جو امور اس سے بن پڑے ان کی بڑی لمبی چوڑی فہرست میں یہ بھی موجود ہے کہ

"مہدی نے ہر ہر منزل پر کنوئیں کھدوا کر ان کے متصل حوض بنوا دیئے اور حکم دیا کہ یہ ہمیشہ بھرے رکھے جائیں تاکہ گذرنے والے قافلوں کو اور ان کے جانوروں کو پانی بہ آسانی مل سکے" (ایضاً ص۱۳۸)

مہدی کو رفاہِ خلق کے کاموں سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اس بڑھتے ہوئے ذوق و شوق کے نتیجہ میں، مہدی بھی، عبیداللہ بن زیاد کی طرح چاہنے لگا تھا کہ رفاہِ خلق کے تمام آثار اسی کی طرف منسوب ہوں چنانچہ مسجد نبوی جس کی تعمیر میں ولید بن عبدالملک کو بھی بہت کچھ دخل ہے اور مسجد کے بعض حصوں میں ولید کی خدمات کا جو اسی مسجد کے سلسلہ میں ہوئیں ذکر بھی ہے مہدی نے ولید کے نام کو مٹا کر اس جگہ پر اپنا نام لکھوا دیا۔ ممکن ہے کہ اس کی اس حرکت کو شہرت طلبی

اور نام آوری سے یاد کیا جائے مگر میرا خیال ہے کہ رفاہِ عام کے سلسلہ میں جو کچھ اس نے کیا جہاں تک عزت و ناموری کا سوال ہے وہ تہدی کے لئے حل ہو چکا تھا پھر صرف نام و شہرت کے لئے ولید کے نام کو مٹا کر اپنا نام لکھوانا صرف اسی مقصد کے لئے کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ رفاہِ عام کا جو خبط سوار تھا اسی غیر معمولی جذبہ کے تحت، اضطراراً اس سے اس قسم کی حرکات صادر ہوتی تھیں، تاہم اس قسم کی کوششوں کو اچھی نظر سے تو دیکھا نہیں جا سکتا۔

بہر حال کنویں کھودنے کے سلسلہ میں عرض کیا جا رہا تھا وہی علی بن عیسٰی جس کا تذکرہ پہلے بھی گزرا اور غالباً بعد میں بھی رفاہیت سے متعلق اس کے کارناموں کی تفصیل کی جائے . . . . رفاہِ خلق سے متعلق اس نے جو کچھ کیا اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ

"علی بن عیسٰی نے پھر ایک بہت بڑا کنواں کھدوایا اس سے شیریں پانی نکلا یہ کنواں جراحیہ کے نام سے مشہور ہے۔" (ایضاً ص۵)

غالباً میں پہلے کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ یہ علی، نہ بادشاہ ہے اور نہ کسی صوبہ کا با اختیار گورنر بلکہ بغداد کے امراء میں سے ایک رئیس ہے۔ لیکن اپنے محدود دولت کے ذخیروں کو استعمال کر کے رفاہیت عامہ کے جو امور اس نے انجام دیئے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عام و خاص سب ہی جماعتوں اور طبقوں میں خدمتِ خلق کا کس قدر بے پناہ جذبہ تھا۔ مگر اب پچھلوں پر جب انسانی گرفت ڈھیلی ہو کر حیوانی دباؤ بڑھتا جاتے، اور رفاہیت کے کاموں کو ایک حد تک انجام کے ساتھ بڑی حد تک ان سے غفلت ہو رہی ہے، انھیں کو دیکھ، دیکھ کر اگلوں پر ایسے الزامات لگائے جا رہے ہیں جن کو حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ الرملہ کے حالات میں یہ گزر چکا ہے کہ اس کے کنوؤں کے مصارف بنو امیہ اور ان کے بعد بنو العباس برداشت کرتے رہے۔ اور خرچ بھی ہزار دس ہزار کا نہیں، بلکہ مورخین کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کنوؤں

پر سالانہ میزانیہ لاکھوں تک پہنچتا تھا۔ میں آئندہ چل کر، ان تمام اخراجات کو جو موجودہ دور میں رفاہیت عامہ کے کاموں پر آتے ہیں معتبر حوالوں سے پیش کر کے بتاؤں گا کہ اسلامی عہد میں کتنی کروڑہا کروڑ رقم ان امور پر صرف ہوتی تھی۔

بیر رومہ عرض کر چکا ہوں کہ رفاہ عام کا یہ جذبہ جو مسلمانوں میں اچانک پھوٹ پڑا تھا، اس جذبہ کی پرورش میں بڑی حد تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دخل ہے، یہی رومہ کا کنواں جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وقف کیا تھا اس کی اطلاع دیتے ہوئے ماوردی نے لکھا ہے کہ

"حضرت عثمانؓ نے بیر رومہ کو وقف کر دیا تھا اور لوگوں کی طرح آپ بھی اپنا ڈول ڈالتے تھے"

(احکام السلطانیہ ص ۱۶۹)

جیسا کہ معلوم ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کنوئیں کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب پر خرید کر وقف کیا تھا اور پھر اس درجہ اس سے بے تعلق ہو گئے تھے کہ کسی ایسے تصرف کے لئے تیار نہ تھے جس سے ظاہر ہو کہ آپؓ اب بھی مالکانہ استحقاق و تصرف کا خود کو مجاز سمجھتے ہیں ماوردی کے ان الفاظ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ "اور لوگوں کی طرح وہ بھی اپنا ڈول ڈالتے تھے، عثمان رضی اللہ عنہ نے کس درجہ احتیاط سے کام لیا تھا، صحابہ کی ایک بڑی جماعت رفاہ خلق کے کاموں میں جو حصہ لیتی رہی کیوں کہ ان کی داستان بہت مشہور ہے اسی لئے میں نے ان کے تذکروں کو ضروری نہیں سمجھا، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں رفاہیت کے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے گئے، شبلی مرحوم کی تصنیف الفاروق میں ان کی تفصیلات سب کو مل سکتی ہیں۔

حوض اسی طرح مسلمانوں کے ہاتھوں جا بجا حوض بھی نہایت کثرت سے تیار ہوئے، نہروں اور کنوؤں سے جس قسم کے منافع اٹھائے جا سکتے ہیں، کم و بیش ایسے ہی فائدے حوضوں سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں، مسلمانوں نے پانی کے ذخیرہ کو یک جا کر کے، عام انسانوں کو حوض سے بھی نفع اٹھانے کا موقع بہم پہنچایا ہے اسلامی عہد میں جو حوض تیار ہوئیں اس کی ایک مختصر تفصیل یہ ہے بلاذری نے بصرہ کے تفصیلی حالات میں لکھا ہے

"البصرہ کے ولاۃ واشراف نے بڑے بڑے حوض بنوائے تھے جن میں برسات کا پانی جمع ہوتا تھا، جب تک یہ پانی چلتا سہولت ہوتی، جب ختم ہوجاتا تو دجلہ سے پانی لایا جاتا انھیں حوضوں میں ایک مشہور حوض حجاج کا تھا۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے

"ابن عامر، زیاد، اور ابن زیاد نے بھی حوض بنوائے تھے اور لوگوں کو ان سے پانی پینے کی عام اجازت تھی

(فتوح البلدان ۲ صـ ۔)

ہشام بن عبد الملک جس کے متعلق ہشیم بن عدی، مدائنی اور دوسرے مورخین کا یہ دعویٰ ہے کہ بنو امیہ میں ماہر سیاست صرف تین گذرے ہیں۔ معاویہ، عبد الملک اور ہشام ان تینوں پر حسن سیاست، تدبر، بیدار مغزی ختم ہوگئی، یہی بیدار مغز خلیفہ جیسا کہ اس کے سوانح نگار لکھتے ہیں حد درجہ بخیلؔ اور ممسک تھا لیکن اپنے تمام بخل اور کفایت شعاری کے باوجود رفاہِ عام میں اس نے بھی دل چسپی لی مورخین ہشام کے رفاہِ خلق کے کاموں کی تفصیل کرتے

ع ہشام کے بخل کے دلچسپ واقعات جو مورخین نے ذکر کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا بخل انتہا پر پہنچا ہوا تھا اور اپنے اس فطری مرض سے کچھ اس درجہ مجبور ہوگیا تھا کہ بے اختیار ایسی حرکات اس سے سرزد ہوتیں جو اس کے مقام و منصب سے خرد بھتیں چنانچہ مسعودی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہشام اپنے دوستوں کے ہمراہ اپنے باغ میں گیا یہ سب لوگ اس باغ میں گھومے پھرے ہر قسم کا میوہ تیار تھا ان سب دوستوں نے توڑ کر کھانا شروع کیا اور کہتے جاتے تھے کہ "اللہ امیر المومنین کو برکت دے" اللہ امیر المومنین کے کاروبار میں ترقی ہو" لکھا ہے کہ ہشام نے اس پر چیخ کر کہا کہ "تم کھاتے چلے جاتے ہو برکت کہاں سے ہوگی" اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ باغ کے داروغہ کو بلا کر حکم دیا کہ تمام پھل اور درخت کاٹ دیئے جائیں اور ان کی جگہ زیتون نصب کردو تاکہ پھر کوئی کچھ نہ کھا سکے اسی طرح ایک مرتبہ اس کے بیٹے نے درخواست دی کہ میری مادیاں خچر بہت لاغر دبلی ہوگئیں اگر امیر المومنین مناسب سمجھیں تو کوئی اور سواری عنایت فرمائیں۔

ہشام نے لکھا کہ معلوم ہوتا ہے تم خود اپنے جانوروں کی نگرانی نہیں کرتے خود نگرانی کرو، رہا سواری کا مسئلہ تو کسی دوسرے وقت اس درخواست پر غور کیا جائے گا، اس طرح ہشام نے بیٹے کو بھی ٹال دیا لیکن، سواری کے لئے کوئی ۔ جانور نہ دیا ۔ لوگ اپنے بادشاہ کے مزاج میں ڈھل جاتے ہیں اور سلطان مزاج کی ساخت پر ہی ہے عام انسانوں کے مزاج تیار ہونے لگتے ہیں، اس لئے ہشام کے دور میں، بخل، و کفایت شعاری عام مرض ہوگیا تھا بقول مسعودی۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مکہ کے راستہ میں حجاج کی آسائش کے خیال سے حوض و تالاب بنوائے اسی طرح اور بہت سی اس کی یادگاریں ہیں جن کو عباسیہ کے ابتدائی عہد میں داؤد بن علی نے برباد کر دیا۔" (مروج الذہب صفحہ ١٦)

ہشام کے عہد میں پارچہ بافی میں بھی بڑی ترقی ہوئی اور کپڑوں کے بعض نادر نمونے تیار ہوتے جیسا کہ ہم عنقریب اس کا ذکر کریں گے۔ مہدی کے حالات میں، ذکر کر چکا ہوں کہ اس نے ہر ہر منزل پر کنویں کھدوا کر، ان کے قریب حوض بنوا دیئے تھے اور ان کو ہمیشہ بھرے رکھے جانے کا حکم دیا تھا اور یہ بھی حکم تھا کہ ہر شخص ان سے پانی لے سکتا ہے۔ یہی مہدی جب مدینۃ الرے میں پہنچا ہے اور اس کو تعمیر کرایا تو شہر کے اردگرد فصیل بنوائی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "ہر شخص کو روپیہ جمع کرنے کی دھن تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جود و سخاوت عنقا ہو چکی تھی۔"

ہشام احول، نہایت سخت مزاج اور کھرا تھا، ایک دن ہشام حمص میں فوج کا معائنہ کر رہا تھا، حمص کا ایک سوار اس کے سامنے سے گزرا جس کا گھوڑا شرارت کر رہا تھا، ہشام نے دریافت کیا کہ ایسے شریر گھوڑے پر سواری کی کیا وجہ ہے؟ سپاہی نے کہا کہ امیرالمومنین، میرا گھوڑا ہرگز شریر نہیں لیکن اس نے جب آپ کی آنکھ جو کہ احول ہے دیکھی تو گھوڑے کو غزوان بیطار کا شبہ ہو گیا اور وہ بھڑک اٹھا، ہشام نے کہا کہ "دور ہو تجھ پر بھی لعنت اور تیرے گھوڑے پر بھی" (غزوان بیطار حمص کا نصرانی تھا جو کہ بھدے پن اور اپنے ٹیڑھے ٹیڑھے اعضاء میں، ہشام سے بے حد مشابہ تھا) تشدد پسند مزاج کے باوجود ایک "دنی" سپاہی کی اتنی جرأت اور ہشام کا برداشت کر جانا عجیب بات ہے، اس کے عہد کا سب سے زیادہ دل دوز واقعہ، زید بن علی بن الحسن بن علی بن ابی طالب کی شہادت ہے، نہ صرف یہ کہ بہیمانہ انداز میں ان کو قتل کیا گیا بلکہ ہشام کے حکم سے پانچ سال تک زید کا جسم برہنہ سولی پر لٹکا رہا۔ مگر قدرتی طور پر ان کی ستر پوشی کا کچھ ایسا انتظام ہوا کہ پانچ سال کے اس پورے عرصہ میں باوجودیکہ لاش کوفہ کے چوک میں آویزاں تھی ان کے اعضاء غیر مکشوفہ کو کسی نے نہیں دیکھا بعد میں ولید کے حکم سے یہ لاش مع درخت کے تنہ کے جلا دی گئی۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جو کچھ ہشام نے، زید بن علی کے ساتھ کیا بالکل وہی معاملہ ہشام کی لاش کے ساتھ پیش آیا۔ یعنی ابوالعباس سفاح کے عہد میں عبداللہ بن علی اور عمر بن ہانی العائی، ہشام کی قبر پر آئے اور اس کو کھولا دیکھا تو ہشام کی لاش سوائے ناک کے بانسہ کے بالکل محفوظ و سالم تھی۔ اسی کوڑے مارے گئے اور جلا ڈالی گئی غالباً قدرتی طور پر اس لاش کو محفوظ ہی اس لئے رکھا گیا تھا تاکہ زید کے معصوم خون کا انتقام اسی انداز میں لیا جا سکے۔" منہ

"اس کے پاس حوض تیار کئے" (فتوح البلدان ج ۱ ص ۱۵۵)

اور جب خلیفہ الولید نے اپنے بھائی سلیمان کو فلسطین کا حاکم بنایا تھا تو اس نے لد میں سکونت اختیار کی اور بعد میں رملہ کی بنیاد ڈالی اور رملہ ہی اپنا مستقر حکومت بنایا تھا پہلی عمارت جو یہاں تیار ہوئی وہ خود سلیمان کا محل تھا جسے دار الصباغی کے نام سے شہرت ہے اسی سلیمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"سلیمان نے پانی جمع کرنے کی غرض سے ایک بڑا حوض بنوایا" (بلاد فلسطین و شام ص ۳۰)

بہر حال اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلامی عہد میں حوض بھی کثرت سے تیار ہوئے، میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میری اس مختصر تفصیل سے یہ سمجھنا کہ اسلامی عہد میں صرف اتنی ہی نہریں، اس قدر ہی چشمے اور اتنی قلیل تعداد میں حوض تیار ہوتے غلط ہوگا، میرا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں رفاہیت کے جو کام ہوتے رہیں ان کا ایک خاکہ آپ کے سامنے آجائے، رفاہِ خلق کے تمام امور کی تفصیل، اور ہر ایک کی مکمل نشاندہی تقریباً ناممکن ہے۔

تالاب اور جھیلیں رفاہِ خلق کے کاموں میں جو مسلمانوں کی طرف سے انجام دیئے گئے ہم کو اس کا بھی ذکر ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں نے زراعت، آبپاشی، اور ایسے ہی دوسرے مقاصد کے لئے تالاب اور جھیل بنوائے مثلاً امیر معاویہ کی تاریخ میں مورخ لکھتا ہے کہ

"حضرت امیر معاویہ رضؓ نے پہاڑوں کی بعض گھاٹیوں کے گرد بند بندھوا کر ان کو بھی تالاب کی صورت میں بدل دیا تھا جس میں پانی جمع ہوتا تھا۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۱۰۱)

امیر معاویہ رضؓ کے اس اقدام سے زراعت اور پیداوار میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا اس کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ

"ان سے (تالابوں سے) زراعت کو جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے ڈیڑھ لاکھ وسق خرما اور ایک لاکھ وسق گیہوں کی پیداوار ہوتی تھی۔ (ایضاً)

اس طرح مسلمانوں کو زراعت اور کثرت پیداوار کے امور سے غیر معمولی دلچسپی تھی واقعہ یہ ہے کہ وہ

ایسے، ایسے کام سوچتے رہتے تھے جس سے خلق خدا کو کوئی بھی فائدہ پہنچنے کا امکان ہو، ہشام کی تاریخ میں بھی یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ہشام نے بھی

"تالاب تیار کرائے تھے" (ایضاً)

اور جن جھیلوں کو تیار کیا گیا یا ان کو صاف کرا کر فائدہ اٹھانے کے قابل کیا گیا ان کی تفصیل بلاد فلسطین و شام میں ملتی ہے بقاع کی جھیل کے متعلق جی، لی اسٹرینج لکھتا ہے کہ

"امیر سیف الدین دنکز نے خزانہ عامرہ سے اسے اپنے لئے خرید ا اور بدر روئین کھدوا کر اس کا پانی رود لیلہ میں خارج کرا دیا" (بلاد فلسطین و شام ص۵۲)

اسی امیر سیف الدین نے اس موقع کو صاف کرا کر یہاں پر تقریباً "۲۰" گاؤں آباد کرا دیئے، جھیلوں کی نزدیکی اور شاداب و زرخیز علاقہ کی وجہ سے فصلیں اس قدر عمدہ اور بہتر تھیں انگریز مورخ کو لکھنا پڑا

"فصلیں اس قدر عمدہ اور زرخیز تھیں کہ حد بیان سے باہر ہے یہ خربوزہ اور کھیرے وغیرہ کی فصلیں تھیں کاشتکار مالا مال اور آسودہ حال ہو گئے" (ایضاً)

موجودہ وقت میں، زمینداروں کو مفلس اور قلاش بنانے کے باوجود حکومتیں، کسانوں اور کاشتکاروں کو جو سہولتیں بہم پہنچا رہی ہیں وہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں۔ لیکن یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ زمینداروں کا ایک بڑا طبقہ، افلاس و غربت کے دیو جانگسل کے ہاتھوں میں پھنس گیا مگر کاشتکاروں کو آسودہ حال بنانے کی پالیسی سے نہ خود انھیں کو فائدہ پہنچا اور نہ ملک میں کثرت پیداوار کے نتیجہ خوراک کے عام حالات اچھے ہوئے، حالانکہ سابق کے مقابلہ میں کروڑ ہا کروڑ کی رقم صرف اسی مقصد پر صرف ہو رہی ہے مگر یہ مسئلہ جوں کا توں درد سر بنا ہوا ہے، بات یہ ہے کہ کاشتکاروں کو آسودہ حال بنانے کی پالیسی بڑی حد تک منفی پالیسی ہے جس کے نتیجہ میں، زمیندار طبقہ، اسی زبوں حالی میں مبتلا ہو گیا، جس میں اس سے پہلے، کاشتکار مبتلا تھے، اب کاشتکار تباہ حالی سے نکلے تو دوسرا ایک بڑا طبقہ اس میں زبردستی مبتلا کر دیا گیا، مسلمان حکمرانوں کی

پالیسیاں کیونکہ مثبت پہلو لیئے ہوئے ہوتی تھیں، اسی لیے رعایا کے تمام افراد و طبقات کو، ملک کی دولت سے، مساویانہ طور پر فائدے اٹھانے کے موقعے ملتے تھے، اور دولت کی اس مساوی تقسیم کی وجہ سے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ ایک مسئلہ ختم ہو تو دوسرے طبقہ کی مصیبتیں کھڑی ہو جائیں یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے طویل و عریض تذکروں میں بے چینیوں کی وہ داستان ہم کو نہیں ملتی کہ جن کشمکشوں میں آج دنیا مبتلا کر دی گئی ہے۔

آبپاشی | ملک کو آسودہ و خوش حال بنانے کی جہاں اور بہت سی مؤثر تدابیر ہیں ان میں سب سے زیادہ مؤثر تدبیر یہ ہے کہ خوراک کے اعتبار سے ملک خود کفیل ہو۔ اور اس ملک کی پیداوار وہاں کے عام باشندوں کی ضروریات کا تکفل کر سکے، دنیا کے آج وہ تمام ملک جہاں سے آئے دن، اضطراب و بے چینیوں کی اطلاعیں مسلسل ہم تک پہنچتی رہتی ہیں، ان پریشان کن مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ خوراک ہے۔ آج دنیا بے چینیوں اور راحت کے جس مرحلہ پر آکر کھڑی ہو گئی ہے اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملک جو اپنی خوراک کے مسائل کو خود اپنے یہاں کی پیداوار سے حل کر سکتے ہیں ہر طرح کامیاب ہیں اور جن سلطنتوں میں، قلت پیداوار کی بنا پر، یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا نہ صرف یہی کہ وہ خوراک ہی کے سلسلہ میں پریشان و تباہ حال ہوتے ہیں بلکہ عوام میں اضطراب ملکی حالات میں انتشار سب اسی ایک مسئلہ کے برگ و بار ہوتے ہیں۔ آخر بھوکے عوام اگر روٹی کے سوال کو سب سے زیادہ اہمیت نہ دیں تو اور کیا کریں اور ضبط و نظم قایم کرنے کے لئے اگر حکومتیں بپھرے ہوئے عام انسانوں پر گولیاں نہ چلائیں تو کیسے ہو۔ مسلمانوں نے اس مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کو بخوبی معلوم کر لیا تھا، چشمے، نہریں، تالاب، جھیل، کنویں اور ہزاروں آبپاشی کے ذرائع اسی لئے بہم پہنچائے گئے تھے، تاکہ کھیتیاں بر وقت سیراب کی جا سکیں، اور جب کبھی آبپاشی کی ضرورت پیش آئے تو بہم پہنچائے ہوئے انھی ذرائع کو استعمال کر کے آبپاشی کی جا سکے، نتیجۃً، ملک کی پیداوار بڑھ جاتی اور زراعت کو وہ ترقی حاصل ہوتی جس کے نتیجہ میں خوراک کا مسئلہ حل ہو جاتا، اور خوراک کے مسئلہ کے ساتھ سیکڑوں دوسرے ہنگامی مسائل بھی ختم ہو جاتے۔

پانی کے وہ تمام ذخیرے جن کو مسلمانوں نے بہم پہنچاکر ان سے کام لیا اگرچہ وہ تمام تفصیل، آبپاشی کے ذکر سے بے نیاز کرنے کے لئے کافی ہے تاہم خاص اس عنوان کے تحت بھی کچھ معلومات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ آبپاشی کی حد تک مسلمانوں نے کس دل چسپی کا ثبوت دیا اور ان کی رفاہیت عامہ سے دل چسپی رکھنے والی طبیعتوں نے آبپاشی کے کیا کیا راستے نکال ڈالے، لکھا ہے کہ بصرہ میں تنظرہ قرہ بن حیان الباہلی کی طرف منسوب ہے مورخ نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

"اس کے قریب ایک نہر تھی اس نہر کو ام عبداللہ بن عامر نے خرید کر اہل بصرہ کی آبپاشی کے لئے صدقہ کر دیا تھا۔" (فتوح البلدان جلد ۲ ص۱۷۰)

رفاہ خلق سے مسلمانوں کی غیر معمولی دل چسپی کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ ہے کہ عورت تک نے ایک بڑی قیمت صرف کر کے نہر خریدی اور بصرہ والوں کے کھیتوں میں آبپاشی کے لئے اس کو صدقہ کر دیا واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں کو زبوں حالی میں دیکھ کر انھیں ایران کے اسلاف کے قیاس کرنے والے کتنا بھیانک ظلم کر رہے ہیں۔ رفاہیت عامہ سے دل چسپی لینے کے مذاق جس قوم نے نہ صرف مردوں میں بلکہ عورتوں تک میں پیدا کر دیا تھا اسی قوم کو آج دنیا کا سب سے زیادہ معطل عضو ثابت کر کے تاریخ دانی کا عجیب و غریب ثبوت دیا جا رہا ہے، معتضد کے حالات میں ہم کو یہ بھی ملتا ہے کہ

"دجلہ کی ایک نہر دجیل تھی جس کا دہانہ مدتہائے دراز سے بند تھا اس کے اطراف کی زمینیں پانی نہ ملنے کی وجہ سے بنجر ہو گئی تھیں معتضد نے اس کو درست کرا دیا جس سے ایک بڑا علاقہ سیراب ہونے لگا

(تاریخ امت جلد ۵ ص۷۶)

امیر معاویہ کے متعلق تو مورخ نے خاص طور پر اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آبپاشی کا ان کو بڑا ذوق تھا اور اپنے اس مذاق کی وجہ سے زرعی نہروں کا انھوں نے جال بچھا دیا تھا چنانچہ خلاصۃ الوفا میں ہے کہ

کان بالمدینۃ الشریفۃ وما حولھا — "مدینہ شریف اور اس کے اطراف و جوانب میں بہت

عیون کثیرۃ وکان لمعاویۃ اہتمام — سی نہریں جاری تھیں اور امیر معاویہ کو اس کا خاص

بھذا الباب" خلاصۃ الوفا، ص۲۳۶ — اہتمام تھا۔

نہر کظامہ، نہر ازرق، نہر شہدا وغیرہ آبپاشی میں ترقی دینے کے لئے امیر معاویہ کی جاری کرائی ہوئی نہریں ہیں، ان کے اس اقدام سے زراعت میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف ان تالابوں سے جو معاویہؓ نے تیار کرائے، لاکھوں وسق خرما کی پیداوار بڑھ گئی تھی، زراعت میں غیر معمولی کثرت کے یہ اعداد و شمار اس سے پہلے میں نے آپ کے سامنے پیش کئے تھے، غرضیکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو زراعتی ترقیوں سے جو دلچسپی تھی، مورخ نے بھی ضرورت محسوس کی کہ اس کا تذکرہ خاص طور پر کیا جائے۔ مسلمانوں نے اسی آبپاشی کے لئے کچھ ایسی راہیں بھی ڈھونڈ نکالیں تھیں جس کی وجہ سے آبپاشی کا سلسلہ دن ہی میں نہیں بلکہ رات کے اوقات میں بھی جاری رہتا تھا، گویا کہ روز و شب پانی اس طرح کھیتوں میں پہنچایا رہتا تھا کہ آبپاشی کا یہ سلسلہ منقطع نہ ہوتا چنانچہ جی ٹی اسٹرینج، دمشق میں آبپاشی کے ذرائع پر سیر حاصل بحث کرتا ہوا نہر بردا کے متعلق لکھتا ہے کہ

"کوئی قطعہ زمین ایسا نہیں ہے جو اس سے محروم رہ جاتا ہو آبپاشی کا یہ سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے اور مقررہ پیمائش واندازے سے، کہ پانی کی مقدار نہ گھٹتی ہے اور نہ بڑھتی ہے۔"

(بلاد فلسطین وشام ص۳۲۲)

کوئی حد ہے مسلمانوں کی ان اولوالعزمیوں کی۔ کہ دن ہی کے اوقات میں نہیں بلکہ چوبیس گھنٹے، آبپاشی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قایم کر دیا سوچا جا سکتا ہے کہ زراعتی ترقیات کے سلسلہ میں ان کے کیا کیا اہتمام تھے، اور ملکی کثرت پیداوار کے بعد۔ بھوک و غربت کے نہ حل ہوتے سوالات، کس طرح حل ہو گئے ہوں گے۔

زمین کو قابل کاشت بنایا | خوراک کے انھیں مسائل کو جو عوام اور حکومت کے لئے سینکڑوں الجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے حل کرنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تدبیر تھی

کہ بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا جائے، اور کاشتکاروں کے ذریعہ ان افتادہ زمینوں میں زراعت و کھیتیاں کرائی جائیں۔ اس سے پیداوار بڑھ جائے گی، اور نہ صرف غلہ کے مقدار ملکی ضروریات کی تکفل کرے گی بلکہ دوسرے ملکوں کے عوام کو بھی غلہ کی مقدار بہم پہنچا کر، انسانیت نوازی کا ثبوت دیا جاسکتا ہے اور یا ضرورت سے زیادہ مقدار کو فروخت کرکے ملک و عوام کی دوسری ضرورتوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے اس لئے، مسلمانوں نے زمینوں کو آباد کیا اور لوگوں کو ان کے کاشت کے قابل بنانے کے لئے ترغیب دی، اور ملکی آمدنی کا بڑا حصہ اسی مقصد پر صرف کر دیا۔ معتصم کے حالات میں مورخ نے لکھا ہے کہ اس کو زمینوں کو آباد کرنے کا خاص اہتمام تھا اور کہتا تھا کہ

"زمین کی آبادی میں بہت سے فوائد ہیں۔ اس سے مخلوق کی زندگی قایم ہے، ملک کی دولت و ثروت میں اضافہ ہوتا ہے مولیشیوں کے لئے چارہ مہیا ہوتا ہے۔ نرخ ارزاں ہوتا ہے اکسب معاش کے ذرائع مہیا ہوتے ہیں" (تاریخ اسلام ۳ ص ۲۰۹)

اکثر و بیشتر انھیں مقاصد کے پیش نظر مسلمان، زمینوں کو آباد کرتے تھے، اور جب کبھی ان کو موقع ملتا تو بنجر اراضی کو ضرور آباد کرتے، مسلمانوں نے جب عجمیوں سے جنگ کی تو ان ہنگامی حالات میں مدہوا شگاف بڑھ گئے اور ان کے بند کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اس وجہ سے بطیحہ بڑھ گئی اس کے بعد

"بنو امیہ نے اس میں سے کچھ زمینیں نکالیں اور ان کو قابلِ زراعت بنایا" (فتوح البلدان ا ص ۵۰۴)

المہدی نے نہر الصلہ کو کھود نے کا حکم دیا اس کے نتیجہ میں جو فائدے عوام کو پہنچے ان میں ایک یہ فائدہ بھی ہوا کہ

"آس پاس کی زمینیں قابل کاشت ہوگئیں" (ایضاً ص ۵۰۰)

ورثان کے متعلق یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ اس کو مروان بن محمد بن مروان بن حکم نے بنوایا اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ

"اس کی زمین لائق کاشت بنائی" (ایضاً ۲ ص ۶)

(باقی آئندہ)

مصری انقلاب کی کہانی انور السادات کی زبانی

از
(جناب عابد رضا صاحب بیدار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

"نئے مصر کے سابق وزیر امور مذہبی، جمال عبد الناصر کے دست راست، نیم سرکاری اخبار الجمہوریہ کے ایڈیٹر، اور مصر کی تنہا سیاسی پارٹی کے جنرل سکریٹری انور السادات نے مصری انقلاب پر "النیل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو مصری انقلاب کی سب سے زیادہ معتبر کہانی سمجھی جا سکتی ہے میں نے اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن سے تفصیلی خلاصہ کے طور پر مندرجہ ذیل مضمون تیار کیا ہے، جس میں الفاظ زیادہ تر مصنف ہی کے ہیں، میرے تقریباً بالکل نہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ایک دو غیر ضروری تفصیلوں کے سوا اصل کتاب کا تمام و کمال مضمون اردو میں منتقل کر دوں اور شاید میں اپنی کوشش میں ناکام نہیں ہوں۔"

۱۹۳۸ء میں عباسیہ کی فوجی اکادمی کے چند گریجویٹ منکاباد کے محاذ پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہاں ان کا سارا دن اسکیمیں بناتے گذرتا اور راتیں ان پر بحث میں کٹ جاتیں مصر تباہ حال ہے اسے تباہی سے بچانا ہے، مگر کیسے! اسی گروپ میں ایک نوجوان جمال عبد الناصر تھا، سنجیدہ متین اور کچھ اداس اداس، کیمپ پر آگ کی ہلکی ہلکی آنچ کے گرد باتیں چھڑ جاتیں اور جمال، سب پر حاوی صرف ایک بات کرتا، انقلاب کی بات، سامراج، جاگیرداری اور شاہیت کے خلاف انقلاب!

۱۹۳۹ء کے شروع میں منکاباد میں اس گروپ نے ایک خفیہ انجمن بنالی جس کا مقصد مصر کو آزاد کرانا تھا، ۴۲ء میں اس انجمن کی متعدد شاخیں بھی قایم ہو گئیں۔ رات کی تاریکی میں ہم لوگ اپنا کام کرتے رہے۔

۳۹ء ہی میں جنگ چھڑ گئی اور ہم سب ساتھی بکھر گئے۔ جمال کو سوڈان بھیج دیا گیا جہاں اسے عبد الحکیم عامر مل گیا۔ بہت جلد دونوں نے سمجھ لیا کہ دونوں ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں جنگ نے برطانیہ کو پھر ہمارے اوپر مسلط کر دیا تھا اور مصری اسے بری طرح محسوس کر رہے تھے۔ مسلسل

برطانوی زور کے باوجود وزیر اعظم علی ماہر نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر اعلان جنگ کرنے سے انکار کر دیا مگر برطانیہ کافی مضبوط پوزیشن میں تھا، علی ماہر کو وزارت چھوڑنی پڑی۔ ادھر جنگی پانسہ برطانیہ کے خلاف پڑ رہا تھا۔ نومبر ۴۰ء میں چرچل برطانیہ کا وزیر اعظم ہوگیا اور خطرہ کا احساس کرتے ہوئے اس نے مصری فوج سے ہتھیار لے لینے کا حکم دیا —— قاہرہ میں ہم بچھڑے ہوئے ساتھی پھر مل گئے!

انقلابی کونسل نے مجھے شیخ حسن البنّا اور سپہ سالار عزیز المصری سے ملنے پر مامور کیا۔ میں اس وقت لفٹننٹ تھا، ۲۴ سالہ لفٹننٹ۔ حسن البنّا سے پہلی دفعہ مل کر بے حد متاثر ہوا۔ اخوان المسلمون کی بنیاد ۱۹۳۰ء میں پڑی۔ اخوان کا مقصد فرد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ، ایک صالح جماعت کی تنظیم تھا۔ شروع میں اس کا کوئی سیاسی مقصد نہ تھا۔ مرشد اعلیٰ کی اخلاقی خوبیاں مصری نوجوانوں کو کھینچ کھینچ کر اس کے گرد جمع کر رہی تھیں۔ بہت جلد اخوان ایک غیر معمولی پوزیشن حاصل کر گئی اور اسے اپنی سیاسی اہمیت کا بھی احساس ہونے لگا، ممبروں کو فوجی تربیت دی جانے لگی۔ یہی مہلک غلطی تھی۔ اب اچھے بُرے سب ہی اخوان میں شامل ہونے لگے اور وہ روز بروز مذہبی تقشف اور عام بدامنی کا مظہر بنتی گئی مگر اس حالت میں بھی ہم لوگوں کے لئے ایک کار آمد مددگار ہو سکتی تھی!

میں مرشد اعلیٰ سے دوبارہ، اخوان کے ہیڈ کوارٹر پر ملا، کافی دیر تک گفتگو رہی۔ حسن کا خیال تھا کہ مصر کا عروج، دین کے عروج سے الگ کوئی چیز نہیں اور بنیاد اسی پر ہونی چاہیے۔ اسی لئے فوج میں اسلامی اصولوں کی نشر و اشاعت ہونی چاہیے۔ اس کے بعد سے ہم آپس میں مسلسل ملتے رہے، فوج میں اخوان کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ اخوان کے ہیڈ کوارٹر پر اسلحہ جمع ہونے لگے۔ ایک بار خود میرے سامنے ریوالور بھرا ایک بکس آیا —— اور میں خوشی سے اچھل پڑا! ہماری خفیہ انجمن کی بابت مرشد اعلیٰ کو سب کچھ معلوم تھا اور اس نے مجھ سے کبھی اخوانی بننے کو نہ کہا —— میں اخوانیوں اور انقلابیوں کے درمیان قاصد کا کام کرتا رہا۔

پھر ایک دن ——— ہمیں خبر ملی کہ برطانیہ کے اشارے پر جنرل عزیز المصری کو برخاست کر دیا گیا ہے۔ مجھے معلوم تھا مرشد اعلیٰ، جنرل کا دوست ہے، میں نے اس سے جنرل سے ملوانے کے لئے کہا، اس میں انتہائی رازداری کی ضرورت تھی۔ حسن نے مجھے ایک پرچہ پر، اس کے ملنے کا پتہ لکھ دیا۔ مجھے ڈاکٹر ابراہیم حسن نائب صدر، اخوان المسلمون، سے ملنا تھا، جہاں عزیز المصری میرا منتظر تھا۔ عمر رسیدہ جنرل میں ابھی تک کافی طاقت اور توانائی تھی، وہ برطانیہ کے لئے ایک مستقل خطرہ تھا۔ فوجی تنظیم اور جنگی تدابیر میں بوڑھا جنرل انتہائی مہارت رکھتا تھا۔ وہ ۱۹۱۴ء کا آزمودہ کار سپاہی تھا۔ ۳۶ء میں وہ انگلستان میں فاروق کا اتالیق تھا اور وہیں سے وہ فاروق سے مایوس ہو چلا تھا۔ بعض حاسدوں کے کھٹر کانے پر فاروق نے جنرل کو الگ بھی کر دیا تھا۔ یقین محکم اور عمل پیہم! عزیز المصری نے مخاطب ہو کر کہا، اور الفاظ میری رگوں میں تیرنے لگے!

ہم سب مل کر لیبیا میں جرمنوں سے تعلقات بڑھانے لگے، مارچ ۴۱ء میں عزیز المصری کے توسط سے جرمنوں کے ساتھ مل جانے کی سکیم بنی، ایک جرمن ہوائی جہاز ہم لوگوں کو اڑا لے جانے پر تیار ہو گیا۔ پروگرام مکمل تھا مگر ——— عزیز المصری کی کار، راستے میں خراب ہو گئی، جرمن جہاز مقررہ وقت پر آیا، تھوڑی دیر انتظار کیا، پھر واپس چلا گیا۔ پھر ایک دوسرے جہاز سے جانے کا بندوبست ہوا، وہ جل گیا! قسمت ابھی ساتھ نہیں تھی! اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو جرمنوں سے مل کر ہم اسی وقت برطانیہ کو ختم کر چکے ہوتے۔

۴ر فروری ۴۲ء کو مصری قومی تاریخ میں ایک حادثہ رونما ہوا۔ وزیر اعظم حسین سری، باوجود اپنی برطانیہ دوستی کے، برطانیہ کی حمایت حاصل نہیں کر سکا۔ سفیر برطانیہ نے فاروق کو الٹی میٹم دے دیا کہ یا تو ۲۴ گھنٹے کے اندر نحاس پاشا کو وزارت عظمیٰ سونپ دی جائے یا تخت چھوڑ دیا جائے۔ فاروق کو جھکنا پڑا! اس دن سے فاروق بالکل بدل گیا۔ اس کے دن راتیں ہو گئیں اور راتیں دن۔ محل اور محل کی رنگینیاں اس کی ساری کائنات ہو کر رہ گئیں۔ وہ روز بروز موٹا اور وقت سے پہلے عمر رسیدہ ہوتا گیا، یہ ایسا نفسیاتی دھکا تھا جس سے وہ سنبھل نہ سکا۔ دوسری جانب،

انقلابیوں کے غم و غصہ کی انتہا نہ تھی۔ جدید مصر کی تاریخ میں اس قسم کا واقعہ ایک اجنبی چیز تھی، انقلابی تحریک اور زیادہ پرزور اور منظم ہونے لگی۔ ممبروں کی بھرتی تیزی پکڑتی گئی۔

اسی سال جمال عبدالناصر ملٹری کالج میں لکچرر ہو گیا اور نئی نسل کو انقلابی روح سے آشنا کرنے میں اسے بڑی آسانی ہو گئی ادھر کوئی ۲ برس کے لئے بدکردار وفد حکومت مصر پر مسلط ہو گئی تھی۔ وفد پارٹی مصریوں میں روز بروز اپنا وقار کھوتی جا رہی تھی اور ——— اخوان کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ میں نے جرمنوں سے ایک طرف، اور مرشد اعلیٰ سے دوسری طرف، مدد کی درخواست کی جو مان لی گئی۔ اگست ۴۲ء میں دو جرمن، نازی، جاسوسوں کی گرفتاری نے ہم لوگوں کو بھی خطرے میں ڈال دیا، اور میں تیسرے دن گرفتار کر لیا گیا۔ میرے بعد وسیع پیمانے پر اور گرفتاریاں ہوئیں مگر ہماری انجمن خفیہ ہی رہی۔ ادھر جرمن فتح کی امیدیں بھی ۱۹ اکتوبر ۴۲ء کی جرمن شکست سے دھندلا سی گئیں۔

گرفتاری کے بعد مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے گھر کی طرف سے تھی، گھر والوں کی روزی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ایک دن ایک دوست ملنے آیا اور اس نے بتایا کہ انقلابی کونسل نے ۱۰ پونڈ ماہانہ کا انتظام کر دیا ہے انقلابی کونسل نے یہ طے کیا تھا کہ اس کا کوئی ممبر اگر کسی آفت میں پھنس جائے تو اس کے خاندان کی کفالت کی جائے۔ اکتوبر ۴۴ء میں احمد ماہر نے وزارت سنبھالی۔ تمام قیدی چھوڑ دیئے گئے لیکن ہم لوگ نہیں۔

حسن البنا، اب، مصر کا سب سے طاقتور آدمی تھا۔ فاروق اس کی طاقت سے واقف تھا، لیکن حسن بھی اب کافی بدل چکا تھا۔ اب اسے قوم کے مقابلے میں اخوان کی زیادہ فکر تھی، جو روز بروز سیاست میں الجھتی جا رہی تھی۔ میرا دوست عبدالمنعم عبدالرؤف بھی اس میں شامل ہو گیا۔ (۲۸ اکتوبر ۵۴ء کو جمال عبدالناصر پر حملہ کی کوشش میں ماخوذ ہوا، اور مصر سے بھاگ گیا، معلوم نہیں اب کہاں ہے)

نومبر ۴۴ء میں، میں جیل سے بھاگ نکلا۔ بھیس بدل کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔

یہاں تک کہ ۴۵ء میں مارشل لا ختم ہو گیا۔ انقلابی کونسل نے اپنی از سر نو تنظیم شروع کی اسے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا، پہلا ملٹری حصہ اور دوسرا عوامی حصہ۔ پہلا جمال کی سربراہی میں رکھا گیا اور دوسرا مجھے سونپا گیا، دونوں کو آخری لمحہ تک الگ الگ کام کرنا تھا!

فروری ۴۵ء میں وزیر اعظم احمد ماہر نے جرمن۔ جاپان سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ اسی روز ایک اخوانی نے اسے پارلیمنٹ میں مار دیا۔ پھر نقراشی نے اس کی جگہ لی۔ نقراشی نے سفیر برطانیہ سے ملاقات کی اور برطانیہ کے مصر اور سوڈان کو خالی کرنے کے وعدے یاد دلائے۔ سفیر کا برتاؤ بہت برا رہا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ ابھی مصر یا سوڈان خالی کرنے کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ مجھے خبر ملی تو غصہ کی انتہا نہ تھی، میں نے جمال سے کہا، سفارت خانہ اڑا دوں! جمال نے کہا نہیں، ۴۲ء کی لی اسٹاک کے قتل کی کہانی دوبارہ نہیں دہرائی جانی چاہیئے!

رفتہ رفتہ تمام سیاسی پارٹیاں برطانیہ کے زیر عاطفت آتی جا رہی تھیں، وفد اور سعدی پارٹی سے لے کر شاہ تک سب کے سب برطانیہ کے زیر نگیں تھے، صرف ایک اخوان تھی جو اس اثر سے بچی ہوئی تھی۔ میں مرشدِ اعلیٰ سے پھر ملا۔ حسن نے مجھے بتایا کہ فاروق اخوان کا جانی دشمن ہے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ ہم شہنشاہیت ختم کرنا چاہتے ہیں، اور یورپی لوگ بھی مخالف ہیں کیوں کہ ہم موجودہ قانون کی جگہ اسلامی قانون لانا چاہتے ہیں۔

۸ مئی ۴۵ء کو جرمنی سے جنگ ختم ہو گئی، ہماری سرگرمیاں اور ممبر سازی کی کوششیں اور تیز ہو گئیں ہمارے ممبروں کی صحیح تعداد اور ان کے نام، صرف عامر اور جمال عبد الناصر کو معلوم تھے۔ پھر گرفتاریاں شروع ہو گئیں اور کسی کی مخبری پر میں بھی ۲ ½ سال کے لئے جیل پہنچا دیا گیا مئی ۴۵ء سے جولائی ۵۲ء تک کا زمانہ مصریوں کے لئے سب سے تکلیف دہ زمانہ تھا۔ آزادی تحریر و تقریر ختم ہو چکی تھی ہر طرف خوف و ہراسانی تھی۔ دوسری جانب کمیونزم اور اخوان نے بھی زور پکڑنا شروع کر دیا تھا، اخوان نے ہم سے خوان میں منضم ہو جانے کے لئے کہا، مگر جمال نے انکار کر دیا! جنرل عزیز المصری بھی ان کے تقشف اور تشدد کے سبب ان میں مل جانے کے

خلاف تھا اس کے باوجود ہم میں سے بہت سے اخوان کے ممبر نہیں تو ہمدردوں میں ضرور تھے
تاہم ہم لوگوں کا اخوان کے ساتھ اتحاد بڑا مصنوعی سا تھا۔

اگست ۴۵ء میں نقراشی نے اعلان کیا کہ برطانیہ سے ایک نئے معاہدہ کی بات چیت کی جانے والی ہے، سوڈان مصر سے ملانے اور مصر خالی کرنے کی بات چیت۔ نومبر میں گفت و شنید شروع ہوئی مگر نتیجہ بے سود! وزارت تبدیل ہو گئی۔ نقراشی کی جگہ اسماعیل صدقی نے لی اور گفت و شنید کا اعلان کیا۔ ادھر مصر میں برطانیہ کے خلاف فسادات شروع ہو گئے۔ وزیر اعظم اٹیلی نے اسکندریہ اور قاہرہ سے تمام دستے واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔ ۴ر جولائی ۴۶ء تک قاہرہ خالی ہو چکا تھا، اس اعلان کے ساتھ کہ پہلی مئی ۴۷ء تک پورا مصر خالی ہو جائے گا، اسماعیل صدقی نے اخوان سے مصالحت کر لی۔ ادھر دسمبر ۴۶ء میں اس نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کی بات چیت مکمل کر لی مگر ایک اخبار نویس کی چابکدستی سے، معاہدہ منظوری سے پہلے کھل گیا، نتیجہ میں اسماعیلی وزارت بھی ختم ہو گئی۔ ۲۷ر جنوری ۴۷ء کو پھر نقراشی نے وزارت سنبھالی۔ اس نے برطانیہ سے گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کرنے کا اعلان کر دیا اور معاملہ اقوام متحدہ میں پہنچا دیا۔ لیک سکسٹن میں نقراشی نے مصر کا مقدمہ اچھی طرح لڑا، اگرچہ اسی اثنا میں نحاس پاشا نے کونسل ایک تار بھیج دیا کہ نقراشی پاشا مصر کا نمائندہ نہیں اور ہم "وفدی" آپ کے فیصلے کے پابند نہ ہوں گے۔ انفرادی خود غرضیاں، مصر کی قسمت پر اثر انداز ہو رہی تھیں! . . . .

. . . رے ممبروں کی تعداد . . . ا سے زیادہ پہنچ چکی تھی۔ اخوان سے ہم بالکل الگ ہو چکے تھے۔ ۴۸ء میں یہودی بحران ابھرا۔ فلسطین کا مسئلہ سیدھا سادا، مشرق وسطیٰ میں سامراجی اقتدار کا براہ راست ورثہ ہے۔ یہودی دہشت پسند مار دھاڑ میں لگے ہوتے تھے برطانوی انتداب ابھی ختم نہ ہوا تھا اس لئے حکومت مصر نے صرف رضا کاروں کو جانے کی اجازت دی۔ ہم لوگ جمال عبد الناصر کے ساتھ، حسن البنا سے ملے اور مفتی امین الحسینی سے رابطہ پیدا کیا اور عرب لیگ سے اپنی مساعی کو ہم آہنگ کیا۔ ۱۵ر مئی کو برطانیہ نے فلسطین چھوڑنے کا

اعلان کیا۔ نقراشی نے غیر سرکاری طور پر فوجوں کو فلسطین پر مارچ کا حکم دے دیا۔ مگر ہمیں صرف رائفلیں مہیا کی گئیں اور آخر میں چند توپیں بھی۔

جنگ بنتروم کے بعد شاہ عبداللہ تو الگ ہو گیا اور اپنا مالِ غنیمت کا حصہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مصری فوجیں باقاعدہ اسلحہ در تیاری کے بغیر شریک ہوئی تھیں۔ دشمن کی صحیح تعداد بھی معلوم نہ تھی۔ حد درجہ ناکارہ اسلحہ مہیا کئے گئے تھے۔ غم و غصہ میں بھرے ہوئے فوجی انتقام کے لئے بے چین تھے ——— جنگِ فلسطین بھی مصری انقلاب کا طائمہ بیش رس بن گئی۔ اخوان نے فلسطینی شکست کے بعد عام مایوسی اور غم و غصہ کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا، ۱۹۴۸ء تک غالباً، اخوانیوں میں کمیونزم راہ پا چکا تھا اور اب اخوان دہشت پسند بن چکے تھے۔ فلسطینی جہاد میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دی تھیں اور اب اس کے بعد مصر میں بے حد ہر دلعزیز تھے۔ ۱۵ر دسمبر ۴۸ء کو نقراشی پاشا نے اخوان کو توڑ دئے جانے کا حکم دیا۔ تین دن بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ نقراشی خود بھی مصر میں کافی ہر دل عزیز تھا اس لئے اخوانیوں کے اس فعل پر کافی چرچے ہوئے۔

ابراہیم عبد الہادی نقراشی کا جانشین ہوا اور اس نے سخت ایکشن لیا۔ مارچ ۴۹ء میں خفیہ پولس نے حسن البنا کو قتل کر دیا۔ البنا کی جگہ اخوان کی سربراہی حسن الہدیبی کے سپرد ہو گئی ۱۵ر نومبر ۴۸ء سے مارشل لا چل رہا تھا۔ عبد الہادی ڈکٹیٹر بنا ہوا تھا، اخوانیوں سے نبٹ کے اب وہ ہماری طرف رجوع ہوا۔ جمال عبد الناصر کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اس کے گھر کی تلاشی ہوئی مگر تلاشی میں کچھ نہ نکلا اور جمال محفوظ رہا۔

فلسطینی جنگ میں ہمارے بہت سے کارکن کام آ گئے تھے۔ ہماری نئی تنظیم ہوئی اور نئی مجلسِ عاملہ بنی جس میں میرے علاوہ جمال عبد الناصر، عامر، کمال الدین حسن، عبد المنعم عبد الرؤف، صلاح سالم، جمال سالم، عبد اللطیف بغدادی اور خالد محی الدین شامل تھے ۱۹۵۰ء میں جمال اس کا صدر منتخب ہوا اس وقت وہ میجر تھا اور تیس کے لگ بھگ تھا ہم لوگ عوام میں انضباط الاحرار، یا آزاد افسروں کے نام سے مشہور تھے۔ اسی نام سے ہمارے

پمفلٹ نکلتے تھے۔

اب ہمارا مینی فسٹو نکلا جس میں ہم نے بیرونی حکومت کو ختم کرنے، مضبوط قومی فوج بنانے اور جمہوریت بنانے کا وعدہ کیا۔

جولائی ۴۹ء میں عبدالہادی کی جگہ حسین ثنبری نے لی۔ جنوری ۵۰ء میں انتخابات ہوئے جن میں ۲/۳ نشستوں پر وفد قابض ہوگئی۔ نحاس پاشا کی وزارت بنی اور پھر وہی پرانا محل اور وفد کا جھگڑا چلنے لگا۔ اسی اثنا میں مصر ایک معاشی بحران سے دوچار ہو رہا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد کے ۵ برس کے اندر مصر میں معیارِ زندگی ۴ گنا مہنگا ہو چکا تھا جب کہ مزدوری صرف دگنی ہو پائی تھی۔ نحاس نے عوام کو جیتنے کی ایک اور کوشش کی۔ ۶/اکتوبر ۵۱ء کو پارلیمنٹ نے ۳۶ء اور ۱۸۹۹ء کے معاہدے منسوخ کر دیے۔ چند روز بعد میڈو کی تجویز سامنے آئی، اسے بھی رد کر دیا گیا ۔۔۔۔۔۔ گوریلا جنگ شروع ہوگئی۔ عام اسٹرائک ہونے لگی۔ پُل اور پائپ لائنیں اڑنے لگیں، انگریزی سامان کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ ہم لوگ بھی وفد کو عزت سے دیکھنے لگے اور ان کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ وفد کے معتمد، فواد سراج الدین کو احمد انوار کے ذریعہ ہم نے اس صورت میں اپنی حمایت کی پیشکش کی اگر شاہ کو بالکل ختم کر دیا جائے یا کسی قدر اس کے اختیارات کم کر دیے جائیں، وفد کے معتمد کو ہماری بات نے کچھ زیادہ اپیل نہیں کی۔

ادھر فاروق کو فوج میں اس قسم کی ہلچل کا پتہ چل گیا ہماری کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور اور مارچ ۵۲ء میں انقلاب بسطے ہوا لیکن عین وقت پر اسے رشاد مہنّہ کی منافقت کے سبب ملتوی کر دیا گیا۔ ادھر گوریلا جنگ جاری تھی، برطانیہ بھی گاؤں کو تباہ کر رہا تھا۔ ۲۶/جنوری ۵۲ء کو عام شہریوں میں بے انتہا ناراضگی پھیل گئی اور قاہرہ میں سینما اور کیفے جلا دیے گئے بنک لوٹ لئے گئے اور پولیس خاموش تھی۔ دوسرے دن فاروق نے نحاس کو الگ کر دیا۔ وزارت علی ماہر کے سپرد ہوئی اور ۳۲ دن بعد علی ماہر کی جگہ نجیب الہلالی نے لے لی۔ الہلالی نے وفدی پارلیمنٹ توڑ دی اور سراج الدین، وفدی معتمد، کو ملک بدر کر دیا۔۔ ۳۰/جون کو الہلالی کو بھی

حسین سرّی کے لئے جگہ چھوڑنی پڑی۔

اس دوران میں ہم بزرگ قائد کی تلاش میں تھے جسے انقلاب کے نشان کے طور پر آگے رکھا جا سکے۔ عزیز المصری کافی بوڑھا تھا، اس نے انکار کر دیا، جنرل فواد صادق دوسری طرف مل گیا۔ بس ایک محمد نجیب بچا تھا جس نے ہماری انقلابی تحریک میں کوئی حصہ نہ لیا تھا ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے مشہور تھا اور تین بار میدانِ جنگ میں زخمی ہو چکا تھا۔ دسمبر ۵۱ء سے ہم لوگوں نے جنرل سے تعلقات پیدا کئے اور آزاد افسروں نے اسے فوجی کلب کا صدر چن لیا ——— ہم نے اس کے گرد ایک خوبصورت ہالہ بن دیا، اور وہ مصر کا جارج واشنگٹن بن گیا۔ ۲۱ر جولائی ۵۲ء تک نجیب خود اپنے رول سے ناواقف تھا۔ ۲۱ر جولائی کو حسین سرّی کی بجائے پھر الہلالی وزیر اعظم ہو گیا، ۶ مہینے میں یہ پانچویں وزارت تھی ——— اور پھر ۲۲ کو وہ دن آ گیا جس کا ہم دس سال سے انتظار کر رہے تھے۔

انقلاب ۱۱ بجے رات سے شروع ہوا، اور صبح، جب سب کچھ ہو چکا تھا، تو نجیب کو معلوم ہوا اور وہ ہمارے پاس آیا۔ "مبارک ہو میرے بچو" اس نے کہا جنرل کو انقلابی فوج کا سپہ سالار بنا لیا گیا۔ علی ماہر کو وزارتِ عظمیٰ دلوا دی گئی، ۲۶ر جولائی کو اسکندریہ اور شاہی محل پر قبضہ ہو گیا اور امریکی سفارت خانہ کے بیچ میں پڑنے پر فاروق کی جان بخشی ہو گئی مگر اس الٹی میٹم کے ساتھ کہ وہ اپنے بچے کے حق میں دستبردار ہو کر مصر چھوڑ دے۔

"محروسہ، جہاز میں ۲۰۰ ٹن کے قریب شاہی مال لادا گیا، جنرل نجیب، جمال سالم اور حسین شافعی جہاز پر گئے۔ فاروق نے جنرل کو سلامی دی اور بولا، جنرل، اگر تم یہ نہ کر گذرتے تو خود میں بھی یہی کرتا!" معلوم نہیں اس سے فاروق کا کیا مطلب تھا! ——— اور میں، کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے جہاز پر کھڑا، فاروق کو تاریخ کی [illegible] میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا!!

آہ! ابوالکلام

ایک تاثر ـــــ

از

(جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی دہلی)

آج اگر قلم میں روانی ہوتی تو رگِ سنگ سے لہو ٹپکنے لگتا۔

اگر فصاحت و بلاغت یوں بے جان و بے روح نہ ہوتیں تو پتھر کے دل پگھل جاتے۔

اگر خطابت یوں خاموش اور مہر بہ لب نہ ہوتی تو آسمان خون کے آنسو رونے لگتا۔

لیکن ـــــ

آج قلم خود نوحہ کناں ہے کہ صاحبِ قلم نہ رہا۔

فصاحت و بلاغت خاک بسر ہیں کہ کوئی ان کا ادا شناس نہیں رہا۔

خطابت غمگین ہے کہ اس کا کوئی رمز شناس باقی نہیں۔

ـــــ مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادرہ کار صاحبِ قلم، ایک فصیح و بلیغ مقرر، ایک جادو بیان اور آتش نوا خطیب ہی نہیں، آزادی کے مجاہد اور نئے ہندوستان کے معمار بھی تھے۔ وہ اس صحیفہ کا آخری ورق تھے جس کی تزئین و آرائش میں علم و فضل کی بہترین روایات شامل تھیں۔ وہ ہندی اسلامی تمدن کی مایہ ناز پیداوار اور اس علم و فکر کا کامل نمونہ تھے جس کی مثال حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد ملنا ممکن نہیں۔ لیکن ان کی غیور طبیعت کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ حال کو "بلا معاوضہ" ماضی کے قرض سے گراں بار کر دیا جائے اس لئے ان کا گوشۂ چشم ہمیشہ مستقبل کی طرف رہا۔ ان کے خطبات اور الہلال اور البلاغ کی تحریروں اور کانگریس کی رودادوں کو پڑھئے اور ۱۹۴۷ اور ۱۹۴۸ کے واقعات پر غور کیجئے حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر تاریکی

کے کتنے پردوں کو نفوذ کر سکتی تھی۔

گاندھی جی کے نورتنوں میں مولانا آزاد غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کی ۶۹ برس کی زندگی میں آزادی کی جد و جہد اور اس کی بہت سی منزلیں سمو گئی تھیں اس لئے ان کی صدارت و قیادت ہماری تاریخ کا سب سے اہم باب ہے۔ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی وزیر معارف اور کانگریس کے رکن رکین کی حیثیت سے کون سا فیصلہ ہے جس پر ان کا اپنا نقش نہیں۔ یہ سب کام صرف قدیم تمدن کی گہرائی یا پختگی کی بدولت ممکن نہیں۔ جب تک اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور شامل نہ ہو۔

زندگی بسر کرنے کے لئے ایک اعلیٰ اور شورش انگیز مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے مقصد اور منزل و محمل کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اور جب فیصلہ کر لیا تو اس پر سختی کے ساتھ جم گئے یہاں تک کہ پہاڑ ہل گئے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ان کا مقصد بلند تھا اس لئے ان کی وفا کا درجہ بھی بلند تھا۔ اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت کرتی ہے۔ اس راستہ میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں، کیسی کیسی سختیاں جھیلیں، کس کس طرح کی ذلتیں اٹھائیں ——— ان مخلصانہ قربانیوں کی داستان ہماری نئی نسل کو جو پچھلی روایات اور تاریخ سے بے بہرہ ہوتی جاتی ہے، ایمان اور یقین کی ایک نئی دولت بہم پہنچا سکتی ہے۔ مسلم لیگ والوں نے کون سا الزام ہے جو ان کو نہیں دیا کون سی ناملائم بات ہے جو ان کے خلاف نہیں کہی لیکن وہ ان سب چیزوں کو دریائے بے تابی کی ایک موجِ خوں سمجھ کر برداشت کرتے رہے اور تحریر و تقریر دونوں میں ہمیشہ ان کا رویہ یہی رہا کہ

آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

قطرہ کو گہر بننے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں لیکن موتی بننے کے بعد وہ بے پناہ ہو جاتا ہے اس کو کوئی خطرہ نہیں رہتا یہ دریا کا طوفان اسے منتشر نہیں کر سکتا۔ اس سے برابر نور کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ مولانا کی زندگی اس "پرافشانی نور" کی بہترین مثال ہے، لیکن

گوہر کو جامد سمجھنا صحیح نہیں - مولانا مرحوم نے یہ نور افشانی حکمت اور بصیرت سے کی ہے جس کا ان کو بڑا حصہ ملا تھا - ان کی زندگی میں نئے تقاضوں کا احترام، اور مستقبل کی نبض شناسی موجود تھی - آزادی کے بعد جس تفکر و تدبر، جس دیدہ وری اور تعمیری صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی اور اس کی جھلک ان تمام نقشوں میں نظر آتی ہے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد خوب سے خوب تر کے اصول پر بنائے تھے - یہی حال ان کی تحریروں کا ہے جن میں زمانہ کی نبض چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے - ان کی ابتدائی نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام تیور موجود ہیں - فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے - الفاظ میں نقارہ و دہل کا سا شور اور ہنگامہ ہے - جملوں میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے جس نے مصلحتوں کی برف کو پگھلا دیا اور محاربی فطرت میں آگ سی لگا دی - لیکن یہ شان دار اور پر شکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی - غبار خاطر اور کاروان خیال کا اسلوب دوسرے موثرات خارجی کا نتیجہ ہے اسی لئے اس میں ادب اور لطافت کی جو گلکاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں - ترجمان القرآن کے مقدمہ میں جو سادگی اور پرکاری ہے اس کا اردو میں جواب نہیں - یہ معلوم ہوتا ہے کوثر و سلسبیل کی موجیں ہیں جو بہ نکلی ہیں -

حضرت مولانا زندگی کو ایک فریضہ سمجھتے تھے جسے انجام دینا چاہیئے ایک بوجھ جسے خندہ پیشانی سے اٹھانا چاہیئے - ان کا خیال تھا کہ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری بھی ہے -

حضرت مولانا "باغ وجود" کے "ثمر بیش رس" تھے اور ان کی "نمود" میں ایک طرح کی "غرابت" تھی یعنی وہ لوحِ جہاں پر حرف مکرر نہیں تھے - اور ظاہر ہے کہ یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی - مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، معاشرت میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے - ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند تھا -

مولانا نئی ہندوستانی تہذیب کا محل، انسانیت اور رواداری کے وسیع تصور پر قایم کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے اس کی بنیادوں کو سلامت روی، بے لاگ صداقت، خدا پر بھروسہ اور حق کی فتح کے یقین سے بھرا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسا حسن تناسب اور ایسی دل کش ہمواری تھی کہ وہ ہر مشکل مسئلہ کو طے کر سکتے تھے۔ اور ان کا ناخن تدبیر ہر گتھی کو با آسانی سلجھا سکتا تھا۔ کتنا ہی ٹیڑھا اور الجھا ہوا معاملہ کیوں نہ ہو، تھوڑی سی گفتگو کے بعد حقیقتِ حال ان کی گرفت میں آجاتی تھی اور جب وہ نکتہ کو پکڑ لیتے تھے تو پھر اس کو چھوڑتے نہ تھے۔ معاملہ کو صحیح نظر سے دیکھنا اور اس کو اس طرح پیش کرنا کہ بات ذہن نشین اور خاطر نشان ہو جائے معمولی سعادت نہیں

ہندوستانی تہذیب کی بنیادی خصوصیتیں انسانیت اور رواداری ہیں۔ مولانا میں یہ خوبیاں صفت کے طور پر نہیں آئی تھیں ان کی ذات کا جزو تھیں۔ انھوں نے اسلام سے اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہیئے تھا۔ اس لئے ان کے تخیلات کی جڑیں دور تک چلی گئی تھیں۔ اور اس لئے اس ورثہ کی جھلک ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہے لیکن ان کی یہ بڑائی ہے کہ ان کا تعلق صرف ماضی ہی سے نہیں، حال اور مستقبل دونوں سے ہے اس لئے ان کے کارنامے زندہ رہیں گے اور ان کے کارناموں کی پرچھائیاں نئے ہندوستان میں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

ادبیات

غزل

از

(جناب آلم مظفر نگری)

جب کوئی دعائے نیم شبی ممنونِ اثر ہو جاتی ہے
آتے ہی لبوں تک وہ میرے پیغامِ سحر ہو جاتی ہے

الفت میں متاعِ جان و دل برباد اگر ہو جاتی ہے
ہونے دو کہ اس بربادی سے توقیرِ بشر ہو جاتی ہے

سینے میں کھٹکتی رہتی ہے نشتر کی طرح الفت کی خلش
یہ پھانس یونہی رفتہ رفتہ پیوستِ جگر ہو جاتی ہے

اپنی ہی طرف رکھتی ہے نظر اوروں کی برائی کیا دیکھے
وہ آنکھ جسے اس دنیا میں تمیزِ ہنر ہو جاتی ہے

کچھ کام ذرا ہمت سے لے لے راہ میں تھک جانے والے
تو چل تو سہی خضرِ منزل خود راہ گزر ہو جاتی ہے

بے وقت جنوں میں کر ڈالے کیوں میں نے گریباں کے پرزے
کب فصلِ بہاراں آئے گی اتنی تو خبر ہو جاتی ہے

اس وقت حقیقت کھل جاتی ہے اس پر سوزِ نہاں کی
آگاہ مذاقِ پروانہ جب شمعِ سحر ہو جاتی ہے

ہنگامۂ محشر کو آخر اور اس کے سوا میں کیا سمجھوں
دنیائے محبت ہی شاید کچھ زیر و زبر ہو جاتی ہے

وہ دعوتِ جلوہ سے تسکین دیتے ہیں مجھے اللہ رے کرم
بے چین اگر دم بھر کے لئے بھی تابِ نظر ہو جاتی ہے

کیوں لطفِ مصیبت کھوتا ہے انجامِ مصیبت کی دھن میں
وہ شام نہیں ہے شامِ جدائی جس کی سحر ہو جاتی ہے

جب ذوقِ تماشا بڑھ جاتا ہے حدِ تعین سے آگے
اس وقت دو عالم کی ہر شے محدودِ نظر ہو جاتی ہے

ایسا بھی اک عالم ہوتا ہے دو گھونٹ بمشکل پیتا ہوں
کیا جانئے میری بادہ کشی کو کس کی نظر ہو جاتی ہے

ہم لے کے سہارا جب دل کا وادیٔ جنوں میں بڑھتے ہیں
منزل بھی ہمارے ساتھ آلم سرگرمِ سفر ہو جاتی ہے

تبصرے

مقدمۂ تفسیر نظام القرآن ضخامت ۶۰ صفحات قیمت ۱۲/

(۲) اقسام القرآن ضخامت ۱۴۰ صفحات قیمت عہ/۲

(۳) ذبیح کون ہے؟ ضخامت ۱۰۸ صفحات قیمت عہ/۸

(۴) سورۂ ذاریات کی تفسیر ضخامت ۱۴۰ صفحات قیمت عہ/۲

(۵) تفسیر بسم اللہ و سورۂ فاتحہ ضخامت ۸۴ صفحات قیمت ۶/

تقطیع خورد کتابت وطباعت بہتر تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمہ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی پتہ:- دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

مولانا حمید الدین فراہی عہد حاضر کے اعاظم علماء میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فہم قرآن کا خاص ذوق اور اس ذوق کی تکمیل کے لئے جن صفات وکمالات کی ضرورت ہے ان سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا، چنانچہ آپ عربی زبان وادب کے محقق۔ کتب قدیمہ کے مبصر عالم تھے اور پورے قرآن اور اُس کے تفسیری ذخیرہ پر حاوی تھے۔ مرحوم کی تفسیر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ نظم قرآن یعنی ایک آیت کا دوسری آیت کے ساتھ ربط اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اسی اصول کی بنا پر پہلے سورۃ کا عمود یعنی اصل موضوع سخن بیان کرتے ہیں۔ پھر عربی زبان ولغت کی روشنی میں الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل کرتے ہیں اس کے بعد آیت سے جو کوئی خاص مضمون پیدا ہوتا ہے اُس کا تذکرہ کرتے ہیں اور پھر اس آیت کا ماسبق سے ربط بتاتے ہیں۔ پوری سورت کی تفسیر آیت بآیت اسی طرح کرتے چلے جاتے ہیں تفسیر میں زیادہ اہتمام اسی کا ہوتا ہے کہ بعض قرآن کی تفسیر بعض سے ہو انھیں اصول پر موصوف نے ایک تفسیر لکھنی شروع کی تھی جو غالباً مکمل نہیں ہوئی۔ مندرجہ بالا پانچوں کتابیں اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ پہلی کتاب میں مولانا نے وہ اصول بیان کئے ہیں جو آپ نے اپنی تفسیر میں ملحوظ رکھے ہیں اس سلسلہ میں سولہ مقدمات قایم کئے ہیں جن میں تفسیر سے متعلق اہم مباحث مثلاً شانِ نزول۔ تفسیر کے خبری مآخذ۔ لسانی مآخذ۔ کتب قدیمہ۔ آیات کی

باہمی مناسبت اور ترتیب ۔عمود ۔ سورتوں کی مقدار ۔ قرآنی احکام اور کتب قدیمہ کا تعلق۔ قرآنی تعلیم کے اصولی مسائل ۔ نظم کی دلالت ۔ اور کیفیت نزول وغیرہ بڑی فاضلانہ اور بصیرت افروز بحث کی ہے ۔ دوسری کتاب جو اقسامِ قرآن پر ہے اس میں پہلے ان شبہات کو بیان کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے پر اور وہ بھی معمولی معمولی چیزوں کی ۔ وارد ہوتے ہیں اس کے بعد متقدمین نے ان شبہات کے جو جوابات دیئے ہیں ان کو نقل کیا ہے اور پھر کتب قدیمہ ۔ علم معانی و بلاغت ۔ تاریخ اور خود قرآن مجید کے بیانات کی روشنی میں خود اس پر نہایت سیر حاصل گفتگو کی ہے ۔ تیسری کتاب میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ ذبیح کون تھے ؟ یہود نے بعض مقاصد مشئومہ کی خاطر توراۃ کے اصل بیان پر پردہ ڈال کر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ ذبیح حضرت اسحٰق ہیں ۔ مولانا نے نہایت جامع اور محققانہ بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل تھے اور پھر یہود کی تحریفات کا پردہ چاک کیا ہے ۔ آخر میں بعض مفسرین کے بیانات نقل کر کے ان کی تنقید کی ہے ۔ چوتھی کتاب سورۃ ذاریات کی تفسیر ہے جو مولانا نے اپنے مقررہ اصول پر کی ہے یعنی وہی نظم و ربط آیات ۔ الفاظ کی تحقیق ۔ کلام عرب سے استدلال ۔ سورۃ کا عمود ۔ آیات سے مستخرج احکام و دلائل ۔ متعلقہ واقعات کی تائید کتب قدیمہ سے ۔ پانچواں رسالہ بسم اللہ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں بھی بعض اشارات بہت مفید اور بصیرت افروز ہیں مولانا کی تصنیفی زبان عربی تھی لیکن مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کو شگفتہ اور عام فہم اردو میں منتقل کر دیا تھا ۔ ان میں سے اقسام القرآن پہلے بھی شائع ہو چکی ہے اور اسی زمانہ میں برہان میں اس پر تبصرہ نکل چکا ہے ۔ باقی کتابیں پہلی مرتبہ چھپی ہیں مولانا نے ان رسالوں میں جو کچھ لکھا ہے اگرچہ علماء کے ایک طبقہ کو اُس سب سے اتفاق نہیں ہوگا لیکن یہ واقعہ ہے کہ بڑی تحقیق کامل غور و خوض اور قرآن مجید میں انہماک و توغل کے ساتھ سائنٹفک طریقہ پر لکھا ہے اس لئے عربی زبان کے علماء اور طلباء کو خصوصاً اور تفسیر کا ذوق رکھنے والے حضرات کو عموماً ان کا مطالعہ کرنا چاہئے ان سے تدبر فی القرآن کی بعض نئی راہیں کھلیں گی ۔

محکمات از مولانا عبد اللہ العمادی تقطیع خورد ضخامت دو سو صفحات کتابت و طباعت بہتر

قیمت مجلد دو روپیہ بارہ آنہ پتہ :- مکتبہ نشأۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد دکن۔

فاضل مصنف عربی زبان وادب، در تاریخ کے مشہور فاضل تھے اور قرآن وحدیث پر بھی عالمانہ نگاہ رکھتے تھے ۔ انھوں نے اس کتاب میں قرآن مجید کے علمی اور عملی خصائص پر گفتگو کرنے کے بعد چند آیات پر الگ الگ کلام کیا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے اُس آیت کے متعلق مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ نقل کرتے ہیں پھر اُس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں انھیں بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد آیت کی تفسیر خود اپنی طرف سے کرتے ہیں جو تفسیر بالرائے کے ذیل میں نہیں آتی کیوں کہ اپنی بیان کردہ تفسیر کے لئے قرآن مجید سے، اقوال صحابہ سے اور بعض قدمار مفسرین سے استدلال کرتے جاتے ہیں ۔ موصوف نے اس سلسلہ میں کرسیہ فی السمٰوٰت والارض " ایام نحسات " نعم جنت ۔ عذاب دوزخ ۔ ہاروت وماروت کے قصہ وغیرہ پر بحث کی ہے ۔ یہ سب بحثیں اگرچہ عالمانہ ہیں ۔ لیکن تفسیر کے باب میں سر سید تک سے استدلال کرنا ۔ اور جنات سے مراد دنیا کے باغ لینا قطعاً صحیح نہیں ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جنات کا لفظ دنیا کے باغات کے معنی میں بھی متعدد مواقع پر مستعمل ہوا ہے ۔ لیکن ایمان اور عمل صالح کے ساتھ جنات کا لفظ اپنی بعض مخصوص صفات کے ساتھ جہاں کہیں آیا ہے اُس سے مراد دنیا کے باغ نہیں بلکہ بہشت کے گل زار وچمن ہی ہیں ۔ بہرحال تفسیری مواد اس میں کافی ہے اس لئے مطالعہ اس کا بھی کرنا چاہیئے بعض نکتے اور اشارے بڑے کام کے ہیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات ومعاہدات

از جناب سید محبوب صاحب رضوی تقطیع خورد ضخامت دو سو صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ؍ پتہ :- علمی مرکز ۔ ادارہ تاریخ دیوبند ۔

سیرتِ نبوی پر اردو میں چھوٹی بڑی کتابیں بڑی کثرت سے لکھی گئی ہیں لیکن دو ایک ناقص کتابوں کو چھوڑ کر کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مکتوبات ومعاہدات گرامی یک جا کر دیئے گئے ہوں ۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ سعادت رضوی صاحب کے مقدر میں

تھی۔ عربی میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "الوثائق السیاسیۃ" بڑی محققانہ ہے۔ لیکن اول تو وہ عربی میں ہے اور پھر متوسط درجہ کی استعداد کے لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اس بنار پر لائق مولف نے یہ کتاب مرتب کرکے بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس میں سرورِ کونین کے وہ مکاتیب گرامی جو آپ نے دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں مختلف بادشاہوں۔ سردارانِ قبائل اور دوسرے لوگوں کو ارسال فرمائے تھے اور جو معاہدات مختلف قبیلوں سے وقتاً فوقتاً کئے تھے ان سب کو اُردو کے لباس میں بیجا کر دیا ہے۔ زبان سلیس و شگفتہ اور عام فہم ہے ہر مکتوب گرامی یا معاہدۂ سامی سے پہلے مکتوب الیہ اور اس کے مقامی و جغرافیائی حالات لکھے ہیں اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اُس کو بیان کیا ہے۔ اعراب کے ذریعہ اسمار و اعلام کے صحیح تلفظ کو متعین کیا ہے اس سلسلہ میں ص ۱۲۰ پر سی بخت کو مُرزبان لکھا ہے حالانکہ یہ اصل میں فارسی کا لفظ ہے اور اُس کی ترکیب مرز + بان ہے اس لئے میم بالفتح ہے۔ بہر حال اس بہت ہی معمولی سی فروگذاشت سے قطع نظر کتاب دینی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے بڑی قابلِ قدر ہے شروع میں متعدد ناہہائے گرامی کے فوٹو بھی ہیں جن کو دیکھ کر دل میں نور اور آنکھوں میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا کوئی گھر اس کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیئے۔

المنتخبات العربیہ (قسم النظم) تقطیع خورد ضخامت ۹۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ عثمانیہ بک ڈپو ۱۰/۴ اور جیت پور روڈ کلکتہ ۱

یہ مجموعہ جو عہد جاہلیت سے لے کر عہد حاضر تک کے شعرائے عربی کے کلام کے قرن بقرن انتخاب پر مشتمل ہے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے دو لکچرر مولانا محبوب الرحمٰن اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے مغربی بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے امتحان عالم کے لئے بڑی قابلیت سے مرتب کیا ہے۔ حاشیہ میں ہر شاعر پر ایک تعارفی نوٹ اور مشکل الفاظ کا حل عربی زبان میں دیا گیا ہے۔ پھر انتخاب ایسا ہے کہ ہر قرن کے شاعروں اور ہر صنف شاعری کا نمونہ اس میں آگیا ہے جس سے طالب علم کو یہ فائدہ ہوگا کہ اس ایک انتخاب کے ذریعہ عربی شاعری کے پورے ذخیرہ سے یک گونہ مناسبت پیدا ہو جائیگی

یہ انتخاب اس لائق ہے کہ مدارسِ عربیہ اور یونیورسٹیاں نصاب میں شامل کرکے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

نوائے آزادی تقطیع متوسط ضخامت ۳۹۹ صفحات ٹائپ خوبصورت اور جلی کاغذ اعلیٰ قیمت للعہ، چار روپیہ پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔ یا پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

تقسیم سے پہلے چوں کہ اُردو زبان ہی ملک کی عوامی زبان تھی اس بنا پر جو تحریک بھی ملک میں شروع ہوتی تھی اُس کے متعلق تحریک کے زعماء اسی زبان میں تقریریں کرتے تھے۔ مضامین بھی زیادہ تر اسی میں شائع ہوتے تھے اور شعراء بھی اپنے جذبات و خیالات اسی زبان میں ظاہر کرتے تھے۔ چنانچہ جہاں تک تحریکِ آزادی کا تعلق ہے اُس کی نسبت اُردو نثر و نظم میں اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر تلاش و تفحص کے بعد اُس سب کو یک جا شائع کیا جائے تو بے شبہ کئی ضخیم مجلدات تیار ہو سکتے ہیں زیرِ تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے حصولِ آزادی تک کے لٹریچر پر مشتمل ہے ظاہر ہے کہ کل چار سو صفحات کی کتاب میں یہ پورا لٹریچر نہیں سما سکتا، تاہم جو مضامین، تقریریں اور نظمیں و مراسلات اس میں موجود ہیں وہ خود مستقل نادریت کے حامل ہیں اور اس اعتبار سے یہ کتاب تاریخی و ادبی دونوں حیثیتوں سے لائق مطالعہ ہے اور اس سے تحریکِ آزادی میں اردو کی اہمیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

تاریخ ملت کا گیارہواں حصّہ

سلاطین ہند

جلد دوم

اس جلد میں سلاطین کشمیر، شاہانِ گجرات، سلاطینِ بہمنیہ، عماد شاہی، قطب شاہی عادل شاہی وغیرہ مملکتوں کے ساتھ شاہانِ مغلیہ، ظہیر الدین بابر سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے زمانے تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں، تاریخ ملت کا یہ سلسلہ جامعیت اور اختصار کے ساتھ استناد و اعتبار کے لحاظ سے بہترین سمجھا گیا ہے، کتاب کی یہ جلد ابھی ابھی پریس سے آئی ہے۔

قیمت غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

مجلد تین روپے بارہ آنے۔

برہان

جلد ۴۰ شمارہ ۵

مئی ۱۹۵۸ء مطابق شوال المکرم ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرصہ ہوا مولانا عبدالماجد دریابادی نے اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی قرآن مجید کی تفسیر بڑی محنت اور بڑے شوق و ذوق سے لکھی تھی اور اس کو مکمل کر کے اب سے پندرہ برس پہلے یعنی ۱۹۴۲ء میں تاج کمپنی لاہور کے حوالہ کر دیا تھا۔ ارباب ذوق و نظر کے حلقہ میں اس تفسیر کا غلغلہ اسی وقت سے بلند تھا اور بڑی بے چینی سے اس کی اشاعت کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ مگر معلوم نہیں کیا اسباب پیش آئے کہ کمپنی کی طرف سے اشاعت میں تعویق پر تعویق ہوتی رہی۔ آخر اب ۱۹۵۷ء میں اس کی پہلی جلد جو سورۂ فاتحہ سے سورۃ النساء تک پر مشتمل ہے چھپ کر شائع ہوئی اور تاج کمپنی جس سلیقہ اور حسنِ طباعت کے لئے مشہور ہے یہ تفسیر بھی اس سے محرومِ نہیں ہے۔ انگریزی زبان میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمے کی ضرورت تھی جس کو اہلِ سنت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو اور جس میں قرآنی حقائق و معارف پر صحتِ عقیدہ و خیال کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کلام کیا گیا ہو۔ بحمد اللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔ اس تفسیر کے مطالعہ کے بعد ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ در حقیقت مولانا نے اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے میں کس قدر محنتِ شاقہ برداشت کی اور جغرافیہ، تاریخ، تفسیر و حدیث، فقہ و علم الکلام لغت اور علوم جدیدہ کی کتنی کتابوں کی ورق گردانی کی ہے اور اسی طرح دانہ دانہ جمع کر کے خرمن تیار کیا ہے۔ خدا کرے اس کی باقی جلدیں بھی جلد شائع ہوں۔ پہلی جلد تقطیع کلاں ضخامت ۱۹۴ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ "تاج کمپنی قرآن منزل۔ کراچی" سے ملے گی۔

محترم صدر جمہوریہ کی دعوت پر ۹ بھر جہ پلی کو انجمن ترقی اردو کا جو وفد موصوف سے ملا وہ

پہلے وفد کی بہ نسبت کہیں زیادہ وسیع ۔ موثر اور نمائندہ حیثیت کا مالک تھا۔ جہاں تک ملاقات کے نتیجہ کا تعلق ہے تو ممکن ہے ان حضرات کو مایوسی ہوئی ہو جو "عاشقی کی صبر طلبی" کو تمنا کی بے تابی" کا حریف بنانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ لیکن جن اہلِ نظر کو جگر کے خون ہونے کا غم نہیں ہے اور جو "سر ہے تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور" کا یقین رکھتے ہیں ان کے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے جو خرابی سالہا سال سے دراز کی غلط سیاست کا نتیجہ ہو وہ اچانک دور نہیں ہو سکتی اس کے لئے صبر آزما کوشش اور عزم و حزم درکار ہے۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو   رونا ہے یہ ہنسی نہیں ہے۔

بہرحال یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ اردو تحریک کا قافلہ جس راہ پر گامزن ہے اس پر وہ خود اعتمادی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کا ہر اگلا قدم اس کے پچھلے قدم سے زیادہ پُر از امید و حوصلہ ہے۔ اقلیتوں کی زبان سے متعلق جو کمشنر مقرر ہوا ہے وہ اپنا کام کر رہا ہے اور اب جو کچھ ہوگا اس کی رپورٹ کے بعد ہوگا۔ اس لئے ہم کو صدرِ جمہوریہ سے فوری طور پر کسی قطعی جواب کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ جہاں تک لسانی کمشنر کے ذاتی رویہ کا تعلق ہے ہم اپنے مقامی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رویہ مخالفانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے۔ انجمن ترقی اردو کلکتہ کے وفد نے لسانی کمشنر کے سامنے جو میمورنڈم پیش کیا تھا اس کو انھوں نے بڑی توجہ اور غور سے سنا۔ اس پر بحث کی اسی کے بعض حصوں کی مزید وضاحت چاہی اور جب ان کو اس کی معقولیت کا اطمینان ہو گیا تو اس کے بعض مطالبات پر تو فوری کارروائی کرنے کا وعدہ کیا اور باقی چیزوں کی نسبت انھوں نے کہا کہ وہ اپنی رپورٹ میں ان کا خیال رکھیں گے۔ غرض کہ انجمن ترقی اردو کلکتہ کا وفد یہ اثر لے کر واپس ہوا کہ اس کی ملاقات بالکل بے نتیجہ نہیں رہے گی۔

بہرحال اردو تحریک سے متعلق یہ سب باتیں تو وہ ہیں جن کا تعلق حکومت اور اس کے قانون سے ہے۔ اس سلسلہ میں جس آئینی جد و جہد کی ضرورت ہے وہ مرکزی انجمن ترقی اردو کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود اردو والوں کو جو کچھ کرنا چاہئے وہ اسے کہاں تک کر رہے ہیں! انھوں نے

اردو کے مصنفوں اور ناشروں کی حوصلہ افزائی کا کیا سامان کیا؟ یہ لوگ اپنے پان سگرٹ اور سنیما بینی پر جتنا خرچ کرتے ہیں کیا اُس کا ۱/۲ حصّہ بھی وہ اردو کی کتابوں اور اس کے اخبارات و رسائل کی خریداری پر خرچ کرتے ہیں۔ ہندی، مرہٹی اور بنگالی زبان کا آپ کو کوئی ادیب اور صاحب قلم ایسا نہیں ملے گا جو معاشی اعتبار سے پریشان حال اور پراگندہ روزی پراگندہ دل کا مصداق ہو۔ ان زبانوں کا کوئی پبلشر آپ کو نظر نہیں آئے گا جو خریداروں کی کمی کا شکوہ سنج ہو۔ پریم چند جب تک اردو میں لکھتے رہے فکرِ معاش سے آزاد نہیں ہوئے۔ لیکن ہندی میں لکھنا شروع کیا تو مالا مال ہو گئے۔ بنگالی زبانوں کے اکثر ادیبوں سے راقم الحروف خود واقف ہے کہ وہ کس درجہ معاشی فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کیا حال ہے؟ فلمی شاعروں اور ادیبوں سے قطع نظر کتنے ادیب ہیں جو جوانی میں ہی فقر و فاقہ کے باعث بیداد اجل کا شکار ہو گئے، کتنے ہیں جو نانِ شبینہ کو محتاج ہیں۔ تھوڑے بہت جو خوش حال نظر آتے بھی ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں جو کہیں پروفیسر ہیں۔ کہیں کوئی نوکری کر رہے ہیں یا انھوں نے کوئی اور ذریعۂ معاش اختیار کر رکھا ہے۔ ہمارے اخبارات صرف اشتہاروں کے بل بوتہ پر چل رہے ہیں۔ پبلشنگ ہاؤسز سستی کتابوں کے سہارے زندہ ہیں جو سنجیدہ قسم کے ادارے ہیں وہ شخصی اور ہنگامی عطیات کے ذریعہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام کئے جا رہے ہیں۔ فارسی کا ایک پرانا شعر ہے ؎

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم — قلم کش را بدولت می رسانم

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر سب زبانوں کے حق میں آج بھی ایسا ہی درست اور سچا ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ لیکن جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے اس کے دوسرے مصرعہ میں بجائے "دولت" کے "نکبت" کا لفظ ہونا چاہئے۔

غور کرنا چاہیئے کہ ان حالات میں اگر اُردو اتّر پردیش۔ دلی بہار یا آندھرا کی علاقائی زبان ہو بھی گئی تو اس سے کیا ہوگا؟ اور کیا وہ محض حکومت کی طرف سے اس اعلان کے سہارے زندہ رہ سکے گی؟

اسلام کا نظام امن و امان

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب. مفتاحی دار الافتاء دار العلوم دیوبند)

انسان میں اللہ تعالیٰ نے متضاد قوتیں ودیعت کی ہیں، چنانچہ جہاں اس میں دور اندیشی و فرض شناسی کے جوہر مضمر ہیں، وہیں یہ فتنہ و فساد اور عجلت پسندی کا بھی آماجگاہ ہے، جس طرح اس کے مزاج میں متانت و سنجیدگی ہے، اسی طرح یہ جذباتِ انتشار و تشتت سے بھی خالی نہیں، ایک طرف اگر یہ پیکرِ اُنس و محبت ہے تو دوسری طرف بغض و حسد کا طوفان بھی، جہاں آدم کا بیٹا اپنی جان پر کھیل کر مظلوم کی حمایت کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے، وہاں اس میں یہ عیب بھی ہے کہ اپنے معمولی اقتدار کے لئے لاکھوں بے گناہ انسانوں کا بے دریغ خون بھی بہانے سے نہیں چوکتا۔

انسانوں کے لئے مکمل ضابطۂ حیات اللہ رب العزت نے انسانی طبیعت کے افراط و تفریط ہی کی اصلاح کے لئے انبیاء و رسل کا سلسلہ قائم فرمایا، اور اپنے ان برگزیدہ بندوں کے ذریعہ انھیں اعتدال کی راہ پر گامزن کرنے کی سعی کی، تاکہ انسان روئے زمین پر قتل اور خونریزی کی جگہ امن و امان کا منادی ہو، ظلم و جور کے بدلے عدل و مساوات کی حکومت قایم کرے، اور اس زمین پر ساری بسنے والی مخلوق اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔

رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری نبی کی حیثیت سے دنیا کو جو ضابطۂ حیات عطا کیا، وہ ہر پہلو سے مکمل و جامع ہے، زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے، جس کے متعلق اس ابدی ضابطۂ حیات میں مکمل رہنمائی موجود نہ ہو، یہ الگ بات ہے کہ ہم نے گہری نظر سے اس کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

امن و امان دنیا امن و امان کا بار بار نام لینے کے باوجود انتشار و تشتت میں جس بُری طرح پھنسی ہوئی ہے، کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں قتل و خوں ریزی سے انسانیت جس طرح کانپ اُٹھی ہے، شاید اس سے کوئی باخبر انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، کاش اربابِ اقتدار اس

دور میں اسلام کے نظامِ امن و امان کا مطالعہ کرتے، اور دنیا میں اس نے جس طرح کے سماج بنانے کی جدوجہد کی ہے، اس پر غور کرتے تو بہت سارے مسائل خود بخود حل ہوتے نظر آتے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلام کا مکمل آئینِ زندگی دنیا میں اس وقت آیا تھا، جب دنیا بربادی کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی تھی، انسان اپنی انسانیت کھو چکا تھا، اور پوری دنیا سے امن و امان کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹایا جا چکا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر انسانوں کی جس طرح رہنمائی کی، اور انسانیت کے تنِ مردہ میں جس خوبی سے جان ڈالی وہ تاریخ کا ایک تابناک باب ہے، اور یہ کیوں نہ ہوتا جب کہ یہ خود رب العالمین کرا رہا تھا، اس خالق و رب سے بڑھ کر مخلوقات اور کائناتِ انسانی کا جاننے والا اور کون ہو سکتا ہے، جس کی نگاہ میں پوری کائنات ہوتی ہے۔

اسلام اور امن و امان | یہ دستور ہے کہ جب کسی سماج میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، تو اس کی اصلاح بنیادی طور پر ہی کی جا سکتی ہے، اس کی ساری چیزوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، فساد کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اور پھر کہیں جا کر پورے ڈھانچہ کی اصلاح کا سوال سامنے آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے امن و امان کی بحالی کے لئے صرف جزوی اصلاحات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنی قدرت کے پیشِ نظر انسانوں کے سارے روگ کی اصلاح ضروری سمجھی، چنانچہ سب سے پہلے انسانوں کو تنگ نظری، احساسِ کمتری اور انتشارِ ذہنی سے نکالا، اور اعلان کیا، کہ یہ ساری کائنات تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے، سورج، چاند، ستارے سب تمہارے کام میں لگے ہوئے ہیں، انسانیت ان تمام چیزوں سے بالا و برتر ہے، کہ وہ ٹولیوں میں بٹ کر محدود ہو جائے، جغرافیائی حدود میں گھر جائے، رنگ و روپ کی تفریق میں پڑ کر جان دے دے، اور نسب و نسل کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دی جائے۔

فتنہ و فساد اور اس کی عمومی وجہ | آگے بڑھنے سے پہلے اتنی بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ دنیا میں فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کیوں ہوتی ہے، اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ تاریخ کو

سامنے رکھ کر تجزیہ کریں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا، کہ امن وامان کو جو چیز تباہ کرتی ہے، وہ انسان کی تنگ نظری ہے، کوئی مذہب کے نام پر تلوار اٹھاتا ہے، کوئی رنگ ونسل کے نام پر معرکہ آرائی کے لئے میدان میں آتا ہے، کوئی وطن اور ملکی حدود کو سامنے لاکر انسانی خون سے ہولی کھیلتا ہے۔

بعثتِ نبوی سے پہلے دنیا کی حالت بعثتِ نبوی سے پہلے کی تاریخ جب ہم پڑھتے ہیں، تو سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے، کہ انسان اپنی بنیادوں پر لاکھوں ٹولیوں میں بٹا ہوا ہے جس طرح سب نے الگ الگ اپنا خدا گڑھ رکھا ہے، اسی طرح اپنے اپنے قبیلہ کی حکومت بھی علیحدہ بنا رکھی ہے، عرب میں لڑائی عموماً قبیلہ کے نام پر برپا ہوا کرتی تھی، اور پھر اس کا سلسلہ برسہا برس چلتا رہتا تھا، چالیس پچاس برس تک تسلسل کا قائم رہنا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی،

پھر کیا یہ تاریخی حقائق نہیں ہیں کہ آریوں نے طاقت پاکر، غیر آریوں کو پامال کیا اور برہمنوں اور چھتریوں نے شودروں کو دبایا، اور اُن کے حقوق غصب کئے، اسی طرح رومیوں نے افریقیوں پر غلبہ پایا، تو ان کو معاف نہیں کیا، اور یونانیوں نے ایرانیوں کو کمزور پاکر خوں ریزی کی، اور معصوم انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی، اگا تھا اور گال نے بھی یہی کیا، تاتاریوں کا شیوہ بھی یہی رہا، فرعونِ مصر نے خدائی کا دعویٰ کرکے اپنے کو سجدہ کرایا، اور آج تک یورپ کا ایمان ہے کہ گورے کو کالے پر برتری حاصل ہے

اسلام کی رہنمائی یہ تاریخی شہادتیں ہیں کہ انسان ان خرافات میں مبتلا ہو کر امن وامان کو کھو چکا تھا، اور انسانی جان کی قدر وقیمت بھول چکا تھا، اسلام نے ضروری سمجھا کہ ان کے نظریے میں مکمل انقلاب برپا کیا جائے، انسانی رشتے ثابت کیے جائیں، انسانی خون کی قدر وقیمت پر روشنی ڈالی جائے، انسانی عزت ومکرمت کو اُجاگر کیا جائے، اور انسان کے مال کی حرمت پر دلیل قایم کی جائے۔

انتشار وتشتت کی بنیاد کا خاتمہ اسلام ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے پوری قوت سے انسانوں کو بتایا کہ تم سارے کے سارے ایک ماں باپ کی اولاد ہو اور سارے کے سارے ایک جان سے پیدا کئے گئے ہو اس نے اعلان کیا

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ — اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری ذاتوں اور قبیلوں کو رکھا

لتعارفوا اِنَّ اَکرمکمُ عند اللہِ اتقاکم (الحجرات - ۲)
تاکہ تمھارے آپس کی پہچان ہو، اور اللہ کے نزدیک تم میں باعزت وہی ہے جو بڑا متقی ہے۔

پھر اسے بھی واضح کیا کہ عورت کی پیدائش کسی الگ مادہ سے نہیں ہے، تاکہ کسی کو یہ سوچنے کا موقع نہ ملے کہ نسلِ انسانی دو مادوں سے مرکب ہے، اور اس طرح انسان دو گروپ میں بٹ سکتا ہے، قرآن نے بہت واضح طور پر اعلان کیا

یا ایُّھَا النَّاس اتَّقُوا ربکم الّذِی خَلَقَکُمْ من نَفْسٍ واحدۃ وَخَلَقَ منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا (النساء - ۱)
اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

خونی رشتہ اور اس کا احترام جس کا منشا یہ ہے کہ جڑ سب کی ایک، مادہ سب کا ایک، اس لئے کہیں سے کوئی اختلاف اس سلسلہ میں پیدا نہ ہونا چاہیئے، اور سبھوں کو باہم مل کر زندگی بسر کرنا چاہیئے، اخلاق و مروت کا سلوک رکھنا چاہیئے، اور باہمی خلفشار کے قریب بھی پھٹکنا نہ چاہیئے، چنانچہ اس طرف بھی اس کے فوراً بعد اشارہ فرمایا گیا۔

واتقوا اللہ الّذِی تَسَاءَلون بہ والارحام اِنَّ اللہ کان علیکم رقیبا (النساء - ۱)
اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو، جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کیا کرتے ہو، اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔

یہاں قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں قرابت اور خونی تعلق کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جزء کی تشریح جو کچھ فرمائی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ انسان کسی حالت میں اس تعلقِ باہمی کو ایک لمحہ کے لئے فراموش نہ کرے، جس طرح آج دو سگے بھائی اپنے رشتہ کا لحاظ و پاس اپنا فریضہ سمجھتے ہیں، رب العالمین کائنات انسانی کو آگاہ کرتا ہے

کہ تم سب کے سب سگے بھائی کے درجہ میں ہو، ظلم اور بے حیائی ہے اگر کوئی بھائی کسی بھائی پر بغیر کسی قانونی وجہ کے ہاتھ اٹھائے۔ قال القرطبی اتفقت الملۃ علی ان صلۃ الرحم واجبۃ وان قطیعتھا محرمۃ وقد وردت بذالک الاحادیث الصحیحۃ (فتح القدیر للشوکانی جلد ۱ ص ۲۸۲)

انسانی مساوات — انسان اگر اس قدرتی رشتہ پر غور کرے اور اس پر ایمان لے آئے، تو غیر ممکن ہے کہ دنیا میں جو انتشار اور بے چینی ہے وہ ختم نہ ہو، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ذہن نشین فرمایا۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا اسود علی ابیض الا بالتقویٰ (زاد المعاد ص ۲۲ ج ۴)

نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت ہے، اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی برتری حاصل ہے، اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر، مگر ہاں برتری کا دار و مدار تقویٰ ہے۔

اس تفریق و انتشار کو مٹا کر آپ نے انسانی غرور و نخوت پر ضرب کاری لگائی اور فرمایا جو سب کے سننے کے لائق ہے۔

الناس من آدم و آدم من تراب (ایضاً)

ساری کائنات انسانی آدم کے دم قدم سے ہے اور حضرت آدم کی تخلیق مٹی سے ہے۔

اسی اوپر والی آیت کی طرف اشارہ فرمایا کہ فضیلت و برتری کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، اگر انسان صرف انسان کے درجہ میں ہے۔

اسلام اور احترام انسانیت — اسلام ہر ایک کو اپنی طرف بلاتا ضرور ہے، مگر مجبور نہیں کرتا، اسی طرح وہ ظلم و جور کا دشمن ہے مگر انسانیت کا قطعاً دشمن نہیں، بلکہ وہ اپنے بیگانے سبھوں کی انسانیت کا احترام کرتا ہے، سب کو خدا کی مخلوق تسلیم کرتا ہے، اور سب کا رشتہ حضرت آدم سے مانتا ہے، اوپر جو آیتیں پیش کی گئی ہیں، وہ ثبوت کے لئے بہت کافی ہیں، کہ وہاں خطاب کائنات انسانی کو کیا گیا ہے، جس میں بغیر تفریق ساری قومیں آجاتی ہیں۔

اسلام میں آزادی — اسلام دین کے معاملہ میں کسی پر زبردستی نہیں کرتا، اور نہ کسی کو کسی خاص دین نہ

ملت میں شمول پر مجبور کرتا ہے، بلکہ وہ آزادی دیتا ہے اور آزادانہ فیصلہ کا اختیار، اس کا اعلان ہے

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (بقرہ - ۳۴)	دین میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔

بات بھی درست ہے، کہ جو اپنی حقانیت میں بالکل واضح ہو، اس میں زبردستی کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے، گویا اسلام اپنے اسلوب خاص میں تبلیغ کرتا ہے، اور ترغیب بھی دیتا ہے، مگر وہ دباؤ نہیں ڈالتا، حافظ ابن کثیر اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

یقول تعالیٰ لا اکراہ فی الدین ای لا تکرھوا احدا علی الدخول فی دین الاسلام فانہ واضح جلی دلائلہ و براھینہ لا یحتاج علی ان یکرہ احد علی الدخول فیہ (تفسیر ابن کثیر صنا۳۱ ج۱)	ارشاد خداوندی ہے کہ دین میں زبردستی کا کوئی موقع نہیں ہے یعنی دین اسلام میں داخل ہونے کے لئے کسی کو مجبور نہ کرو، اس لئے کہ وہ ممتاز ہے اور اس کے دلائل و براہین روشن ہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی پر مسلمان ہونے کے لئے دباؤ ڈالا جائے۔

جبر و اکراہ کی اجازت نہیں ہے | انھوں نے ابن جریر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بنی سالم بن عوف کے کوئی انصاری جو خود مسلمان تھے، اور ان کے دو لڑکے نصرانی تھے، وہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ کیا مجھے یہ حق ہے کہ میں اپنے ان دونوں صاحبزادوں کو اسلام کے لئے مجبور کردوں، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ دین میں زبردستی نہیں ہے[1]

اس میں شبہ نہیں کہ کچھ علماء اس طرف بھی گئے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، مگر راجح بات وہی ہے، جو عرض کی گئی، ہاں یہ البتہ ضروری ہے کہ دین قیم کی آواز ہر شخص تک پہنچا دی جائے جو ہر ایک مسلمان کا فریضہ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جہاد کے موقع پر جزیہ کے اقرار کے بعد قتال کا حکم نہیں ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

---

[1] ابن کثیر ج۱ ص۳۱۱

"اور جہاد میں صورت دین پر بھی اکراہ کا شبہ نہ کیا جائے، کیوں کہ مشروعیت جزیہ دلیل صریح ہے کہ مقصود جہاد سے اسلام کا غالب رہنا ہے، خواہ مخالف کے اسلام سے ہو، یا صرف رعیت بننے سے ہو، اور اس نفی اکراہ سے نہی عن الاکراہ بھی لازم آگئی، اس لئے بعض نے نہی کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے، یعنی دین میں اکراہ مت کرو، خوب سمجھ لو[1]"

ایمان اکراہ کے ساتھ ناممکن ہے | قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تحریر فرماتے ہیں

لا یتصور الاکراہ فی ان یومن احد اذ الاکراہ الزام الغیر فعلا لا یرضی بہ الفاعل وذا لا یتصور الا فی افعال الجوارح واما الایمان فھو عقد القلب وانقیادہ لا یوجد بالاکراہ او المعنی لا تکرھوا فی الدین فھو اخبار بمعنی النھی ووجہ المنع اما ما ذکرنا انہ لا یوجد الایمان بالاکراہ فلا فائدۃ فیہ (تفسیر مظہری ج ۱ ص ۲۸)

زبردستی اور دباؤ کسی کے مومن ہونے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ زبردستی کا مطلب ہے کسی کو ایسے کام پر مجبور کر دینا، کرنے والا جس پر راضی نہ ہو، اور یہ چیز افعال جوارح میں ہی متصور ہو سکتی ہے، باقی ایمان تو وہ قلب کا معاملہ ہے اور اس کا جھکنا ہے۔ جو دباؤ سے نہیں ہو سکتا ہے، یا معنی یہ سمجھئے کہ دین کے معاملہ میں دباؤ نہ ڈالو، یہ اخبار بمعنی نہی ہے، اور دباؤ سے روکنے کی وجہ یا وہی ہے جس کو ہم نے ذکر کیا کہ ایمان کا وجود دباؤ کے ساتھ نہیں ہو سکتا ہے، پھر اس دباؤ کا کیا فائدہ۔

جہاد کا بنیادی مقصد | جن لوگوں نے کہا ہے کہ آیت لا اکراہ فی الدین آیات قتال سے منسوخ ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں

قلت لا یتصور النسخ الا بعد التعارض ولا تعارض فان الامر بالقتال والجہاد لیس

جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے) یہ بات تصور میں بھی نہیں آتی ہے، اس لئے نسخ کا حکم تو اس وقت کیا جاتا ہے جب تعارض ہو، اور

---

[1] بیان القرآن ج ۱ ص ۱۵۲

لا لاجل الاکراہ علی الدین بل لدفع الفساد من الارض فان الکفار یفسدون فی الارض ویصدون عباد اللہ عن الھدی والعبادۃ ..... ومن ثم جعل اللہ غایۃ قتالھم اعطاء الجزیۃ حیث قال حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون ، ولاجل ھذا انھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل الولدان والنساء والمشائخ والرھبان والعمیان والزمن الذین لا یتصور منھم الفساد فی الارض

(تفسیر مظہری ج ۱ ص ۲۸۰)

یہاں کوئی بھی تعارض نہیں، اس لئے کہ قتال و جہاد کا حکم دباؤ کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا نابید کر دینا ہے کیوں کہ کفار روئے زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں، اور اللہ کے بندوں کو ہدایت اور عبادت الٰہی سے روکتے ہیں...... اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کے قتل کی غایت اعطاء جزیہ بیان کی ہے جہاں کہ فرمایا حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ، اور یہی چیز ہے کہ نبی کریم صلعم نے ان لوگوں کے قتل سے روکا ہے جن سے فتنہ کا اندیشہ نہیں، جیسے بچے، عورتیں، مشائخ، گوشہ نشین اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے، اندھے، اور اپاہج۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے جس انداز میں روشنی ڈالی ہے، اس کو سمجھ لینے کے بعد کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا، اور جو لوگ اسلامی جہاد سے استدلال کرتے ہیں کہ مذہب کے نام پر اسلام میں تلوار اُٹھانے کی ترغیب ہے، یا اسلام بزور شمشیر پھیلا سرے سے غلط ہے، اسلام امن و امان ہی کے لئے جہاد کا حکم دیتا ہے، وہ امن و امان قائم کرتا ہے، اسے برباد کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

درمیان میں ایسی بحث چھیڑنے کا منشا یہ تھا، کہ اگر کوئی مسئلہ جہاد سے شبہ میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ غلط ہے، اسلام قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ کوئی وطن کے نام پر، نسل و نسب کے نام پر، مذہب

کے نام پر انسانوں کا ناحق خون بہائے اور ملک میں برہمی اور انتشار پیدا کرنے کی ناروا سعی کرے

اسلامی حکومت میں غیر مسلم کا احترام | یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ان غیر مسلموں کا جنھوں نے حکومت کی وفاداری کا اقرار کرلیا ہے، ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کا احترام بھی اتنا ہی ہے جتنا ایک مسلمان کا احترام ہونا چاہئے، حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ان کی جان، عزت و آبرو اور مال کی حفاظت کرے، اس سلسلہ میں قانون سب کے لئے برابر ہے، جس کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئے گی۔

اسی طرح اسلام میں معاہدہ کا بڑا احترام ہے، کوئی حربی کافر امن لے کر اسلامی حکومت میں داخل ہو تو اس حکومت کا اور تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اس پر ہاتھ نہ اٹھائے، حدیث میں آیا

من قتل معاهدا لم یرح رائحة الجنة وان ریحها یوجد من مسیرة اربعین عاما رواہ البخاری	جو شخص کسی معاہد کو قتل کرے گا، وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا حالانکہ اس کی بو چالیس سال کی مسافت سے بھی محسوس کی جائے گی۔

(ابن کثیر ج ۲ ص۱۹۵)

مختصر یہ کہ اسلام نے دنیا کے سامنے جو امن و امان کا نظام پیش کیا ہے، وہ مجموعی طور پر ساری دنیا کو پیام امن دیتا ہے، اور اس میں تمام انسانوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، افراط و تفریط سے پاک ہے اور اعتدال پر گامزن ہے۔

انسانی حقوق کی اہمیت اسلام میں | انسانی رشتے کے استحکام کے بعد امن و امان کی بنیاد عدل و مساوات اور انسانی حقوق کی رعایت پر ہے، اسلام نے ان امور کا جتنا اہتمام کیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے، اور جہاں تفصیل آئے گی وہاں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، کہ عدل و مساوات میں جن پہلوؤں کا لحاظ کیا گیا ہے، وہ کس قدر اہم ہیں، یہی حال حقوق کی رعایت کا ہے، انسانی حقوق کی جو رعایت کی گئی ہے، سچ یہ ہے کہ یہ رعایت کہیں اور نظر نہیں آتی۔

عدل وانصاف اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن کی صریح آیتیں مطالعہ کریں جن میں عدل ومساوات کے قوانین کا اجمالی بیان ہے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط (المائدہ - ۲)	اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے واسطے انصاف کرو

انصاف میں کیسی پختگی ہونی چاہیئے، اور منصف کا کتنا بلند کیرکٹر ہونا چاہیئے، ارشاد ربانی ہے:

لایجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقوی (المائدہ - ۲)	کسی قوم کی دشمنی تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرے تم انصاف کرو، کہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب یہی بات ہے۔

پہلے حصہ میں نفس عدل کا وجوبی حکم ہے، دوسرے حصہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آدمی انصاف کی مسند پر جب بیٹھ جائے تو وہ صرف جج اور منصف ہو، اور تمام کدورتوں، عداوتوں اور بغض وحسد سے اس کا دل پاک اور دماغ صاف ہو، اور وہ اس طرح کی تمام باتوں کو اپنے ذہن سے نکال دے، اس کی نظر صرف انصاف اور معاملہ کے نشیب وفراز پر ہو، مقدمات کی ترتیب جس صحیح نتیجہ تک پہنچائے، وہی اس کا فیصلہ ہو۔

منصفین کو ہدایات عدل وانصاف کے سلسلہ میں اس طرف خصوصی توجہ اس لئے دی گئی کہ آدمی عموماً جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے، اور انسانی طبیعت اسے متزلزل کر ڈالتی ہے، مگر یہ منصف کے منصب کے منافی ہے کہ وہ طبیعت کے تقاضا پر ایک لمحہ کے لئے بھی توجہ دے، حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں

ای لایحملنکم بغض قوم علی ترک العدل فیھم بل استعملوا العدل فی کل احد صدیقا کان او عدوا (ج ۲ ص ۳۰)	یعنی تم کو کسی قوم کا بغض اس قوم کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہ روک سکے، بلکہ تمہارا شیوہ یہی ہونا چاہیئے کہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرو، خواہ دوست ہو، خواہ دشمن۔

خدانخواستہ اگر کوئی منصف جذبات سے بے قابو ہو جائے اور انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو حکم یہ ہے کہ اس کی اس سلسلہ میں ہرگز کسی طرح کی حوصلہ افزائی اور مدد نہ کی جائے، بلکہ سب مل کر نیکی اور تقوی کا مظاہرہ اس انداز میں کریں کہ وہ منصف اپنے بے جا غیظ و غضب پر شرمندہ ہو اور فوراً اپنی غلطی کا احساس کر کے راہ راست پر آجائے۔

عدل و مساوات پر قائم رہنے کی تاکید | پھر یہ عداوت کسی ناجائز بنیاد پر ہو یا جائز بنیاد پر، بہر دو صورت عدل و مساوات کا دامن چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، ارشاد ربانی ہے:

لا یجرمنکم شنآن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا	جو تم کو حرمت والی مسجد سے روکتی تھی اس قوم کی دشمنی اس کا باعث نہ ہو، کہ تم زیادتی کرنے لگو

(المائدہ - ۱)

گو یہاں بنیاد جائز ہے، مگر پھر بھی انصاف سے پھرنے کی اجازت نہیں، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی حکم ہے کہ وہ تعاون اسی صورت میں کریں، جب وہ انصاف پر قائم رہے، ورنہ ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

تعاونوا علی البرّ والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب	آپس میں نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو، گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ اس کا عذاب سخت ہے۔

(المائدہ - ۱)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ بغض کی بُنیاد کس قدر مضبوط ہے، مگر یہاں بھی انصاف کا دامن چھوڑ کر زیادتی کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ شدت کے ساتھ روکا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ انصاف کے خلاف کسی صورت میں بھی تعاون جائز نہیں ہے، ابن کثیرؒ اس موقع سے تحریر فرماتے ہیں کہ عدل ہر حال میں ضروری ہے، اور ہر قوم اور ہر فرد کے ساتھ۔

فان العدل واجب علی کل احد	ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ ہر

فی کل احد فی کل حال — حال میں انصاف کرے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص۶)

عدل و انصاف وہ بیش بہا دولت ہے جس سے آسمان اور زمین کا نظم برقرار رہتا ہے، اور جس انداز سے اس میں کمی ہوتی ہے، دنیاوی نظام میں برہمی رونما ہوتی ہے، اس لئے سے واجب ہونا ہی چاہیئے تھا۔

منصف کی ذمہ داری | جہاں یہ ضروری ہے کہ عدل و انصاف کی مسند پر جلوہ افروز ہو کر بغض و حسد دل سے نکال ڈالے، وہیں یہ بھی لازم ہے کہ آدمی جنبہ داری اور پاسداری سے ملوث نہ ہو، بہت ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو خود اپنے خلاف فیصلہ دینا ہوتا ہے، کبھی اسے ماں باپ کی محبت بے انصافی پر مجبور کرتی ہے، اور کبھی رشتہ داروں کا دباؤ پڑتا ہے، اسلام نے ان مواقع کے لئے خصوصی ہدایت کی ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو مگر انصاف کے معاملہ میں ذرہ برابر بھی قدم میں جنبش نہ آنی چاہیئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین (النساء-۲۰) — اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو، اللہ جیسی گواہی دو، گو تمہارا، یا تمہارے ماں باپ کا، اور یا تمہارے قرابت والوں کا نقصان ہو۔

اس قانون کی عملی تشریح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ہے، اور اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی آپ دیکھ جائیں، ہر جگہ عدل و انصاف کی حکمرانی نظر آئے گی، اس عدل و انصاف میں چھوٹے بڑے، امیر و فقیر، اور سلطان و گدا کی کوئی تمیز نہیں ہے، قانون کی نظر میں سب برابر ہے۔

اسلام کسی کی رعایت نہیں کرتا | عہد نبوی میں ایک چوری کا واقعہ پیش آیا، جس کی مرتکب ایک مخزومیہ خاتون تھیں، جو ایک شریف اور اونچے خاندان کی چشم و چراغ تھیں، کچھ لوگوں کو خیال ہوا، کہ عزت و آبرو کا مسئلہ ہے، بڑی جگ ہنسائی ہوگی، ایسا کیوں نہ ہو کہ رحمت عالم صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے اس کے نشیب و فراز کو پیش کیا جائے، خدا کے لاڈلے نبی ہیں، ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔

قانون کی نگاہ میں شاہ و گدا برابر پہلے تو کسی کو جرأت نہ ہوئی پھر کہہ سن کر حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا، یہ آں حضرتؐ کے بڑے چہیتے تھے، انھوں نے جرأتِ لب کشائی کی، مگر با ایں ہمہ آپ پر کیا اثر ہوا، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی زبان سے سنئے فرماتی ہیں:

ان اسامۃ کلم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی امرأۃ، فقال انما ھلک من کان قبلکم انھم کانوا یقیمون الحد علی الوضیع ویترکون الشریف والذی نفسی بیدہ لو فاطمۃ فعلت ذالک لقطعت یدھا (بخاری اقامۃ الحد علی الوضیع والشریف)	ایک عورت کے مسئلہ میں حضرت اسامہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے اس وجہ سے ہلاک ہوتے کہ وہ سزا نیچ لوگوں کو دیتے اور شریفوں کو چھوڑ دیتے قسم ہے اس ذات کی، جس کے دستِ قدرت میں مری جان ہے اگر (جگر گوشۂ رسول) فاطمہ وہ کام کرتی تو یقیناً میں اس کا ہاتھ بھی کاٹتا۔

جواب کا لب و لہجہ ملاحظہ فرمایا جائے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عالم ہوا، جب آپ کے کانوں میں اس طرح کی آواز پڑی، اور کس مضبوطی سے اپنا فیصلہ سنایا، کہ اگر مری لختِ جگر فاطمہؓ بھی جرم کا ارتکاب کرتی تو اس کو بھی اس کی پوری پوری سزا دیتا۔

میزانِ عدل امن و امان اس طرح کے قانون ہی سے باقی رکھ سکتا ہے جس میں کسی کی رو رعایت نہ ہو، یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ وزیر اعظم اور اس کے عزیزوں کے جرم کی پردہ پوشی کی جائے اور غریب کمزور افراد کو خواہ مخواہ جیل کی کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، یہ ایک دفعہ بحیثیت سفیر قیصر روم کے دربار میں حاضر ہوئے اور وہاں ایک موقع سے برجستہ فرمایا

"ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے، اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں گے، اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اس کو معزول کر دیں، اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں، اور اگر وہ کسی کو گالی دے، تو وہ بھی اس کو اسی طرح گالی دے، اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ دینا پڑے، وہ ہم سب سے حجیب کر پردہ میں نہیں بیٹھتا، وہ ہم سے غرور نہیں کرتا، مال غنیمت میں اپنے کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا، وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔[1]

انصاف کا عالم یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک سفر میں صحابۂ کرام کے ساتھ تھے، اور کھانا پکلنے کا وقت آیا، تو کام آپس میں تقسیم کر لئے گئے، گو آپ سب کے آقا اور محبوب تھے مگر لکڑیاں لانے کا کام آپ نے اپنے ذمہ رکھا۔

اسلامی تعلیمات اور ان کے ثمرات | پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ لوگ اپنے غلاموں کو حقیر نہ سمجھیں، بلکہ جو کھائیں، وہی ان کو کھلائیں، جو پہنیں وہی اپنے نیچے والوں کو پہنائیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں

فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ	جس کا بھائی اس کے قبضہ میں ہو، اس کو چاہیئے
مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا	کہ جو خود کھائے، اسے کھلائے، جو خود پہنے
تکلفوھم یا یغلبھم فان کلفتموھم	اسے پہنائے، اور ان کو تم ان کی طاقت سے
فاعینوھم	زیادہ تکلیف نہ دو، اگر کوئی مشکل کام سپرد
(بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیۃ)	کرو، تو ان کی مدد کرو۔

اور یہ جو کچھ تھا صرف حکم ہی نہ تھا، بلکہ یہی عمل بھی تھا، اپنا بھی اور صحابۂ کرام کا بھی، حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ ایک مشہور صحابی ہیں، ان کا حال یہ تھا کہ ایک جوڑہ یا کوئی کپڑا خریدتے تو ایک خود لیتے، دوسرا غلام کو دیتے، ایک دفعہ ایک بزرگ نے یہ حالت دیکھی تو پوچھا، کہ یہ

---

[1] آئینۂ حقیقت نما صٓ۲۴۔

کیا بات ہے، انھوں نے جواب دیا کہ ایک دفعہ ایک شخص کو برُا بھلا کہہ رہا تھا، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا ابو ذر! تم اس غریب کو برُا بھلا کہتے ہو صرف اس لئے کہ وہ تمہارا غلام ہے، بلاشبہ تم میں یہ جاہلیت والی بات ہے، پھر اس کے بعد آپ نے مساوات کی تلقین فرمائی۔

صحابہؓ کا عدل و مساوات | حضرت ابو امامہؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابو ذرؓ کا یہ عالم تھا کہ اگر ایک کپڑا ملتا تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر ڈالتے اور آدھا خود استعمال کرتے، اور آدھا اپنے غلام کو دیتے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عالت میں ان کو دیکھ کر خیریت دریافت کی، تو انھوں نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا آپ نے ہی یہ حکم دے رکھا ہے، کہ جو تم کھاؤ، وہی ان کو بھی کھلاؤ، اور جو خود زیب تن کرو، وہی کپڑے ان کو بھی پہناؤ، آپ نے فرمایا، ہاں مرا ہی حکم ہے[1]۔

دنیا میں سرمایہ دار اور غیر سرمایہ دار کی جنگ یہیں سے شروع ہوئی، کہ لوگوں نے اپنے نیچے والوں کو ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا، اگر آج بھی اسلام کے اس قانون پر عمل شروع کر دیا جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے مزدور اور غیر مزدور کے نام پر جتنی لڑائیاں ہیں وہ سب کی سب بند ہو جائیں۔ اور امن و امان بحال ہو جائے۔

غلام و آقا برابر | اسلام کا یہی قانون تھا کہ فاروق اعظمؓ جب بحیثیت خلیفہ مدینہ منورہ سے بیت المقدس روانہ ہوئے، اور غلام کو ساتھ لیا، تو ایک اونٹ ہونے کے باوجود ایسا نہیں کیا کہ خود برابر سوار رہے ہوں اور غلام کو پیدل دوڑایا ہو، بلکہ باری طے کرلی، اور دونوں یعنی امیرالمومنین فاروق اعظمؓ اور آپ کے غلام باری باری سوار ہوتے اور اترتے رہے ایک سوار ہوتے اور دوسرے اونٹ کی مہار تھامے ہوتے، جب شہر قریب آیا، تو باری غلام کی تھی، غلام نے عرض کیا کہ شہر قریب آچکا ہے، اب داخلہ ہوگا، لہذا آپ اونٹ پر سوار ہو جاتے اور مجھے اجازت دی جائے کہ میں مہار پکڑ کر آگے آگے چلوں، فاروق اعظمؓ نے کہا، کہ انصاف

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۸ عن الطبرانی

کے خلاف کیوں کر کیا جائے، باری تمہاری ہی ہے، تم ہی سوار ہو جاؤ، اور بالآخر یہی ہوا، کہ شہر میں اس طرح داخلہ ہوا کہ خلیفۃ المسلمین نکیل پکڑے آگے آگے چل رہے تھے اور غلام سوار تھا۔

پبلک کا احترام | امن وامان کا دارومدار زیادہ تر اسی طرح کے معیاری عدل وانصاف پر ہے، مزدوروں کے نام پر جتنی لڑائیاں لڑی گئیں، یا لڑی جا رہی ہیں، ان کی بنیاد یہی چیز ہے کہ حکمراں طبقہ عوام کے ساتھ انصاف کرنے کو آمادہ نہیں، اسلامی نظام مجبور کرتا ہے کہ انصاف کے دربار میں افسر کی بھی کوئی رعایت نہ کی جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ گورنروں کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا کہ پبلک کے ساتھ محبت وشفقت کا سلوک کیا جائے، اور ان کے حقوق غصب کرنے کا خطرہ بھی دل میں پیدا نہ کیا جائے، ساتھ ہی اپنے بیان میں جو آپ پبلک کے سامنے دے رہے تھے، عوام کو خطاب کر کے فرمایا، کہ جس کے ساتھ حکومت کے آدمی سختی کا معاملہ کریں۔ ان کا مقدمہ یہاں مرے پاس لایا جائے، میں ان سے بدلہ وصول کروں گا، یہ سن کر حضرت عمرو بن العاص نے امیرالمومنین سے کہا "کیا آپ ایسے شخص سے بھی بدلا لیں گے جو اپنی رعیت کو ادب دے"۔ فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا

ای والذی نفسی بیدہٖ الا اقصہ	ہاں بخدا یقیناً میں اس سے قصاص لوں گا اور
وقد رأیت رسول اللہ علیہ وسلم	میں نے تو خود سرور کائنات صلعم کو دیکھا ہے
یقص من نفسہ (جمع الفوائد ج۱ ص۳۱)	کہ آپ اپنے آپ سے قصاص لیا کرتے تھے

غیر مسلم رعایا کا لحاظ | غیر مسلم کے معابد ورسوم کی رعایت نہ کرنے سے بھی امن وامان میں خلل پڑتا ہے، چنانچہ اسلام نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ غیر مسلم ذمیوں کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے اور ان کی مذہبی آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، اوپر اشارہ کر آیا ہوں، کہ حکومت کے وفادار غیر مسلم کا جو احترام اسلامی ضابطہ حیات میں ہے، کہیں اور یہ بات نہیں ہے۔

امن وامان کے سلسلہ میں اسلام کے زریں اصول | اسلام نے سعی کی ہے کہ شروع ہی سے پبلک کے ذہن میں آنے والی حکومت کی طرف سے نفرت پیدا نہ ہونے پائے، اور امن وامان اور عدل وانصاف

کا دامن کہیں سے بھی تار تار نہ ہو، زمانہ جنگ میں امن وامان کی حفاظت اس طرح کی جاتی ہے، کہ کسی کو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں اور گوشہ نشینوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں، جو مقابلہ میں آئیں گے بس وہی مجرم ہیں، جو ان کو مدد پہنچائیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا تقتلوا ولیدا ولا امرأۃ	بچوں اور عورت کو قتل نہ کرو۔

(طحاوی ج ۲ ص ۱۲۷)

دشمن ملکوں کے ساتھ سلوک | یہ ہدایت لشکر بھیجنے کے وقت دیا کرتے تھے، تاکہ کسی سے زیادتی کا ارتکاب نہ ہو سکے، اس سلسلہ میں بے شمار حدیثیں منقول ہیں، حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل النساء والولدان (ایضاً)	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں اور عورتوں کے قتل سے منع فرمایا ہے

یہ اسلام کی ہی شان ہے کہ وہ دار الحرب یعنی دشمن کے ملک پر حملہ آور ہونے کے وقت بھی ان لوگوں کو گزند پہنچانے کی اجازت نہیں دیتا، جو جنگی تدبیروں میں شریک نہیں ہیں، ایک حدیث میں ہے

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا بعث سریۃ یقول لا تقتلوا شیخا کبیرا (طحاوی ج ۲ ص ۱۲۹)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فوج روانہ کرتے، تو اسے ہدایت فرماتے کہ خدا کی عبادت میں جو لوگ منہمک ہوں ان کو قتل نہ کرنا۔

اسلامی قانون اور اس کا پاس | امام ابو جعفر طحاویؒ لکھتے ہیں

ان اھل الحرب اذا تترسوا بصبیانھم فکان المسلمین لا یستطیعون رمیھم الا باصابۃ صبیانھم فحرام علیھم رمیھم فی قول ھولاء و کذالک ان تحصنوا بحصن وجعلوا	حربی کافر جب اپنے بچوں کو اس طرح ڈھال بنا لیں کہ مسلمانوں کے لئے تیر اندازی بغیر بچوں کو مارے ہوئے ممکن نہ ہو تو ایسی حالت میں ان ائمہ کے قول کے مطابق تیر اندازی حرام ہے، اسی طرح اگر حربی کافر قلعہ بند ہو جائیں، اور اسی میں اپنے

فيه الولدان نحرام علينا رمى ذالك الحصن عليهم اذا كنا نخاف من تلف صبيانهم ونسائهم
(شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۱۲۲)

بچوں کو ڈال لیں، تو ہم مسلمانوں پر یہ حرام ہے کہ اس قلعہ پر تیر اندازی کریں اور اسے برباد کریں، اگر بچوں اور عورتوں کی جانوں کے ضائع جانے کا خطرہ بھی ہو۔

اسلام کے ان قوانین کا بغور مطالعہ کیجئے اور اندازہ لگایئے کہ امن وامان کا یہاں کس قدر خیال رکھا گیا جو دین زمانۂ جنگ میں دشمنوں سے اس دور اندیشی کے ساتھ معاملہ کرتا ہو، بھلا اس میں امن کے زمانہ میں اس کی کہاں سے گنجائش نکل سکتی ہے کہ کوئی پبلک اور عوام کے سکون واطمینان کو برہم کر سکے۔

اسلام جس طرح دشمن کے بے قصور افراد کو نہیں چھیڑتا، اور وہ بھی عین لڑائی کے وقت ٹھیک اسی طرح اسلام اپنی حکومت میں ان غیر مسلموں کو بھی کسی طرح نہیں چھیڑتا، جس سے اس کی مذہبی آزادی میں کوئی خلل واقع ہو۔

آنحضرتؐ کا دشمنوں کے ساتھ پیغمبرانہ سلوک

کون ایسی اذیت ہے جو اہلِ مکہ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہنچائی مسلسل بیس سال تک جن لوگوں نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا، اور جو رات دن اسلام کو بیخ وبن سے اکھیڑ پھینکنے کی جدوجہد میں مصروف رہے، ۸ھ میں فتح مکہ کے سال جب پیغمبرِ اسلام حملہ آور کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، تو آپ جانتے ہیں کہ اسلام نے اپنے ان دشمنوں کے ساتھ جنگ کے ایام میں کیا سلوک کیا اور بعد فتح کس طرح نوازا۔

امن وامان کا اعلان عام پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرماتے ہیں

من دخل دار ابی سفیان فهو آمن ومن اغلق بابه فهو آمن ومن دخل المسجد فهو آمن
(جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۲)

جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امن ہے، جو اپنے دروازے بند کرلے، اس کو امن ہے اور جو مسجد حرم میں داخل ہو جائے اس کو امن ہے۔

ومن القی السلاح فهو آمن (ایضاً) اور جو ہتھیار پھینک دے اس کو امن ہے۔

امن عام کا مظاہرہ اور یہ صرف اعلان ہی نہیں تھا، بلکہ اسی پر پورا پورا عمل بھی ہوا، اور اہل مکہ نے اس اعلان سے فائدہ اٹھایا، حدیث ہے کہ جوں ہی یہ اعلان ہوا، اہل مکہ اپنے گھروں، اور مسجد حرم میں چھپ گئے، اور وہ صنادید قریش بھی، جنہوں نے مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے، پورے مکہ کی آبادی میں صرف چار مرد اور عورتیں ایسی نکلیں، جو امن سے محروم رہیں، ورنہ پورے اہل مکہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امن دے دیا اور ان کے سارے قصور سے درگذر فرمایا۔

لما کان یوم فتح مکۃ امن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا اربعۃ وامرأتین (جمع الفوائد ج ا ص ۶۲)

فتح مکہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کو معاف کر دیا اور امن کا اعلان کر دیا، بجز ان چار مردوں اور دو عورتوں کے (جو اپنے ظلم کی وجہ سے قابل عفو نہ تھیں)

دشمنوں کے ساتھ عفو و کرم فتح مکہ کا دن عجیب دن تھا، قریش اپنے گناہوں اور زیادتیوں کی وجہ سے بے حد خائف تھے، اور اپنی جگہ یقین کئے ہوئے تھے کہ ہم سب کی گردن ماردی جائے گی۔ حضرت ابوہریرہ رضی کا بیان ہے

ثم دخل صنادید قریش من المشرکین الکعبۃ وھم یظنون ان السیف لا یرفع عنھم

(شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۱۹۳)

صنادید قریش کعبۃ اللہ میں داخل ہوتے، اور اس یقین کے ساتھ کہ تلوار ان کو معاف نہ کرے گی۔

انھی کا بیان ہے کہ جب وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کے پھاٹک پر آکر سوال کیا ہے، کہ تم میرے متعلق کیا خیال کرتے ہو تو انھوں نے بیک زبان کہا آپ اپنے چھوٹوں کے بردبار بھائی اور اپنے بڑوں کے مہربان بھتیجے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا۔

اقول کما قال یوسف لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین (شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۱۹۳)

میں یوسف علیہ السلام کی طرح اعلان کرتا ہوں آج تمھارے لیے کوئی سرزنش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس اعلان کے بعد خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انھوں نے ایک نئی زندگی محسوس کی، ان کے الفاظ یہ ہیں

فخرجوا کانما نشروا من القبور (ایضاً)

وہ تمام (صنادید قریش) کعبہ سے اس طرح نکلے جیسے وہ قبروں سے نکل کر نئی زندگی پانے پر خوش و خرم ہوں۔

جس دین نے اپنے پیرو کے سامنے اپنے پیغمبر کی یہ عملی تعلیم پیش کی ہو، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس دین سے زیادہ امن و امان کا تصور کہیں اور ممکن بھی ہے۔

ابھی زمانہ قریب میں ہیروشیما، حیدر آباد، ہندوستان اور پاکستان میں امن و امان کے خلاف جو ادھم مچی ہے اسے نگاہوں کے سامنے رکھئے، پھر معلوم ہوگا کہ اسلام کیا چاہتا ہے اور دنیا کو کیا تعلیم دیتا ہے

امن و امان اور اس کی حفاظت اسلام نے ان تمام دروازوں پر پہرہ بٹھا دیا ہے، جہاں سے امن و امان مخدوش ہوتا ہے، اسلام ایک لمحہ کے لئے پسند نہیں کرتا کہ امن و امان کا حسین چہرہ کہیں سے بھی داغ دار ہو، دنیا میں اسلامی نظامِ حکومت رائج ہوتا، تو لاکھوں بے گناہ معصوم بچے، ناتواں بوڑھے، کمزور عورتیں اور دنیا سے الگ تھلگ گوشہ نشین خدا پرست افراد خاک و خون میں تڑپتے نظر نہ آتے۔

اسلامی نظام ہی کی برکت تھی کہ خلفائے راشدین کے قدم جہاں پہنچے، لوگوں نے اپنے سروں پر ظلِ رحمت قرار دیا، اور اس ملک سے ظلم و جور اور افراط و تفریط کا نام و نشان مٹ گیا۔

(باقی آئندہ)

اسلامی صنائع لطیفہ اور یورپی صنائع پران کا اثر

از

اے ایچ کرسٹی

مترجمہ

(جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت، لکچرر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس گلبرگہ)

(۴)

وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں چودھویں اور پندرہویں صدی کے مصر کے بنے ہوئے دو کواڑ محفوظ ہیں۔ ان کواڑوں کے دتے اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کے لئے لکڑی کی جگہ ہاتھی دانت استعمال کرنا ممکن ہوگیا ہے اور اس کی وجہ سے اس میں حیرت انگیز خوبی پیدا ہوگئی ہے۔ ایک کواڑ کے دتے کندہ کاری میں پھول پتوں جیسے بنائے گئے ہیں اور دوسرے کواڑ میں یہ دتے ہندسی شکلوں میں کندہ کر کے بنائے گئے ہیں۔ یہ دونوں کواڑ ویسے ہی چوبی عنبر کی باقیات ہیں جیسا ایک منبر وکٹوریہ اور آلبرٹ عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اس منبر کو مملوک سلطان قائت بے (۱۴۶۸-۹۷) نے قاہرہ کی ایک مسجد میں نصب کر دیا تھا جو انیسویں صدی میں ایک نئے راستے کی تعمیر کے سلسلہ میں توڑ دی گئی تھی۔

مسلمانوں نے مکمل طور پر یا جزوی طور پر ہاتھی دانت کی بہت سی خوبصورت چیزیں بنائی ہیں۔ ہاتھی دانت کو انھوں نے کندہ کاری، منبت کاری یا مرقع کاری سے مزین کیا ہے۔ دسویں صدی میں، ہاتھی دانت میں کندہ کاری کا ایک دبستان جس کا مرکز قرطبہ تھا، ایک ایسی طرز کا کام پیش کر رہا تھا جو بڑی پختہ کاری کا مدعی ہے۔ اس دبستان کے کام کے جو نمونے باقی رہ گئے ہیں ان میں ایک استوانہ نما ڈبیہ ہے جسے زمورا (Zamora) کے کلیسا سے لے کر اب میڈرڈ کے عجائب خانہ آثار قدیمہ میں نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ اس ڈبیہ کے قبہ نما ڈھکن کے

اطراف ایک تحریر میں بتایا گیا ہے کہ یہ ۹۶۴ء میں خلیفہ الحاکم ثانی کے لئے بنایا گیا اور اس کی ملکہ اور شہزادہ عبدالرحمٰن کی والدہ کو تحفتہً دیا گیا۔ اس عہد میں قرطبہ میں اسی طرح کی جو چیزیں تیار ہوئی تھیں، ان کے نفیس ترین نمونے وہ ہیں جو سرتاپا گل کاری، طاؤسوں اور دوسرے پرندوں اور حیوانات کی شکلوں سے پٹے ہوئے ہیں۔ دوسرے نمونے جو اس وقت لندن، پیرس اور دوسرے مقامات پر ہیں، اگرچہ وضع وقطع اور کاری گری کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں لیکن ان کی تزئین دوسرے ڈھنگ سے کی گئی ہے، ان میں ایک دوسرے سے مس کرتے ہوئے دائرے کندہ کئے گئے ہیں اور ان دائروں کے اندر حیوانی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ ایسا ہی ایک اور دُرجک ہے جو اس وقت پام پلونا کے کلیسا میں رکھا ہوا ہے۔ اس مستطیل دُرجک پر دائروں کے اندر حیوانی شکلیں کندہ کی گئی ہیں۔ یہ دُرجک کئی صناعوں کی کاری گری کا اعجاز ہے۔ ان میں سے خیر اور عبید دو صناعوں کے نام ان دونوں پر پڑھے جا سکتے ہیں جو انھوں نے بنائے ہیں۔ یہ دُرجک ۱۰۰۵ء میں کسی درباری امیر کے لئے بنایا گیا تھا جس کا نام اور القاب نمایاں طور پر اس کے ڈھکن پر کندہ دکھائی دیتے ہیں۔

ہاتھی دانت کے کام کی ایک طرز وہ ہے جس کا ایک نمونہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ ایک گول ڈبیا ہے اس کے چپٹے ڈھکن اور جسم پر جالی دار ہندسی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ ڈبیا اس کام کی نمایندگی کرتی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ چودھویں صدی کے قریب قاہرہ میں فروغ پارہا تھا۔ تیرہویں صدی کے ہاتھی دانت کے کام کی ایک اور طرز کو مبہم طور پر (Sicolo Arabic) کا نام دیا گیا ہے یہ ہاتھی دانت کے بے نقش استوانہ نما اور مستطیل ڈبے ہیں اور ان پر رنگین اور طلاء کار تصویریں اتاری گئی ہیں۔ ان کے اوپر گانٹھ دار جھالر بنی ہوئی ہے۔ تصویروں میں انسانی صورتیں، چرندوں اور پرندوں کی شکلیں اور پھولوں اور پیڑوں کے نقش ونگار دکھائی دیتے ہیں ان تصویروں کی طرز وہی ہے جو باتصویر قلمی کتابوں کی تصویروں کی طرز ہے۔ اس طرح کے کام کے ایک نمونے پر ایک شکاری سوار کی تصویر بنی ہوئی ہے اور ایک چیتا سوار کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے۔

مرصع، جالی دار اور کندہ کاری سے مزین ہاتھی دانت کے درجک ہیرے جواہرات رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ ان پر جو تحریریں ملتی ہیں ان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ اکثر تحفہ کے طور پر دینے کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔ اس کے قدیم ترین نمونے اسلامی آرٹ کے آغاز کی بیش قیمت یادگار ہیں۔ ان میں سے بہت سے نمونے حیرت انگیز طور پر مکمل حالت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ لیکن بعض نمونوں پر رنگ کے جو نشان اب بھی دکھائی دیتے ہیں، ان سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ کندہ کار درجک اپنی اصل حالت میں رنگین اور طلائی کام سے مزین کئے گئے تھے بعض درجکوں کے دھاتی قلابے اور زمادے اب بھی باقی ہیں اور یہ خود بھی دھاتی صناعی کی ایک نئی شاخ کے دلچسپ نمونے ہیں۔

کندہ کاری میں مسلمانوں کی مہارت کا آخری شاندار نمونہ ایک نہایت درجہ خوبصورت بلوریں صراحی ہے جو خزانہ سنٹ مارک وینس میں محفوظ ہے۔ یہ شاندار نمونہ تاریخی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے کیوں کہ اس پر مصر کے دوسرے فاطمی خلیفہ العزیز کا نام کندہ ہے۔ یہ ان بلوریں صراحیوں میں سے ایک صراحی ہوگی جن کا ذکر المقریزی نے خزانوں کی اس فہرست میں کیا ہے جو ۱۰۶۲ء میں منتشر ہوگئے۔ ان صراحیوں پر بھی اسی خلیفہ کا نام کندہ تھا۔ صناعی اور ڈزائین کے لحاظ سے یہ صراحی اس دور کی شایانِ شان یادگار ہے جو اسلامی آرٹ کے لحاظ سے ایک عہد آفریں دور مانا جاتا ہے۔

ہمارے روزانہ استعمال کی وہ چیزیں جو اپنے مسالے، تکنیک اور ڈزائین کے لحاظ سے کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی مرہونِ منت ہیں، ان میں چھپی ہوئی کتابیں غالباً سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر مستعمل ہیں۔ اگرچہ پہلی نظر میں مشرق سے ان کا تعلق بعید نظر آئے گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی کتاب سازی نے قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی مہارت اور ان کی کاری گری سے بہت کچھ سیکھا ہے یہ تو ماضیِ قریب ہی کی بات ہے کہ اسلامی ادب مشینی طریقوں سے پیش کیا جانے لگا، جو یا تو ٹائپ میں یا پھر لیتھو میں ہوتا ہے۔ لیتھو کے طریقے کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے کیوں کہ اس میں تمام صناعوں کے سرتاج یعنی خطاط کا اصل کام محفوظ رہتا ہے۔ اگرچہ اسلامی ملکوں میں اشاعت سے بہت پہلے

یورپ میں طباعت کا فن مکمل ہو چکا تھا، لیکن اس کے اہم ترین نہ سہی، ایک نہایت اہم مسالے کے لئے ہم مشرق ہی کے رہینِ منت ہیں۔ کاغذ ایک قدیم چینی ایجاد ہے۔ اہلِ یورپ سے مسلمان اس وقت واقف ہوئے جب انھوں نے ۷۵۱ء میں سمرقند کو فتح کر لیا اور چینی صناعوں سے کاغذ سازی کا فن سیکھ لیا۔ پھر کاغذ کا استعمال مسلمانوں کے ذریعہ یورپ میں عام ہوا۔ کاغذ پر لکھے ہوئے بہت سے عربی مخطوطات نویں صدی کے مکتوبہ ہیں۔ لیکن بارہویں صدی تک نصرانی دنیا میں کاغذ درآمد نہ ہوا تھا اور تیرہویں صدی میں بھی اس کا استعمال بہت محدود تھا۔ یورپ میں کاغذ کے اولین کارخانے مسلمانوں نے اندلس اور صقلیہ میں قائم کئے تھے جہاں سے یہ صنعت اطالیہ میں پھیل گئی۔

پندرھویں صدی میں مشینوں کے ذریعہ جب کتاب سازی تجارت کی چیز بن گئی تو مشین سے تیار کی ہوئی کتابوں کے لئے کاغذ ایک اہم مسالہ بن گیا جس کے بغیر طباعت کو وہ ترقی حاصل نہ ہوتی جو اسے کاغذ کے ذریعہ حاصل ہو گئی۔ یہ صرف کاغذ ہی نہیں جس کے لئے عہدِ حاضر کے ناشر مسلمانوں کے رہینِ منت ہیں۔ چودھویں صدی کے دوران میں جب وینس، آرٹ میں مسلمانوں کے مختلف ٹیکنیکوں کو نہایت سرگرمی کے ساتھ جذب کر کے باہر ان کی اشاعت کر رہا تھا، اطالیہ میں بنی ہوئی کتابوں کی جلدوں نے بالکلیہ مشرقی ڈھنگ اختیار کر لیا۔ اس عہد میں بعض جلدوں نے وہ خصوصیت بھی اختیار کر لی جو مسلمانوں کی بنائی ہوئی جلدوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ یہ وہ "زبان" یا "لسان" ہے جو کتاب کے اگلے حصے کے کونوں کو محفوظ رکھنے کے لئے لگائی جاتی ہے۔ یہ خصوصیت اب بھی کھاتوں کی بعض کتابوں میں باقی چلی آ رہی ہے جیسی کہ ہمارے بنکروں کے "پاس بک" (Pass book) ہیں اور زبانِ حال سے اپنے مشرقی الاصل ہونے کی داستان سنا رہی ہیں۔

ایک اور ایجاد جس نے مسلمانوں کے کام کا اثر قبول کیا، وہ چرمی جلدوں کی ایک نئے ڈھنگ سے تزئین ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپی جلد سازوں نے اکثر چرمی جلدوں کو دھاتی ٹھپوں کی چھاپ لگا کر مزین کیا ہے۔ جیسے جیسے یہ نقوش بڑے اور ڈزائین کے لحاظ سے پیچیدہ ہوتے گئے، اس طریقہ نے اور بھی زیادہ اختیار کرنا شروع کیا۔ جلد کی سطح پر نہایت خوش

صدی کے ساتھ بنائے ہوئے ٹکڑے آپس میں مل کر نہایت دل کش نقشہ بناتے تھے اور ان کے ساتھ عام طور پر حاشیے استعمال کئے جانے لگے۔ ٹھپے کے ذریعہ جو نقوش بنائے جاتے تھے وہ ابھروان کام ہی میں ہوتے تھے، یہاں تک کہ مشرقی صناعوں نے دبے ہوتے حصوں میں سنہرا روغن استعمال کرنا شروع کیا۔ اس طریقے سے وینس میں بسے ہوئے مسلمان جلد سازوں نے یورپ کو روشناس کرایا۔ پندرھویں صدی میں اس طریقے کی جگہ ایک اور طریقے نے لے لی۔ اس میں سونے کے ورق استعمال کرتے ہوئے گرم کئے ہوئے اوزار کی دوبارہ چھاپ لگا کر دبے ہوئے حصوں میں سونا مڑھ دیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیا طریقہ سب سے پہلے قرطبہ میں ایجاد ہوا تھا۔ سولھویں صدی میں مسلمان اور نصرانی جلد ساز دونوں کثرت سے اس طریقے سے کام لے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی قدیم مشرقی طلاء کاری کا طریقہ بھی پوری طرح ترک نہیں ہوا تھا۔

مشرقی طریقے کی طلاء کاری کے ذریعہ جو دل کش نقش ونگار بنائے جاتے تھے اس کی ایک بہترین مثال چمڑے کی ایک جلد ہے جو وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ یہ چرمی جلد چودھویں صدی کے آخر یا پندرھویں صدی کے ابتدائی زمانے کی بنی ہوئی ہے اور قاہرہ میں تیار کی گئی ہے۔ یہ جلد چند معمولی ٹھپّوں کے ذریعہ نہایت صبر کے ساتھ بے شمار نقش بنا کر ایک واضح اور نازک ڈزائین بنانے کا اعجاز ہے۔ وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں ایرانی کی بنی ہوئی سولھویں صدی کی ایک چرمی جلد محفوظ ہے مشرقی جلد سازوں نے تزئین کے جو دوسرے طریقے اختیار کئے تھے یہ جلد ان پر خوبی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ طریقے سترھویں صدی سے بھی پہلے کے ہیں اور نمونہ بھی سترھویں صدی سے پہلے کا ہے۔ گلابی رنگ کی اس چرمی جلد کے وسط میں ٹھپّے کے ذریعہ ایک نقش بنایا گیا ہے اور اس پر طلاء کاری کی گئی ہے۔ اس کے اوپر نیچے اور اس کے ہر گوشے میں، دوسرے خوبصورت نقش ہیں جو جلد کی سطح سے نیچے کھود کر بنائے گئے ہیں اور انھیں مہین سفید چمڑے کی جھالر سے مزین کر کے سیاہ زمین میں چسپاں کر دیا گیا ہے۔ جلد پر ریشمی قسم کا میدان بنا کر اس میں پیڑوں اور چرندوں اور پرندوں کی شکلیں اُتاری گئی ہیں۔ ان حیوانوں میں مشرق بعید کا اژدھا بھی موجود ہے یہ سب

تصویریں سادی زمین دے کر سونے سے بنائی گئی ہیں۔ وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں وینس کی بنی ہوئی ایک جلد محفوظ ہے جس پر ۱۵۴۲ء کی تاریخ درج ہے۔ اس جلد پر بھی دبے ہوئے نقش بنائے گئے ہیں اور اس پر تصویریں بنائی گئی ہیں۔ صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایرانی کام کی نقل ہے اوپر ایک مصری چرمی جلد کا ذکر آچکا ہے۔ اس چرمی جلد پر ایک مرکزی بیضوی حلقہ بنا ہوا ہے اور اسی بیضوی حلقے کا ایک چوتھائی حصہ ہر گوشے پر بنایا گیا ہے۔ مذکورہ ایرانی جلد پر بھی تزئین کاری کی یہی اسکیم ملتی ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ بہت سی صنعتوں میں اس طرح کا نقشہ مشترک ہے۔ ایسا ہی ڈزائین جس میں مرکزی اور گوشوں کے نقوش ہیں، وینس کی بنی ہوئی ایک جلد پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ جلد وکٹوریہ اور البرٹ عجائب گھر میں محفوظ ہے اور اس پر ۱۵۴۶ء کی تاریخ درج ہے۔ اس پر جو طلائی کام کیا گیا ہے وہ اسلامی کام کے اثر کی صاف غمازی کر رہا ہے۔ اسی عجائب گھر میں بعد کے زمانے کی جرمنی کی بنی ہوئی ایک جلد محفوظ ہے اس پر بھی اسی قسم کی تزئین کاری نظر آتی ہے، البتہ اس عہد کے یورپی مذاق کے مطابق اس کی تفصیلات میں کچھ کمی بیشی کردی گئی ہے

یہ چاروں جلدیں پوری طرح سے اس فنی عمل کے ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہیں جس نے اسلامی ملکوں میں جنم لیا اور یورپی کارخانوں میں راہ پا گیا۔ یہ فنی عمل تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ ڈزائین کی اسکیمیں اور تزئینی عناصر لیتا آیا اور اس نے عصر حاضر کے فن جلد سازی میں مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمائے۔ نفیس چرمی جلدوں پر سیدھی اور آڑی لکیریں اور حروف جس طرح پوری دنیا میں بنائے جاتے ہیں، ان کے بنانے کے ذرائع کو مسلمان صناعوں ہی نے مکمل کیا تھا اور جب انیسویں صدی میں مشینوں کے ذریعہ بنی ہوئی جلدیں قدیم دستکاری کی جگہ لینے لگیں تو مشینوں کی بنی ہوئی جلدوں کے بنانے کے طریقوں میں بھی بڑی حد تک اسلامی ملکوں سے حاصل کئے ہوئے طریقوں سے کام لیا گیا۔

اٹھارویں صدی کے دوران میں یورپی کارخانوں میں کتابوں کی جو جلدیں بنی ہیں، ان کے سرورق، خاتمے کے اوراق، اور اوراق کے کناروں پر جو "مرمریں" نقوش عام طور پر نظر آتے ہیں، وہ سب کے سب راست مشرقی ماخذوں سے لئے گئے ہیں۔ ایسے نقوش کے دل کش نمونے

کاغذ کی ایسی پٹیوں پر پائے جاتے ہیں جو مسلمان مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں اور خطاطی کے نمونوں کے اطراف حاشیوں کے طور پر سولھویں صدی میں نوادرات کا ذوق رکھنے والوں کے لئے لگائے گئے ہیں۔ ان کا اعلیٰ ذوق اس امر کا متقاضی تھا کہ ان کے نوادرات کا جو حاشیہ بنایا جائے وہ نہایت درجہ خوبصورت اور دل کش ہو۔ بیکن کے عہد میں انگلستان "مرمریں کاغذ" (Marbled paper) سے واقف تھا۔ بیکن نے لکھا ہے: "ترکوں کو کاغذ کے مرمریں بنانے کا فن خوب آتا ہے جو ہمارے یہاں مروج نہیں۔ یہ لوگ مختلف روغنی رنگ لیتے ہیں اور ان کو قطرہ قطرہ کر کے پانی میں ڈالتے ہیں۔ پھر پانی کو آہستہ آہستہ ہلاتے ہیں اور اپنے کاغذ کو جو کافی دبیز ہوتا ہے اس میں ڈبوتے ہیں۔ اس طرح سے کاغذ پر مرمر یا رخام کی طرح دھاریاں اور لہریں پیدا ہو جاتی ہیں"۔

سولھویں صدی کے آخر میں جو جلدیں مغرب میں بنی ہیں ان کے ابتدائی اور آخری اوراق مشرق سے لائے گئے تھے۔ اس کے ایک سو سال بعد جا کر کہیں یورپی جلد سازوں نے خود ہی یہ کاغذ تیار کرنے شروع کئے ہیں، ہاتھ کے بنے ہوئے مرمریں کاغذ اب شاذ و نادر ہی استعمال ہوتے ہیں، لیکن اس کی کم و بیش بھونڈی اور بھدی نقلیں اب بھی مختلف اغراض کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک اسلامی آرٹ کو یورپ ایک حیرت انگیز چیز کی حیثیت سے دیکھتا آیا ہے۔ اول اول اس لئے کہ اسلامی آرٹ کا بہت قریبی تعلق ان ملکوں سے تھا جو نصرانیت کی میراث سمجھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں تحیر اس لئے رہا کہ خود اس آرٹ میں غیر معمولی حسن و خوبی اور دلربائی تھی۔ اس آرٹ کی بہت سی بیش قیمت پیداوار محض قرون وسطیٰ کی دین داری کی وجہ سے سلامت رہ گئیں۔ ان میں سے بہت سی چیزیں صدیوں تک کلیساؤں میں محفوظ رہیں۔ ایک دُرجک جو کبھی کسی خلیفہ کے جواہرات کا کام دیتا تھا، کلیساء میں مقدس باقیات کے رکھنے کا ڈبا بن گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باقیات کسی مسلمان امیر کی خلعت سے کاٹ کر حاصل کئے ہوئے نفیس ریشم میں لپیٹ کر اور اس دُرجک میں رکھ کر ارض مقدس سے

لائی گئی ہوں۔ جس حیرت کی نظر سے یہ چیزیں دیکھی جاتی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بنی عربی عجیب شکلوں اور پُراسرار تحریروں کو معنی پہنائے جانے لگے۔ کبھی تو انھیں طلسمات سمجھا جاتا تھا اور اس رسم خط کو حضرت سلیمانؑ سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی انھیں کے عہد کا مانا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرونِ وسطیٰ میں آثارِ قدیمہ کا فن داستان طرازی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ تو پچھلی صدی کی بات ہے کہ تحقیق کی ٹھنڈی روشنی میں ان روایات پر شک وشبہ کے اظہار کی جسارت ہونے لگی جو بعض نوادرات کے ساتھ وابستہ تھیں۔ کسی کے ساتھ یہ شاندار روایت وابستہ تھی کہ اسے ہارون الرشید نے بطور تحفہ شارلیمین کو بھیجا تھا، اور کسی کے ساتھ یہ روایت منسوب تھی کہ اسے سینٹ لوئی نے مشرق میں حاصل کیا تھا۔ اب چاہے ایسی باتوں سے جھوٹے افتخار کے ساتھ ان چیزوں کی نمود و نمائش ہوتی ہو یا نہ ہو، ان کا شکوہ اصلی و حقیقی چیز تھی۔ یہ وہ شاہکار تھے جنھیں ہر صنّاع عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا کہ یہ چیزیں ہمیشہ ان لوگوں کے لئے فیضان کا منبع بنی رہیں جنھوں نے مغرب میں نظر انداز کردہ صنعتوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

نصرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان ربط وضبط صلیبی لڑائیوں سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔ اندلس میں اسلام نے یورپ کی مغربی سرحدوں پر اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے تھے اور یہاں سے وہ نصرانی ثقافت پر اپنے گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ صقلیہ میں دونوں ادیان کی برابر برابر کی حکومت تھی اور شمالی آفریقہ پر تمام تر اسلام ہی کا پرچم لہرا رہا تھا اور ادھر مسلمانوں کے جہاز بحیرۂ روم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹ رہے تھے۔

صلیبی لڑائیوں کے ساتھ ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ نیم افسانوی شان وشکوہ جو روایتاً مسلمانوں سے منسوب کیا جاتا تھا، متحیر نصرانی دنیا کے آگے حقیقت بن کر آیا۔ یورپ کے ہر حصے سے اکٹھے ہونے والے انبوہ کا یک بیک ایک ایسے سماجی نظام سے قریبی تعلق قائم ہو گیا جو اس گروہ میں شامل لوگوں کے محدود تجربات کی حدوں سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جو عصری ترقیاں رونما ہو رہی تھیں ان پر اس نئے ربط کے اثرات بہت جلد واضح ہو گئے۔ اور فنونِ

لطیفہ میں تو یہ اثرات بہت ہی دوررس ثابت ہوتے، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اطالوی جزروں نے راست شامی بندرگاہوں سے آمد ورفت کا سلسلہ قائم کرلیا۔ مشرق سے تجارت باضابطہ اور باقاعدہ بن گئی اور اسلامی ملکوں کے کارخانوں کی بنی ہوئی ہر قسم کی نادر چیزیں یورپی منڈیوں میں درآمد ہونے لگیں۔ ان درآمدات نے نئی ضرورتوں کو پورا کیا، اور یہ جہاں کہیں بھی گئیں ان کی نقل کی جانے لگی۔ ان کی وجہ سے یا تو فوراً ہی یا مستقبل میں پایۂ تکمیل کو پہنچنے والے طریقوں کے ذریعہ ترقیوں کی شاہراہیں کھل گئیں۔

اس نازک دور میں جب کہ مغرب قرونِ وسطیٰ کے حالات سے باہر نکل رہا تھا، دینی جوش کی اکسائی اور ابالی ہوئی قوتوں نے عمل کا ایک اور روپ دھارا اور تمام تر تجارتی سرگرمیوں کو اپنا مرکز بنالیا۔ پندرھویں صدی میں یورپی صناع نشأۃ ثانیہ کے جزو لازم نظر فریب در پُرشکوہ صنائع لطیفہ کی کامیابی سے مجبور ہوکر مشرق کی طرف ایک نئی دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ مسلمان صناعوں کے طریقوں کے گہرے مطالعے سے متاثر ہوکر انھوں نے اپنے فنی عمل کا دوبارہ جائزہ لیا اور اس میں وسعت پیدا کی اور ان عناصر کو اپنے فنی عمل میں ان تزئینی عوامل کے ساتھ جذب کرلیا جو اس راستے سے اس میں داخل ہوگئے تھے۔ یورپی صناعوں نے مسلمان صناعوں کے ڈزائین کے قاعدوں کا جائزہ لیا، اور ایک نئے جذبے کے ساتھ ایسی صنعتوں میں انھیں استعمال کرنا شروع کیا جو اصل کے لحاظ سے خالص یورپی تھیں۔ معمولی قسم کے صناعوں ہی نے نہیں بلکہ لیونارڈو دا ونشی جیسی نامور ہستیوں نے مشرقی نقوش پر تجربے کئے ہیں۔ لیونارڈو دا ونشی کی ایک یادداشت میں ایسا ہی ایک تزئینی نقشہ ملتا ہے جو اس طرح کے مطالعات سے اس کی دل چسپی کی شہادت دے رہا ہے۔

یہ ایجادیں ہمیشہ راست مشاہدے کا نتیجہ نہ ہوتی تھیں کیوں کہ سولھویں صدی ہی میں مصادر کے پھیلانے کا ایک نیا طریقہ عالمِ وجود میں آچکا تھا۔ یہ چھاپے کی مشینوں کی فوری پیداوار "نقشوں کی کتاب" تھی۔ نمونوں کے ایسے مجموعوں کے ذریعہ ایک نئی طرز میں ماہر نمونہ کاروں کی تحقیقات تک ایسے لوگوں کی رسائی ہوئی جن کی اصلی ماخذوں تک پہنچ مشکل تھی۔ ایسی ہی انتہائی دلچسپ

نقشوں کی کتابوں میں ایک نادر کتاب فرانسسکو دی پلی گری نو[1] کی مرتب کردہ ایک جلد ہے اس کتاب میں جتنی مثالیں دی گئی ہیں وہ سب کی سب اسلامی نمونوں سے لی گئی ہیں۔ اس کتاب سے اور اس کی ہم عصر اسی قسم کی نقشوں کی کتابوں سے (مثلاً پیٹر فلوٹنر، ورجل سولس، مارٹی نس پیٹرس وغیرہ کی مرتب کی ہوئی کتابیں) ہالبین (Holl Bein.) کے ڈزائینوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ ہالبین نے چاندی کا کام کرنے والوں اور دوسرے صناعوں کے لئے جو نقشے تیار کئے ہیں، ان میں اسلامی اثر ایک بدیع طرز میں ڈھل گیا ہے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ولندیزی اور انگریزی تاجرانہ سرگرمیاں شرق الہند میں واسکوڈی گاما کی مہمات کے نتائج سے فیض یاب ہونے لگیں۔ پھر توراست مشرق سے تجارت کا ایک روز افزوں دھارا ہی بہنے لگا اور اس تجارت نے روزمرہ زندگی سے متعلق صنعتوں کو گہرے طور پر متاثر کرنا شروع کیا جنہوں نے عصر حاضر کی صنعتی ترقیوں کے لئے راستہ صاف کردیا۔ ایشیا کے اسلامی ملکوں سے بظاہر غیر اہم بہت سی چیزیں درآمد ہوتی تھیں جو ضروریات زندگی میں داخل ہوگئی تھیں۔ ان چیزوں کو یورپ میں نہ صرف پسند کیا جانے لگا بلکہ یہی چیزیں پوری متمدن دنیا میں پھیل گئیں۔ باربردار جہازوں کے ذریعہ درآمد ہونے والے سوتی کپڑوں اور دل کش زنگارنگی نقوش چھپے ہوئے چھینٹوں نے پارچہ بافی کی صنعت کو ایک نئی جان بخشی۔ پیرس میں ترقی کر کے اسی صنعت نے "Peri ames" کا لقب پایا۔ اسی صنعت نے ملکہ این کے عہد میں خواتین کے ملبوسات کے لئے خوبصورت پارچہ مہیا کیا اور اسی صنعت نے بعد میں مانچسٹر کے لئے کثیر دولت فراہم کی۔ نئی نئی شالیں، جیسا کہ خود ان کے ناموں سے ظاہر ہے، ایران سے آتی تھیں۔ بعض خاص قسم کے چائے دان اور قہوہ دان جو غالباً مغل صراحیوں کی نقل

---

[1] فلارنسا ئین کا ایک مصور اور مجسمہ ساز جس نے فرانسس اول کے لئے جو فرانس میں فرانسسکو پلے گراں کے نام سے مشہور ہے، نادینتن بلو کی تزئین میں حصہ لیا تھا۔ اس کی کتاب پر ۱۵۳۰ء کا سن درج ہے۔ اس کتاب کا ایک عکسی اڈیشن اپنے مقدمے کے ساتھ گستان میگنان نے ۱۹۰۸ء میں پیرس سے شائع کیا تھا۔

ہوتے تھے، نودولت تاجر (نواب) ہندوستان سے لے کر آتے تھے اور عام طور پر ملکہ وکٹوریہ کے عہد تک ناشتے کے دسترخوان کی زینت بنے رہتے تھے اور تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ یہ چائے دان اور قہوہ دان آج بھی مستعمل ہیں۔

اسلام کی ابتدا ہی سے مغربی زہد و تقویٰ، علم و فضل، صنعت و تجارت اور ندرت پسندی ہر ایک کو مسلمانوں کی قدرت و مہارت سے اس کے مذاق کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور ملا ہے لیکن مغرب کے استادانِ فن نے اپنی فنی مہارت اور حسن کاری کے لئے بار بار ایک ایسے خزانے سے فیض اُٹھا کر یورپی صنائع لطیفہ میں جان ڈال دی جو ہم اہل مغرب کے لئے ایک حادثہ سے زیادہ دائمی وظیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان استادانِ فن میں اوڈی ریکیس رومی بھی ہے جس نے ۱۲۶۸ء میں وسٹ منسٹر ایبے کے آخری مشرقی حصہ (Presbytery) کے مبنت کار مرمریں فرش پر اسلامی نقشے بنائے، اور ولیم مورس بھی جس نے ایسا ہی نقشہ ۱۸۸۵ء میں اپنے مخملیں قالین پر کاڑھا ہے۔ ان استادوں کے درمیان اور ان کے بعد کتنے ہی استاد ملیں گے جو اس خزانے سے لگاتار فیض یاب ہوتے آئے ہیں۔

رفاہ عام

از

(جناب مولوی محمد انظر شاہ صاحب استاذ دار العلوم دیوبند)

(۳)

شام کی وہ عشری زمینیں جن کا کوئی دعوے دار نہیں تھا جب مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں تو مسلمانوں نے ان کو

"قابل کاشت بنایا وہ بنجر تھیں" فتوح البلدان ص۲۴۳

ان چند مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے میں غیر معمولی جدوجہد سے کام لیا بلکہ اس مقصد کے لئے وہ تالیفِ قلب سے بھی کام لیتے تھے چناں چہ ہارون الرشید کے زمانہ میں جب فلسطین میں طاعون پھیلا اور اس میں مبتلا ہو کر بستیاں اجڑ گئیں، اور زمینیں بیکار ہو گئیں تو رشید نے ان زمینوں کو آباد کرنے کے لئے ایک والی کو بھیجا اس نے

"تمام زمینیں آباد رکھیں اور کسانوں اور زمینداروں کی تالیفِ قلب کی" (ایضاً ص۲۵۹)

اسلام کو افتادہ آراضی کے قابلِ کاشت بنانے میں جو اہتمام ہے یہی وجہ ہے کہ فقہا نے اس سلسلہ میں ترغیب کے لئے یہ حکم شرعی بھی پیش کر دیا

"جو شخص بے کار زمین کو باذنِ امام یا بلا اذن آباد کرے اس کا مالک سمجھا جاتا ہے"

(احکام السلطانیہ ص۲۸۳)

ظاہر ہے کہ افتادہ اور موات زمینوں کے متعلق اس فیصلہ کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ عام لوگوں میں زمینوں کو کاشت کے قابل بنانے کا جذبہ و خواہش زیادہ سے زیادہ پیدا ہو اور اس طرح ملک کی ثروت و دولت بڑھ کر وہاں کے عوام کی خوشحالی اور فارغ البالی کا موجب ہے۔ مسلمانوں نے عوام کو آسودہ حال بنانے کی جو تدابیر اختیار کیں تھیں وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے کس قدر خوش کن ہیں

بنجر زمینوں کے متعلق اگر اس قسم کے احکام آج بھی نافذ کر دیئے جائیں تو افتادہ زمینوں کے ذریعہ سے، پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کے ساتھ، خوراک کے لاینحل مسائل کے حل کرنے میں کس قدر مدد مل سکتی ہے۔

آب رسانی | اسی طرح مسلمانوں نے قریوں، شہروں اور انسانی آبادیوں میں آب رسانی کے سینکڑوں ذرائع پیدا کئے۔ انسانوں کی جن بستیوں میں پانی کھینچنے کے خاطر خواہ انتظامات نہیں تھے اور اس وجہ سے وہ نہ صرف پیاس اور تشنگی کی تکالیف میں مبتلا تھے بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی جن میں پانی کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ ان میں پانی کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے شدید پریشان تھے، مسلمانوں نے اس طرف توجہ کی اور اپنا مال و متاع اور ذرائع و وسائل استعمال کر کے ایسی تمام دور افتادہ جگہوں میں پانی بہ سہولت پہنچا دیا چناں چہ علی بن عیسیٰ جس کے رفاہیتِ عامہ سے دلچسپی کے تذکرے آپ پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ مکہ میں پانی کی شدید قلت ہے تو اس نے

"اپنی طرف سے سینکڑوں اونٹ، خچر اور گدھے خریدے جو جدہ سے روزانہ پانی لاتے تھے"

تاریخ امت ص۷۰

موجودہ وقت میں جب جدہ سے مکہ تک کے راستے محفوظ و مامون کر دیئے گئے اور تمدنی دور کی آرام دہ ذرائع نقل و حمل وہاں موجود ہیں تو غالباً ان تمام سہولتوں میں علی بن عیسیٰ کے یہ کارنامے زیادہ اہم نظر نہ آئیں، مگر آج سے صدیوں پہلے جب غیر محفوظ راستوں میں سفر کرنا ہوتا تھا اور حمل و نقل کے تمام تر کام، گدھوں اور خچروں وغیرہ سے لئے جاتے، روز کے روز پانی ضرورت کے موافق مکہ میں پہنچا دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال مسلمانوں کی یہی بلند حوصلگی تھی جس کی بنیاد پر دیانت پسند، انسانوں کی تاریخ اس کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور تاریخ کے اوراق ان کے زندہ تمدنی کارناموں سے جگمگاتے رہیں گے، دمشق کے وسط شہر میں الیزاب کی گھاٹی کے نیچے۔ بردا ندی بہتی ہے۔ مسلمانوں نے اس پہ پل باندھا جس کے نتیجہ میں غوطہ کے

"سارے مکانات، حمام اور گلی کوچوں میں اسی کا پانی لیا جاتا ہے۔" (اصطخری ص۵۹)

ظاہر ہے کہ اس وسیع و عریض ندی پر پل اسی وجہ سے باندھا گیا تھا تاکہ غوطہ اور اس کے قرب و جوار میں آب رسانی کی صورتیں نکل آئیں اسی دمشق کے متعلق، اس کی خوشحالی، شادابی اور علاقہ کی زرخیزی کے متعلق تفصیل سے کام لیتے ہوئے مؤرخ نے رفاہیت عامہ کے ان امور کی جو فہرست دی ہے جو مسلمانوں نے وہاں پر کی، اسی فہرست میں یہ بھی لکھا ہے

"دمشق میں آب رسانی کا بے مثل انتظام کیا ہے اور عام حوض اور نلوں کی کثرت ہے۔"

(یاقوت دوم ص۵۸۸)

زمین دوز نالیاں آب رسانی کے خاطر مسلمانوں نے زمین دوز اور مسقف نالیوں سے بھی کام لیا اور اس طرح پانی کے سلسلہ میں آبادیوں کی ضرورت پوری کی، حلب کا ایک موضع حیلان اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں ایک بڑا چشمہ بہتا ہے جو بہکر حلب تک پہنچ جاتا ہے پھر

"زمین دوز نالیوں کے ذریعہ اس کا پانی شہر میں لاتے ہیں اور تقسیم کر کے جامع مسجد اور شہر کے دوسرے محلوں میں بھی اسے پہنچا دیا ہے۔ (بلاد فلسطین و شام ص۵۶۵)

خان السلطان، تبوک کے جنوب میں قافلوں کے لئے بطور منزل گاہ کے سلطان صلاح الدین ایوبی کا بنایا ہوا ہے، اسی خان میں آب رواں موجود ہے۔ جس کو اندر ہی اندر ایک خزانہ تک پہنچایا گیا ہے۔ اس کے اندر دراز یں بھی ہیں جن سے پانی نکل کر ایک چھوٹی سی نہر میں پہنچ جاتا ہے اور

"وہاں سے نالیوں کے ذریعہ زمین تک پہونچایا جاتا ہے۔" (ابن جبیر ص۲۶۱)

---

* دمس کس جیسے دمشق کہتے ہیں شام کا صدر مقام اور کرۂ ارض کا ایک حسین باغ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ دمشقوا بتائی جاتی ہے۔ یعنی شہر کے بنانے والوں نے شہر کے بنانے میں بہت جلدی کی۔ دمشق کی بنا رسام بن نوح کے پوتے قانی کے بیٹے دمشق یا ایک روایت کے مطابق ہو تاسف نے ڈالی تھی، مسلمانوں نے سنہ۱۴ھ ماہ رجب میں اس کو فتح کیا اور حضرت خالد و ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما اس کو فتح کرنے والے ہیں۔ اس جاذب نظر باغ عالم کی آراستگی و خوبصورتی کے لئے مسلمانوں نے جو کوششیں کیں، تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ اگر صرف مسلمانوں کے آثار عمارت وتعمیر کی حد تک اس شہر کے لکھے جائیں تو بلا مبالغہ ایک کتاب بن جائے

اسی طرح ابن حوقل، نیشاپور کے تذکرہ میں لکھتا ہے

"اس شہر میں پانی زیر زمین نالیوں کی راہ سے لایا گیا ہے یہ نالیاں باشندوں کے مکانوں کے نیچے نیچے بنائی گئی ہیں پھر شہر والوں کی ضرورت کو پوری کرکے نہر شہر سے باہر نکل جاتی ہے اور ان کشت زاروں اور باغوں میں گم ہو جاتی ہے جو شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوتے ہیں (بحوالہ ہزار سال پہلے ص ۱۳۴)

یہ زیرِ زمین نالیاں ابن حوقل ہی کے بیان کے مطابق ننلو، ننلو درجہ تک گہری تھیں اور ان کی حفاظت و نگرانی کے لئے حکومتوں کی طرف سے باقاعدہ محکمے مقرر کیے گئے تھے۔ کچھ ٹھکانہ ہے مسلمانوں کی ان الوالعزمیوں کا کہ انسانوں کو پانی کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے انھوں نے اپنے خزانوں کے منھ کھول دیئے اور بے دریغ روپیہ لٹا دیا۔ خراسان کے مشہور شہر مرو کے متعلق ابن حوقل نے تفصیل سے یہ بتاتے ہوئے کہ وہاں دریائے مرغاب سے نہریں کاٹ کر شہر میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا تھا یہ بھی اطلاع دی ہے۔

"دس ہزار آدمی پانی کی سربراہی کے اس طریقہ پر کام کرتے ہیں اور ان کا افسر بالا مرتبہ میں گورنر شہر سے کم نہیں" بحوالہ ہزار سال پہلے ص ۱۳۵

ابن حوقل کے ان مستند بیانات پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ مسلمانوں نے رفاہیتِ عامہ کے لئے جس بلند حوصلگی سے کام لیا اور جس کے تذکروں سے ہماری اسلامی تاریخیں مزین ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد ایسے بیانات پر ایک سکنڈ کے لئے بھی بے اعتمادی پیدا نہیں ہوتی بہر حال اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ رفاہِ خلق کے معاملہ میں ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ صرف ایک پانی ہی کے متعلق شعبہ میں دس ہزار آدمیوں کو مامور کر دیا گیا تھا۔ یہ عملہ اپنے کاروبار کی نوعیت سے کس درجہ اہم تھا اس کا اندازہ ابن حوقل کے اسی بیان سے ہو سکتا ہے کہ افسر بالا۔ اثر و رسوخ اور اعزاز و منصب میں شہر کے گورنر سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

کروڑوں روپے کا خرچ　پانی کے ذخیروں کو عام کرنے اور عام انسانوں کی تکالیف اور دشواریوں کا

ازالہ کرنے کے لئے مسلمانوں نے جس وسعت و فراخ حوصلگی سے کام لیا اور زرعی اسکیموں میں پانی کے استعمال اور اس کی ضرورت پر جس قدر انھوں نے جدوجہد کی اس کی تفصیلات کو میں ختم کر رہا ہوں۔ رفاہِ خلق کا یہ وہ عظیم الشان شعبہ تھا جس کی تفصیلات، باوجود کوشش و خواہش کے مختصر نہ کی جا سکیں۔ اسی مضمون کے کسی حصہ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے خزانوں اور ان کے اندوختے، رفاہیتِ عامہ کے ان شعبوں پر جو کچھ خرچ ہوا اس کی تفصیل بھی پیش کی جائے گی، مگر افسوس کہ مورخین سب کچھ ذکر کرنے کے باوجود، کروڑہا کی رقم جو ان چیزوں پر خرچ ہو رہی تھی اس کی تفصیل بیان نہیں کرتے۔ میں نے چاہا کہ اس سلسلہ میں، کچھ معتبر معلومات حاصل ہو جائیں مگر میری کوشش زیادہ کامیاب نہ ہو سکی تاہم زرعی ترقیات اور آب پاشی پر، آب رسانی اور پانی کے ذخیروں کو عام کرنے پر مسلمانوں نے جو زرِ کثیر صرف کیا، اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس قسم کی کوششوں پر جو کچھ اخراجات آ رہے ہیں ان کو سامنے رکھا جائے تاکہ مسلمانوں کی خرچ ہونے والی دولت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکے، چناں چہ اس سلسلہ میں حسب ذیل اعداد و شمار پر غور کیجیے۔ اتر پردیش میں زرعی ترقیات و آب پاشی کے سلسلہ میں حکومت کا جو کچھ خرچ ہوا اس کی تفصیل بتلاتے ہوئے کہا گیا

"آگرہ، علی گڈھ، دہرہ دون، ایٹہ، مین پوری اور متھرا اضلاع میں ڈھائی سو میل لمبی نالیاں زیرِ تعمیر ہیں۔ جن کے مکمل ہو جانے پر مزید ۵۴۹۰۰ ایکڑ آراضی سیراب ہو سکے گی۔ اس تعمیری کام پر ۲۰،۲۵ لاکھ روپیہ کی رقم صرف ہو گی (مجلہ نیا دور ص ۲۳)

اور پھر انھیں اضلاع میں دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے تحت انھیں نالیوں پر جو خرچ آئے گا اس کے متعلق بتایا گیا ہے

"... ۱۲۶۲۵۰۰ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ ایضاً

اب ایک دوسری ریاست مدھیہ پردیش کے متعلق ان اعداد و شمار کو بھی دیکھئے متعلقہ شعبہ کے وزیر نے بیان دیتے ہوئے کہا

"آب پاشی سے متعلق کام کے لئے ۱۳۵۵ لاکھ روپیہ خرچ کئے جائیں گے" (الجمعیۃ ۵۷ء)

صرف دو صوبوں کے اعداد و شمار پیش کئے گئے۔ مگر انھیں صوبوں کے محدود علاقوں میں آب پاشی کی اسکیموں پر لاکھوں اور کروروں کا خرچ آیا اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان حکمراں جو سلطنت کے وسیع اور طویل علاقوں میں رفاہیت عامہ کے تحت جو اس قسم کی کوششیں کر رہے تھے ان پر خرچ ہونے والے روپیہ کی تعداد کیا ہوگی۔ پیش کردہ معلومات کی روشنی میں مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ ان امور پر دو کرور روپیہ خرچ ہو رہے تھے، کیا غلط ہوگا۔ پھر لطف یہ ہے کہ ان مدہائے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے نہ عوام پر سینکڑوں قسم کے ٹیکس عائد تھے اور نہ جائز و ناجائز طور پر محاصل کا بار گراں ان کے سروں پر تھا۔ آج سینکڑوں قسم کے محاصل اور ہزار ہا ٹیکسوں کے باوجود جو عوام پر عائد ہیں اور جن سے حاصل ہونے والی بڑی بڑی رقمیں، حکومتوں کی خزانوں میں پہنچ رہے ہیں لیکن رفاہِ خلق کے کام اس نوعیت کے ساتھ کہیں بھی انجام نہیں دیئے جا رہے ہیں۔

لاکھوں مزدور ان فلاحی اسکیموں سے ملک کے تمام ہی افراد کو بلا امتیازِ مذہب و ملت جو فائدے پہنچ رہے تھے ان میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ لاکھوں مزدور، بے کار نہیں بلکہ باکار تھے۔ بے کاری بھی ایک ایسا جنجال ہے جو عوام و حکومت کے لئے بلاشبہ بلائے بے درماں ہے لیکن جن ممالک میں اس قسم کی ترقیاتی اسکیمیں زیرِ عمل ہیں وہاں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کو کام ملتا ہے اور خود کمانے کے مواقع میسر آتے ہیں چنانچہ یوپی میں آب پاشی کی اسکیم سے مزدوروں کی جس بڑی تعداد کو کرنے کا کام میسر آئے گا اس کا اندازہ یہ تھا

"ایک لاکھ مزدوروں کو دو سو دن سالانہ کام کرنے کا موقع ملے گا" (الجمعیۃ ۵۷ء)

ظاہر ہے کہ دنیا کے طول و عرض میں جس قسم کے رفاہِ خلق سے متعلق کام مسلمانوں نے پھیلا رکھے تھے، اس سے کتنے لاکھ بے کاروں کو روزی حاصل کرنے کے مواقع مل رہے ہوں گے اور ملک میں بے کاری کی بڑھتی ہوئی تعداد سے معاشرہ میں پیدا شدہ اختلال کا نام و نشان بھی نہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ اسلامی سلطنتوں میں اس قسم کی ابتری جس کا منشاء بے کاری ہو، نہیں پائی جاتی تھی۔

پن چکیاں | پانی کو جن دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا اس میں ایک یہ بھی تھا کہ پن چکیاں جا بجا قائم کی گئیں جس کی وجہ سے عوام کو بڑی سہولتیں حاصل ہوگئیں چناں چہ ادریسی نے دمشق کے حالات میں لکھا ہے

"شہر کے اندر ندی پر بہت سی پن چکیاں ہیں جن میں نہایت عمدہ قسم کا آٹا پستا ہے" ص ۱۲

ولایت اردن کا ایک قصبہ جرش اس کے متعلق یاقوت تفصیلی حالات بتاتا ہوا یہ بھی اطلاع دیتا ہے

"بیچ میں سے ایک ندی گذری ہے جس سے اب تک کئی پن چکیاں چلتی ہیں" ص ۶۱

یہ وہی جرش ہے جس کا ذکر متنبی کے اشعار میں ملتا ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، عرب سپہ سالار شرجیل نے اس کو فتح کیا تھا۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عام ضرورتوں کی چیزوں کو اپنے رفاہی جذبہ کے تحت مسلمان اس طرح پورا کرتے تھے اور مخلوق کو راحت و آرام پہنچانے کے لئے ان کی جدوجہد ہزار گونہ انداز میں ہوتی تھی۔

پل | ہر خیر میں شر کا پہلو اور ہر اٹھنے والے شر میں سامان خیر اس دنیا کی کچھ ایسی حقیقت ہے کہ ہر انسان کے مشاہدہ میں آئی ہوگی یہی پانی جو حیوانی زندگی کا بڑی حد تک مدار ہے جس سے صبح سے شام تک ہم ہزار ہا قسم کے فائدے اٹھاتے ہیں اور سینکڑوں طریقہ پر اس کے استعمال کی ہم کو ضرورت پڑتی ہے خداوند تعالیٰ کی بے کراں رحمتوں کا یہی خزانہ کبھی طوفانی شکل میں شہروں کو غرقاب کر دیتا ہے۔ ہلاکت خیز سیلاب کی صورت میں اٹھتا ہے تو ہزاروں اور لاکھوں انسان اس کی موجوں پر تنکوں کی طرح بہتے ہوئے اپنی زندگی کی پوری عمارت کے ساتھ گہرائیوں میں جا بیٹھتے ہیں۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں حیوانات او مویشی، مال و دولت کے انبار اس کے طوفانی تموج کی نظر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کو چھوڑیئے خود اسی ہندوستان میں ہر سال آنے والے سیلاب اپنے ساتھ تباہی و ہلاکت کے کیا سامان لاتے ہیں، ان کی تفصیلات ہر روز ہم سنتے ہی رہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے ارتقائی دور میں، جس طرح سینکڑوں نہریں کھود ڈالیں۔ ہزار ہا چشمے تیار کر دیئے، تالاب و حوض کا جال بچھا دیا، کنویں اور جھیل بنا ڈالے۔ پانی کے انہی خزانوں سے آنے

والی بربادی وتباہی کا بھی انھوں نے مقابلہ کیا، کہیں بند باندھ کر حفاظتی اقدامات کئے پشتے لگاکر محفوظ رہنے کی کوشش کی۔ پلوں کی تعمیر میں کر دڑہا کروڑ کی رقم صرف کرکے، سیلاب وطوفان سے بچنے کی موثر تدابیر کیں اور اس طرح شہروں، قریوں کو تباہی اور انسانوں کو ہلاکت سے محفوظ کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ ان حفاظتی اقدامات میں ہم سب سے پہلے ان پلوں کا ذکر کرتے ہیں جو رفاہِ خلق کے لئے مسلمانوں نے جا بجا بنوائے۔ سنجہ سنج کے قریب ایک چھوٹی سی بستی ہے تراشیدہ پتھروں سے اس کے قریب ایک پل تیار کیا گیا جس میں کمال یہ تھا کہ کمانیں بھی بنائی گئیں۔ ادریسی نے اس پل کے متعلق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ پل

"پلوں میں اعجوبہ روزگار سمجھا جاتا ہے اور بڑے پلوں میں اس کا شمار ہے پورے فرات کے عرض پر پھیلا ہوا پل ہے" ۷۷

اصطخری اور ابن حوقل دونوں اس پل کے متعلق اپنا تاثر یہ بیان کرتے ہیں کہ

"اس سے زیادہ خوب صورت پل اسلامی دنیا میں نہ ہوگا یہ عجائبات زمانہ میں داخل ہے۔"

(اصطخری ص ۷۲ ابن حوقل ص ۱۲۰)

اور سنجہ جیسا کہ انہی مورخین کا بیان ہے ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ لیکن اسی بے رونق آبادی میں دنیائے اسلام کا سب سے زیادہ حسین وخوب صورت پل کروڑوں کی رقم سے تعمیر کرکے کھڑا کر دیا گیا۔ مسلمان جس انداز میں رفاہِ خلق کے کام انجام دیتے تھے اس کے لئے ایسے مواقع کی تلاش جہاں سے رفاہیت کے ان کارناموں کی شہرت ہو اس کے منتظر اور ضرورت مند نہیں تھے۔

جسر الولید اذنہ کے راستے میں المصیصہ سے ۹ میل پر ہے ۱۲۵ھ میں

"ولید بن یزید بن عبد الملک نے تعمیر کرایا تھا۔" (فتوح البلدان جلد ۱ ص ۲۷۶)

المصیصہ میں اسی پل کے متعلق ابن حوقل ذرا تفصیل سے بتاتا ہے

"مصیصہ[۱] دراصل دو شہروں کا مجموعہ ہے ایک کا نام تو مصیصہ ہے اور دوسرے کو کفر بیا کہتے ہیں

---

[۱] مصیصہ اور کفربیا دونوں مسلمانوں کے آباد کئے ہوئے ہیں۔ عبد الملک بن مروان نے اپنے بیٹے عبد اللہ کے ہاتھوں

جیحان دریا کے دونوں کناروں پر یہ دونوں چھاؤنیاں آباد ہیں۔ دونوں کو ایک سنگین پل کے ذریعے متصل کر دیا گیا ہے دونوں کے دونوں بڑے مستحکم اور مضبوط ہیں۔ محلِ وقوع ان کا ایک بلند قطعۂ آراضی ہے، جامع مسجد میں بیٹھ کر آدمی جب سامنے سمندر کی طرف دیکھتا ہے تو قریب قریب بارہ میل تک نظر سمندر کی سطح پر پھیل جاتی ہے" (ابن حوقل ص ۱۲۲)

قنطرۃ الکوفہ، عمر بن ہبیرہ بن معیتہ الفزاری نے اپنی ولایت عراق کے زمانہ میں کوفہ کا یہ پل بنوایا پھر خالد بن عبد اللہ القسری نے اس کو درست کرایا۔

دجلہ پر پل | خالد بن عبد اللہ القسری نے ہشام بن عبد الملک سے اس پل کی اجازت طلب کی۔ ہشام نے لکھا کہ اگر یہ ممکن ہوتا تو ایرانی پہلے ہی بنا لیتے، مگر خالد نے پھر لکھا تو ہشام نے جواب دیا اگر تجھے یقین ہے کہ اس کام میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے تو بنا لے۔

"خالد نے بنوایا اور اس پر بہت خرچ کیا" (فتوح البلدان ۲۰۶)

لیکن زیادہ مدت نہ گذرنے پائی کہ بہاؤ نے پل کو توڑ دیا اور ہشام نے خالد سے تاوان لے کر چھوڑا۔ اسی طرح المنصور نے الفراۃ پر ایک نیا پل بنوایا۔ دمشق جہاں نہروں اور ندیوں کا جال بچھا ہوا ہے تمام ندیوں کی تفصیل بتانے کے بعد جی لی اسٹرینج لکھتا ہے

"ندی کی شاخیں سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس کی بڑی دھار پر ایک پل ہے جس پر سے لوگ آتے جاتے ہیں" (بلاد فلسطین و شام ص ۲۸۶)

حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بھی کثرت سے پل تیار ہوئے جیسا کہ اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

عہ ۱۸۰ھ میں مصیصہ میں ایک قلعہ بھی تعمیر کیا اور کفربیا کی ابتدا المہدی کی خلافت میں ہو چکی تھی لیکن تکمیل رشید کے دور خلافت میں ہوئی۔ یہی مصیصہ ایک تباہ کن زلزلہ میں اپنی بنیادوں پر آپڑا تھا۔ منصور نے ۱۳۹ھ میں اس کو دوبارہ آباد کرنے کا حکم دیا اور اس کی فصیل جو زلزلے سے کھیل کھیل ہو گئی تھی تیار کرا کر شہر والوں کو آباد کیا، منصور نے یہاں ایک ہزار آدمیوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ کثرت سے شہروں کو آباد کرنے میں بھی مسلمانوں نے جو دلچسپی لی اس کی داستان بھی بہت طویل ہے۔

"دریاؤں کے پل بنائے گئے" (تاریخ امت ص۱۸۲ ج۲)

ہلال بن الحسن الصابی نے اپنی کتاب تحفۃ الامراء میں معتضد کے یومیہ اخراجات کی جو تفصیل دی ہے اس میں بتایا ہے کہ

"پلوں کی تعمیر پر خرچ کا اندازہ روزانہ دس دینار ہے" (تاریخ امت ص۶۰ ج۲)

بہر حال اسلامی دور میں رفاہِ خلق کے لئے جو پلوں کی تعمیر ہوئی یہ اس کا سرسری نقشہ ہے، بلاشبہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں سینکڑوں پلوں کی تعمیر ہوئی جن کی تفصیل قصداً نہیں کی گئی، میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ رفاہیتِ عامہ کے پھیلے ہوتے کاموں کی نوعیت آپ کی سمجھ میں آجائے، اس مقصد کے لئے یہ مختصر تفصیل انشاء اللہ کافی ہوگی۔

بند مسلمانوں کی تاریخ میں، بندوں کا بھی ذکر بڑی کثرت سے ملتا ہے اور اکثر و بیشتر حکمرانوں کے تذکرے میں مورخ لکھتے ہیں کہ ان کے عہد میں زرِ کثیر صرف کر کے بند تیار کرائے گئے چناں چہ امیر معاویہ کے متعلق اطلاع دی گئی ہے

"پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جہاں پانی جمع ہوتا تھا بند بندھوائے گئے" (تاریخ امت ص۱۲۷ ج۲)

بصرہ میں بڑا بند بھی اسلامی عہد کی یادگار ہے ۱۴۲ھ میں المنصور جب بصرہ پہنچا ہے تو اس نے بڑے بند کے قریب اپنے لئے ایک محل تیار کرایا اور دوسری مرتبہ مصلیٰ بنوایا۔ اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

"بڑا بند اسلامی عہد کا تیار کردہ ہے" (فتوح البلدان ص۱ ج۲)

البطیحہ میں سلیمان نے قندل نامی مقام پر ایک بند بندھوایا تھا جس کی وجہ سے

"نہر دیر کی طرف پانی کا بہاؤ رک گیا اور ان کی نہر کا پانی تبدیل ہو گیا" (ایضاً ص۷۲)

مکہ کے وہ چار مشہور سیلاب جن کا ذکر عموماً تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے ان میں سے ایک سیلاب ام نہشل تھا یہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آیا تھا اور اس میں پانی اتنا بڑھ آیا تھا کہ مکہ کے بالائی حصہ کی طرف سے مسجد میں داخل ہو گیا تھا اس لئے

"حضرت عمرؓ نے اس کے لئے دو بند تعمیر کرائے ایک اوپر اور دوسرا نیچے، حمارین کے پاس" (فتوح البلدان ص۸۳ جلد۱)

پھر دوسرا سیلاب الجراف سنہ ۸۰ھ میں عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں آیا یہ سیلاب پیر کے دن صبح کے وقت آیا اور حاجیوں کو مع ان کے سامان کے بہا کر لے گیا اور کعبہ کو گھیر لیا عبد الملک نے عبد اللہ بن سفیان المخزومی کو جو مکہ میں ان کا عامل تھا حکم دیا

"وادی کے کنارے جو مکانات موجود ہیں ان کے اور مسجد حرام کے گرد پے گارے کے بند بندھوا دو اور کوچوں کے نکڑوں پر پشتے بندھوا دو تاکہ لوگوں کے گھر سیلاب کی تباہی سے محفوظ رہ جائیں۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۳)

گویا کہ سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لئے بند اور پشتوں کے بنانے کا انتظام مسلمان حکمرانوں کی طرف سے ہوتا ان کی تاریخ میں جس طرح بندوں کا ذکر آتا ہے اسی طرح کثرت سے اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے پشتے بنا کر، موثر حفاظتی اقدامات بھی کئے تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس قسم کے رفاہی کاموں پر کروڑہا کروڑ کی رقم صرف ہوتی تھی لیکن مسلمان رفاہ خلق کے ان تمام امور پر بڑے حوصلہ کے ساتھ خرچ کرتے تھے، ارتقائی و تمدنی دور میں مسلمانوں کے یہ کارنامے زندہ جاوید نظر آتے ہیں۔

سڑکیں | مسافروں اور راہ گیروں کے لئے مصفیٰ اور ہموار سڑکوں کا طویل جال مسلمانوں نے بچھایا بلکہ نہ صرف شستہ و رفتہ سڑکیں ہی تیار کیں، بلکہ سڑکوں کے دونوں جانب سایہ دار درختوں کو لگایا گیا تاکہ آنے جانے والے مسافر آرام و راحت کے ساتھ اپنا سفر طے کر سکیں، سڑکوں پر جا بجا ایسے عارضی مکانات تیار کرائے جن میں مسافر تھک کر اگر چاہیں تو آرام کر سکیں اور تھوڑی دیر ستا کر پھر اپنا سفر شروع کر دیں۔ بلکہ رفاہ عام سے زیادہ دلچسپی رکھنے والے بعض الوالعزم حکمرانوں نے تو کھانے پینے کی حد تک مسافروں کے لئے ضروری سہولتوں کا انتظام کیا تھا جیسا کہ تفصیلات سے معلوم ہوگا مسلمانوں نے سڑکوں کے بنانے میں ہمیشہ وسعت و کشادگی ملحوظ رکھی تاکہ تنگ سڑکوں پر سفر کرنے کی دشواری سے لوگ محفوظ رہیں، کوفہ کی آبادی کے سلسلہ میں مورخ نے جہاں دوسرے معلومات بہم پہنچائے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے

"بڑی بڑی سڑکیں چالیس ہاتھ، درمیانی تیس تیس ہاتھ، اس سے چھوٹی بیس ہاتھ اور گلیاں

ساتھ ہاتھ عرض کی رکھی گئیں" (تاریخ امت ص۱۷۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان سڑکوں کو تنگ بنانے کے بجائے آرام و راحت کے پیش نظر وسیع و کشادہ بناتے تھے کوفہ[عہ] جیسا کہ معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں آباد ہوا۔

ولید اول کے متعلق مصنف نے یہ لکھتے ہوئے کہ اس کو رفاہ عام کے کاموں سے بہت دلچسپی تھی لکھا ہے

"اس نے تمام اسلامی صوبوں میں سڑکیں نکلوائیں" (ایضاً ص۱۷۲)

اور اس کے ساتھ اسی ولید نے تمام سڑکوں پر مسافروں کی سہولت کے لئے کنویں بھی کھدوائے تھے جیسا کہ اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

"اور ان میں جہاں جہاں ضرورت دیکھی کنویں بنوائے" (ایضاً)

اسی طرح مہدی کے متعلق بھی لکھا ہے کہ اس نے

"ہر ہر منزل پر کنویں کھدوا کر ان کے متصل حوض بنوا دیے اور حکم دیا کہ یہ ہمیشہ بھرے رکھے جائیں تاکہ گذرنے والوں کو بہ آسانی پانی مل سکے" (ایضاً ص۱۸۱)

بلکہ مسلمانوں نے راہ گیروں کی سہولت کا اس درجہ لحاظ رکھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب اپنا آدمی اس علاقہ میں روانہ کیا جس کو نہر الفرات سیراب کرتی ہے تو وہاں کے باشندوں کے لئے جو حکمنامہ لکھا تھا اس میں یہ بھی درج تھا

"کھجوروں کے ایسے تمام درختوں پر جو گاؤں سے باہر ہوں اور جن کے پھل راہ گیر کھاتے ہوں یونہی رہنے دو" (فتوح البلدان ص۲۶۸)

سڑکوں کی درستگی بہر حال مسلمانوں نے سڑکیں بھی بنوائیں اور اپنی ان تمام سہولتوں کا بھی اہتمام

عہ اسی کوفہ میں دو سو گز لمبا سائبان بھی بنایا گیا تھا جس میں سنگ سرخ کے ستون ایوانِ کسریٰ سے لاکر لگائے گئے تھے باوجودیکہ ان ستونوں کا کوئی وارث نہیں تھا پھر بھی عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی قیمت ایرانیوں کے جزیہ میں مجرا کردی تھی "مسلمانوں کی یہی صفائی معاملات اور احتیاط پسندی' سیکڑوں لوگوں کو خود بخود اسلام کی طرف متوجہ کر دیتی تھی"

کیا جو عام طور پر راہ گیروں کے لئے مطلوب ہوتی ہیں کچھ تفصیلات اس سلسلہ کی ہم نے پیش کیں اور کچھ اور پیش کی جائیں گی۔ جس طرح مسلمان سڑکیں نکلواتے تھے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اسی طرح ان کی درستگی کا بھی بے حد خیال رکھا جاتا تھا چنانچہ اسی ولید اول نے جس کے رفاہِ عام کے کچھ کارنامے ابھی گذرے اس کی تاریخ میں یہ بھی مورخ لکھتا ہے

"تخت نشینی کے تیسرے سال یعنی ۸۸ھ میں تمام ممالک محروسہ میں سڑکیں درست کرائیں اور ان پر میل نصب کرائے۔" (تاریخ اسلام ج۲ ص۱۸۱)

مہدی کا مورخ رقمطراز ہے

"قادسیہ سے زبالہ تک سفاح کے زمانہ میں جو راستہ بنوایا گیا تھا وہ خراب ہو گیا تھا اس کو درست کرایا اور اس میں جو سرائیں تھیں ان کی مرمت کرائی۔" (تاریخ امت جلد ۴ ص ۸۰)

ولید جس کے رفاہِ عام سے متعلق دلچسپی کی شہادت مورخین باتفاق دیتے چلے آئے ہیں اس نے تو نہ صرف یہ ہے کہ عام سڑکوں کو درست کرایا بلکہ پہاڑوں کے دشوار گذار راستوں تک کی ہمواری اور درستگی کا اس کو اہتمام تھا چنانچہ اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا گیا ہے

"اسی سال ولید نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور دوسرے عمّال کو لکھا کہ پہاڑوں کے دشوار گذار راستے درست اور ہموار کئے جائیں۔" (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۱۰)

بہرحال تاریخ کے طول وطویل دفاتر سے یہ چند مثالیں پیش کر دی گئی ہیں تاکہ کم از کم قارئین کو اتنا معلوم ہو جائے کہ سڑکوں کی درستگی اور ان کی ہمواری کا مسلمانوں کو کس درجہ اہتمام تھا۔ پیش کی ہوئی ان چند مثالوں سے یہ سمجھ لینا کہ بس رفاہِ عام کے اس شعبہ میں مسلمانوں کے یہ دو چار ہی کارنامے ہیں قطعاً غلط ہوگا۔ مضمون نگار بھی اگر چاہتا تو اس تخیل کی ناہمواری پر تاریخ سے بہت سی شہادتیں پیش کر دیتا۔ لیکن اس مضمون میں اختصار کا جو پہلو مطلوب ہے اس کی وجہ سے مزید مثالوں کے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

(باقی آئندہ)

خطبۂ صدارت یوم رسوا

از

(جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی دہلی)

(جو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے صدر کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس خصوصی جلسہ میں پڑھا جو ۸ مارچ ۱۹۵۸ء کو مرزا ہادی رسوا لکھنوی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا۔)

خواتین وحضرات!

میں جامعہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے محترم کارکنوں کی خدمت میں رسوا کی یاد منانے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نیز آپ کی اس محبت کا بھی شکر گزار ہوں جو آپ نے اس کی صدارت میرے سپرد کر کے فرمائی ہے۔

میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے یوم رسوا کے لئے کوئی مقالہ نہیں لکھ سکا تھا میرے عزیز دوست ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب کا برابر اصرار رہا اور وہ بڑھتا ہی رہا بالآخر انھوں نے کہا کہ اگر آپ نے مقالہ نہیں لکھا تو آپ کو اس جلسہ کی صدارت کرنا پڑے گی۔

میں اس وقت اسی جرم کی پاداش میں آپ کے سامنے حاضر ہوں!

میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے میری "رسوائی" کا پورا سامان بہم پہنچایا ہے۔ ایک ایسی محفل میں جہاں ایسے لوگ موجود ہوں جنہوں نے خاص طور پر مرزا رسوا کا مطالعہ کیا ہے مجھ جیسے کم مایہ کا لب کشائی کرنا رسوائی سے کم نہیں۔ واقعی ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے مجرم ہوں لیکن اس دعوت میں ان کی کتنی محبت پوشیدہ ہے، خلوص کا کتنا بڑا جذبہ شامل ہے اس کو میرا دل جانتا ہے۔

حضرات! آپ کی انجمن کی یادا مجھے بہت پسند آئی کہ وہ ہر سال اردو کے ایسے مشاہیر کی یاد تازہ کرتی ہے جن کا ادب میں ایک بڑا مقام تو ہے یا ہونا چاہئے لیکن ان کے متعلق عام معلومات زیادہ نہیں۔ اس سے پہلے یہ انجمن یوم نظیر، یوم سرشار، یوم مومن منا چکی ہے اور وہ جلسے بہت کامیاب ہو چکے ہیں۔

آپ نے یہ دن مناکر بہت اہم اور ضروری قدم اٹھایا ہے۔ آج اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو ان ہی سینہ کے داغوں سے "بہار" پیدا کرنے کی ــ یہ بات میں نے پہلے کہی ہے لیکن اس کے اعادے کی ضرورت ہے کہ اردو صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی کی صرف ایک صورت ہے کہ اس کی تاریخ ہر اردو داں کے دل اور دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو اور اس کی ادبی شخصیتوں کے کارنامے لوح دل پر کھدے ہوئے ہوں۔ وہ خود اس ورثے سے بہرہ یاب ہو اور اس کی نیکیاں اور اچھائیاں اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کردے۔

یوم سرشار اور یوم رسوا کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ آج نئی آب و ہوا نے ہمارے سامنے عجیب وغریب تہذیبی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ہم ہر چیز کو بازار کی ترازو میں تولتے ہیں اور جدھر پلہ جھکتا ہے خود بھی ادھر جھک جاتے ہیں۔ ہم اردو سے اس لئے بے تعلق ہوتے جاتے ہیں کہ اس سے ہمیں روٹی نہیں ملتی۔ نوکری کے حصول میں آسانی نہیں ہوتی۔ یہ "نقد سودے کا اصول" بے حد خطرناک ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کے وہ اعلیٰ مقاصد نہیں جو اسے بامقاصد اور بامعنی بنا دیتے ہیں اور جس طرح میں نے ایک دفعہ ایک جلسہ میں کہا تھا۔ ہم زبان و ادب کی تنویری قوت سے بے خبر ہیں اور کل زندگی میں اس کا جو مقام ہے اس کے شناسا نہیں۔ بے روزگاری کی بات اہم اور بہت اہم ہے لیکن یہ بات دراصل اتنی آسان بھی نہیں جتنی ہم نے سمجھ رکھی ہے۔ یہ مسئلہ کسی مضمون کے پڑھنے یا نہ پڑھنے سے طے نہیں ہو سکتا۔ یہ اس سے کہیں بڑا معاملہ ہے۔ اس کا انحصار ایک یا دو پلاتوں پر بھی نہیں، یہ سارے ملک کی معاشی تنظیم کا مسئلہ ہے۔ پیداوار اور دولت کی مناسب تنظیم اور بہتر تقسیم کا مسئلہ ہے۔ جو لوگ اردو سے اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے انگریزی زبان و ادب کے ایک استاد یاد آجاتے ہیں جنھوں نے اپنی ہندوستانی بیوی کو محض اس جرم میں طلاق دے دی تھی کہ وہ ملٹن نہیں سمجھتی تھی!

اس موقع پر ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارا ادب ابھی تک خواص کی ملکیت رہا ہے۔ وہ ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس کا ذوق بھی ایک خاص احاطہ میں محدود ہے۔ ملک میں جو جمہوری نظام قائم ہوا ہے اور سلطانی جمہور کی جو اساس رکھی گئی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے

کہ ہم ان نیکیوں کو جو ہمارے اچھے ادب سے متعلق ہیں عام کر دیں۔ اس خیر و برکت کو جو صالح لٹریچر میں چھپی ہوئی ہے سب تک پہنچا دیں، ایک مرتبہ آپ نے یہ کام صحیح اصول کے ساتھ دہلی میں کیا تھا اور "آگرہ بازار" اسٹیج کر کے فکر و نظر کی عام دعوت دی تھی۔ اس کے نغمے مہینوں تک فضا میں گونجتے رہے۔ یاد ہے آپ کو؟ یقین کیجئے کہ لوگ اس روحانی غذا کے لئے بے چین ہیں اور اس کی ضرورت نئے ہندوستان کی ترقی کے ساتھ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ غزل کی شاعری دکل شناس اور ہمہ داں ہوتی ہے اور چونکہ انسان میں خدا کی سی کلیت ہے اس لئے غزل کے ذریعہ کائنات کی ہم آہنگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے یہ! لیکن ہم نے اس کے ثابت کرنے کے لئے کیا کیا ہے؟ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، حالیؔ، میرامنؔ اور رسواؔ پر ہم جان دیتے ہیں لیکن ابھی تک ہم نے ادب کے اس آئینہ خانہ میں جو زندگی کے جلوے یا اعلیٰ قدریں ہیں ان کو عام نہیں کیا۔ پھیلایا نہیں۔ شکسپیئر آج بچوں کا بھی ہے، بوڑھوں کا بھی، کارخانہ کے مزدوروں کا بھی اور اہلِ علم کا بھی۔ انگلستان کا بھی، جرمنی اور روس کا بھی۔ ہمیں بھی اپنی بلند پایہ شخصیتوں کو اور ان کی تخلیقات کو ہر طبقہ تک مختلف فنی طریقوں سے پہنچانا چاہئے اور اس فرض کو پورے خلوص اور محنت سے انجام دینا چاہئے۔

خواتین و حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ نے یہ جلسہ منعقد کر کے کام کی ایک صحیح سمت متعین کی ہے لیکن یہ کام بڑی ریاضت چاہتا ہے رسواؔ کی زندگی کے کتنے گوشے ہیں جو تاریکی میں ہیں۔ ان کے بعض ناول، ان کے پس منظر، ان کی شاعری، سب بڑی حد تک پردۂ خفا میں ہیں رشید نعمانی صاحب نے حیات اور سیرت کے بعض گوشوں پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے لیکن کام کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے وسیع پیمانے پر کیا جائے۔ ہم نے تنقید پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کا تحقیق سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ہمیں اس تعلق کو بھی برقرار رکھنا چاہئے۔

ہمارا تمام قدیم ادب ادبیاتِ عالیہ میں ممتاز مقام کا مستحق نہیں ہے۔ اس میں مغز کم اور پیاز کے چھلکے زیادہ ہیں لیکن پھر بھی اس کے ایک حصہ میں انسانیت کی جذباتی قدریں پوشیدہ ہیں اس کے علاوہ بھی اس میں بہت کچھ موجود ہے جس کی جھلک اگر ہمیں موجودہ اردو

لٹریچر میں نظر آجائے تو وہ غالب کا تیر نیم کش بن سکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کے سامنے یہ جذبہ ہے آپ ماضی کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا چاہتے ہیں اور اس کے اچھے عناصر کو نئی زندگی کے سوز و ساز میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ آپ نے اس کام کے لئے رسوا کا انتخاب کیا جو اردو کے ناول نگاروں میں ایک بڑی دل نواز اور متوازن شخصیت ہے۔

ان کا یہ توازن بعض اوقات عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ بالکل دو اور دو چار کا کم سے کم "شریف زادہ" میں تو یہی ہے۔ مرزا عابد حسین کا کردار ایک سیدھی لکیر ہے۔ اس میں کوئی دائرہ کوئی زیر و بم، کوئی پیچ و خم نہیں۔ اس لئے اس میں زندگی کم اور بہت کم ہے لیکن امراؤ جان ادا ان ہی کے نہیں، اردو ادب کے بے مثل ناولوں میں سے ہے۔ اس میں بڑی زندگی ہے، اگرچہ خود امراؤ جان ادا باوجود نہایت اہم ہونے کے ایک معنی میں ذیلی حیثیت رکھتی ہے لیکن وہ اور اس کے ساتھ کردوسرے کردار خورشید، بسم اللہ خانم، ابو حسینی راشد، فیضو، سلطان، مولوی صاحب وغیرہ سب ہی ایک مٹتی ہوئی تہذیب کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور ہمیں ایک خاص سماج کے مختلف طبقوں سے واقف کراتے ہیں۔ ان سب کا حاصلِ ضرب امراؤ جان ایک طوائف نہیں بلکہ ان کا حاصلِ ضرب لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب ہے جس میں شعر و شراب و شباب کی رنگینیاں اور رقص و سرود کی محفلیں ایک خاص مقام رکھتی ہیں لیکن رسوا کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اس تہذیب پر بڑی غیر جانب دارانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو دکھلایا ہے۔ جہاں معاملہ محبت یا جذباتی لگاؤ کا ہو وہاں یہ بالغ نظری مشکل ہے۔ لیکن رسوا نے امراؤ جان ادا میں بتلایا ہے کہ یہ دور محض رات اور زلف کی کہانی نہیں ہے۔ اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں عزت اور وضع داری کی حیرت انگیز مثالیں مل جاتی ہیں۔ مرزا سلطان اس کا بہت عمدہ نمونہ ہیں۔

مرزا رسوا نے ایک مخصوص انداز میں خارجی حقیقتوں کو سمو لیا ہے اور اودھ کے ذہن اور زمانہ کو اس طرح ناول کے پیرایہ میں پیش کیا ہے کہ اس کی دوسری نظیر ہمارے ادب میں نہیں۔

پولنسکو نے بجا طور پر اس کو ترجمہ کے لئے انتخاب کیا ہے۔

امراؤ جان ادا میں سماجی اور اقتصادی تضاد اور فرد اور معاشرہ کے عدم توازن کے متعلق ایسے بلیغ اشارے اور معاشرتی زندگی کے متعلق اتنا کار آمد اور اہم مواد ملتا ہے جو اس عہد کی تاریخوں میں نہیں اور اس لئے ہمارے تخیلی کلچر میں اس ناول کی ایک مستقل جگہ ہے اس اعتبار سے میں رسوا کو محض ناول نگار نہیں ایک قسم کا مورخ بھی سمجھتا ہوں۔ میں مقابلہ نہیں کرتا بلا تشبیہ کہتا ہوں کہ رابن سن کروسو کو اس سے قبل یہ شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اٹھارویں صدی میں پولٹیکل اکانومی کے لکچروں میں اس قصہ کے حوالے دئے گئے اور اسٹوارٹ مل کی تصانیف میں اس کی گونج سنائی دی اور اس طرح ڈکنس اور تھیکرے کے ناول بھی اس عہد کے متعلق وہ مواد بہم پہنچاتے ہیں جن سے رسمی تاریخوں کا دامن خالی ہے۔

امراؤ جان ادا کے متعلق آپ نے رشید نعمانی صاحب کا مقالہ سنا جو رسوا کے عہد اور ان کی زندگی کے متعلق ایک فریم ورک کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے بہت مفید ہے۔ بیگم رضیہ سجاد ظہیر نے امراؤ جان ادا کو اپنی مسیحا نفسی سے زندہ کر دیا ہے ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا!

تخیل اور زبان کا یہ اعجاز معمولی نہیں کہ ماضی اور حال کا فرق مٹ جائے اور بالکل یہ معلوم ہو کہ امراؤ جان ادا ایک دفعہ پھر اس خاک دان ارضی میں آگئی ہے اور ہم اس کے روبرو ہیں۔ بیگم انیس قدوائی کا مقالہ بھی بصیرت و مسرت کے بہت سے پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے لئے ایک نئی راہ نکال لیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح ان تقریروں سے میں مستفید اور محظوظ ہوا ایسے ہی آپ بھی ہوئے۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے خیالات سے استفادہ کا موقع دیا اور اس بزم میں شریک ہو کر اسے کامیاب اور بارونق بنایا۔ آخر میں میں آپ کی تشریف آوری کا، انجمن کا، اس کے انتظامات کا اور اس قدر افزائی کا جو اس نے مجھے مسند صدارت دے کر فرمائی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ادبیات

غبارِ خاطر

یعنی نوحۂ جانکاہ انتقالِ پرملال امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رح

(از جناب پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی)

آزاد محمود اللساں   شیریں سخن شیریں زباں

تحریر میں پرکاریاں   تقریر میں گل باریاں

افکار میں گل کاریاں   الفاظ میں چنگاریاں

وہ رہبرِ ہندوستاں   ہندوستاں کا باغباں

تنظیم کا مردِ جواں   تدبیر کا پیرِ مغاں

علم و عمل کا بوستاں   اور عزم کا کوہِ گراں

تہذیبِ نستعلیق کا   واحد امینِ بے گماں

کوئی کہاں سے لائے گا   آزاد کی طرزِ بیاں

رحمت کا ایک ابرِ کرم   نوکِ قلم میں بجلیاں

ہر لفظ میں تھا خونِ دل   ہر حرف میں تھی صوتِ جاں

دنیا سے مٹ سکتی نہیں   اس کی زباں میری فغاں

علامۂ دینِ مبیں   تلقین کی روح و رواں

عظمت کا لافانی پہاڑ   توقیر کا وہ نورِ جاں

تھی متجلی جس سے زمیں   تھا مفتخر جس سے زماں

تاریخ کا جس سے وقار   روشن تھے جس سے جسم و جاں

وہ مشترک تہذیب کا ضامن زمانہ میں کلاں
ایک مہرِ استقلال تھا گاہے نہاں گاہے عیاں
تدبیر میں روح الامیں تقدیر میں نوشیرواں
تقدیم اور تجدید میں ایک امتزاجِ گل فشاں
تقدیس میں گنگا کا جل تسنیم کی موجِ رواں
توقیر میں زمزم صفت کوثر کا آبِ زر فشاں
دل میں عجب دریا دلی وسعت میں بحرِ بیکراں
اک آگ سینے میں دبی اک کوہ تھا آتش فشاں
الفاظ میں گر تیر تھے ابرو کے ہر خم میں کماں
تھی بزمِ دشمن کے لئے نوکِ زباں نوکِ سناں
اس کل صفت موصوف کے اوصاف کا ہو کیا بیاں
آٹھ آٹھ آنسو روئے گا دن رات اب ہندوستاں
ہر روز تو آتی نہیں دنیا میں ایسی ہستیاں
حاصل تھیں اس کو فطرتی مے نوشیاں سرشاریاں
اب ختم مے خانے سے ہیں سرمست بادہ خواریاں
اب ختم افسانے ہوئے بدلیں وفا کی سرخیاں
اس حق نما سردار پر قربان تھیں سرداریاں
جب تک رہا دل میں رہا ہو کر وہ سترِ دلبراں
واقفِ کلام اللہ بھی جانِ حدیثِ دیگراں
توحید کا پیغامبر ویدانت کی روحِ رواں
ثانیٔ ابنِ تیمیہؒ وہ یادگارِ عارفاں

تھا دل براہیمی مگر — معقول فن آذراں
بت خانہ میں دیتا رہا — روح بلالی سے اذاں
حسنِ ازل کا معتقد — جلوہ گر زلفِ بتاں
القصہ روحِ قافلہ — فی الجملہ میرِ کارواں
آخر ہوئے آزاد بھی — خلد آشیاں جنت مکاں
اس فردِ بے تمثیل کو — کیوں آئی مرگِ ناگہاں
رنجور ہے مہجور ہے — نہرو کا دل نہرو کی جاں
کچھ مسئلے در پیش ہیں — حل ڈھونڈنے جائیں کہاں
مجبور ہے معذور ہے — روح الامیں روح الاماں
قدرت کا یہ قانون ہے — لاچار ہے سارا جہاں
آزاد مجبوراً ہوئے — سوئے عدم آخر رواں
حسنِ عمل کے فیض سے — پائی حیاتِ جاوداں
قدرت کی دارو گیریاں — محسوس ہوتی ہیں یہاں
معلوم ہوتی ہیں یہیں — انساں کی مجبوریاں
غمناک ہیں نمناک ہیں — افلاک پر کرّوبیاں
اُف کون اب سلجھائے گا — پیچیدہ قومی گتھیاں
تاریک تر ہوتے چلے — جمہور کے اجمل نشاں
بکھرے ہوئے احساس کی — دیکھے کوئی گر جھلکیاں
شفاف شیشے کی طرح — وہ پیرِ صد شیشہ گراں
جس نے اُجاگر کر دیا — فطنت کا ہر سرِّ نہاں
قرباں ہو جس پر یقیں — ایسا تھا کچھ اس کا گماں

تقدیر شاہوں کی صفت | شانِ وجاہت الاماں
بے مثل جاہ و تمکنت | بے مثل وضع داریاں
بے مثل اس کا بانکپن | بے مثل تھیں خودداریاں
المختصر قول و عمل | تھا برتر از سود و زیاں
تھا قوم کی جاگیر ہی | اک مرغزارِ بے خزاں
صد حیف رخصت ہوگئی | جانِ بہارِ بوستاں
اب گم ہے نہرو کے لئے | تسکینِ دل آرامِ جاں
ہر شخص کو ہے جستجو | ڈھونڈیں مگر اس کو کہاں
اب اور تو چارہ نہیں | پھر کیوں ہوں آہ و زاریاں
اپنے عمل میں ڈھونڈیئے | آزاد کی شہ کاریاں
کیا تھیں وطن کے واسطے | خدمات اور قربانیاں
اہلِ وطن کچھ یاد ہے | گاندھی سے پہلے کا سماں
تھیں سرد مہری کے سبب | ٹھنڈی وطن کی گرمیاں
آزاد کی آواز نے | گرمائیں طاری سردیاں
وہ اذیں آوازِ حق | برسائیں جس نے بجلیاں
وہ ذکر و فکرِ الہلال | اللہ اکبر کی اذاں
سوتی ہوئی اس قوم میں | پھونکیں نئی بیداریاں
چرخِ صحافت کا ہلال | ہو جس پہ نیّر کا گماں
فرمایا شیخ الہندؒ نے | ہم کو جگایا بے گماں
اس فرد کی للکار سے | جاگے سبھی پیر و جواں
بے بس اجل کو کردیا | خود ہو کے علمائے زماں

اب قوم میں مفقود ہیں　　وہ تیزیاں طراریاں

حق بات کہتا ہی رہا　　حائل تھیں گو دشواریاں

آزاد لکھتا ہی رہا　　لگتی رہیں پابندیاں

وہ کام کرتا ہی رہا　　ہوتی رہیں سرگوشیاں

اس فطرتاً آزاد کی　　قسمت ہوئیں محصوریاں

اس پر بھی تو یہ کلفتیں　　اور اہلِ شر کی گالیاں

اپنوں کے طعنے الحذر　　غیروں کے شکوے الاماں

پھر بھی سجاتا ہی رہا　　تہذیب کی الماریاں

اس کج کلاہِ قوم سے　　کج بحثیاں کم فہمیاں

اے قبلۂ کعبہ نما　　یہ داستاں ہے خونچکاں

جب استواری میں اڑیں　　ہر کارکن کی دھجیاں

ہر شخص کے افسانے کی　　کچھ اور ہیں غمازیاں

پختہ تریں افراد کی　　ناگفتنی ہیں خامیاں

عریاں ہیں اس حمام میں　　مرد و زن و پیر و جواں

اک فردِ واحد تھا یہی　　جلباب پوش درمیاں

بے داغ جس کی زندگی　　بے عیب جس کی داستاں

فرقہ پرستی کا عدو　　جوشِ جنوں کا پاسباں

اس حلم اور ایثار کی　　تمثیل دنیا میں کہاں

قربان اس رفتار کے　　میں ہی نہیں کون و مکاں

گو مرگ نے کیں منکشف　　مختار کی مجبوریاں

دیکھیں غلامی نے مگر　　مجبور کی مختاریاں

مدفون اس کے ساتھ ہیں — حق گوئیاں بے باکیاں
اے مردِ مومن السلام — اے ہندوؤں کے ترجماں
سکھوں کا تو ہمدرد تھا — تھا محسنِ نصرانیاں
بدھوں کے دل کی روشنی — تھا جینیوں کا پاسباں
اے خاکِ بطحا کے امیں — اے افتخارِ ہندیاں
پرکار قندِ پارسی — اے غیرتِ ایرانیاں
گفتارِ حافظؒ کے معیں — اے سعدیؒ ہندوستاں
الفاظ ہیں مصری ترے — گفتار میں شیرینیاں
ہر قول میں سوزِ یقیں — کردار میں تابانیاں
شامی بھی تھے رومی بھی تھے — قائل ترے یونانیاں
کوئی عجم ہو یا عرب — قائل تھے تجھ پر بے گماں
اے گوتم و گاندھی کے دل — اے رہنمائے رہبراں
اے طوطیٔ افریشیا — اے بلبلِ ہندوستاں
میت تری دولہا بنی — ہمرہ براتِ عاشقاں
یہ ہے میرے دل کی صدا — با نالہ و آہ و فغاں
جذبات میں منہ بولتی — بربادیاں ناکامیاں
اک آگ ہے نالہ نہیں — چھیڑو نہ سازِ دلچکاں
کس کو دکھائیں زخمِ دل — دل پر جراحت کے نشاں
نوحہ ترا تاریخ ہے — جس کے ورق ہیں خوں فشاں
مخصوص دستاویز ہے — جد و جہد کی داستاں
ہر دور میں ہر عہد میں — آزادؔ تھے رطب اللساں
یکساں تھیں اس کے واسطے — ہر پھول کی رنگینیاں

ہر وقت تھیں پیشِ نظر کل قوم کی بہبودیاں
لے دے کے سنتا تھا وہی فریادِ قلبِ بے کساں
اس کی تمنا تھی یہی پھولے پھلے ہندوستاں
گل زار ہیں باقی رہیں سرسبزیاں شادابیاں
اے کاش ہندوستاں رہے بالانشیں بالا نشاں
گل زار کی ہے یہ دعا آزادؔ ہوں جنت مکاں
اور اُن کے قول و فکر کی تقلید ہو ہم ہیں رواں
روشن ہمیشہ کے لئے ہیں اُن کے قدموں کے نشاں
دے ہم کو توفیقِ عمل وہ خالقِ ہر دو جہاں
اک بات کہنی اور ہے حائل ہیں گو دشواریاں
یہ جانتا ہوں خیر سے حق بات میں ہیں تلخیاں
در اصل ہے یہ مرثیہ تصویرِ جذباتِ نہاں
تھا مرنے والے کا یہی اعلانِ آخر دوستاں
تھی یہ وصیت آخری پھولے پھلے اُردو زباں
سنتے ہو اس کے پیروو! غیرت تمھاری ہے کہاں
یہ ٹھان لو اُردو پہ تم کر دو گے صدقہ اپنی جاں
اہلِ وطن سمجھو مرا سوزِ دروں دردِ نہاں
کس درجہ معنی خیز ہے گل زار کی آہ و فغاں
ہو جائے یہ پیارا وطن ہندوستاں جنت نشاں
اک یادگارِ دل نشیں
آزادؔ کی شایانِ شاں

تبصرے

رسالوں کے خاص نمبر اور نئے رسالے

نقوش کا مکاتیب نمبر جلد اول و دوم مرتبہ جناب محمد طفیل صاحب تقطیع کلاں ضخامت ایک ہزار چالیس صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت عہ روپیہ پتہ: ادارۂ فروغ اردو انارکلی لاہور۔

نقوش لاہور کا ادبی مجلہ ہے جو اپنے خاص نمبروں کے لئے بڑا مشہور ہے اب تک اُس کے چار خاص نمبر نکل چکے ہیں جو اردو زبان و ادب کے حلقوں میں بہت مقبول ہوئے اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں اب اس کا پانچواں نمبر جو دو جلدوں میں ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے مکاتیب نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ تقریباً اردو کے ڈیڑھ سو اکابر علم و ادب جن میں سے اکثر مرحوم ہو چکے ہیں ان کے غیر مطبوعہ خطوط پر مشتمل ہے۔ سلسلہ مرزا غالب سے شروع ہوتا ہے اور مہدی بیگم پر ختم ہوتا ہے۔ شروع میں خطوط۔ خط نگاری۔ اور خط نگاروں کے متعلق اور آخر میں مشاہیر ادب کے زیر عنوان خط نگاروں کے مختصر سوانح حیات پر غلام رسول مہر۔ سید محمد عبداللہ۔ مالک رام اور محمد عبداللہ قریشی کے اہم و مفید مقالات ہیں ان کے علاوہ چند خطوط مشاہیر حال کے بھی ہیں۔ خطوط کے علاوہ غالب۔ سر سید ان کے رفقا۔ شبلی۔ حالی۔ آزاد۔ محمد علی وغیرہم اکابر کے فوٹو اور ان کی تحریروں کے عکس بھی اس میں شامل ہیں اس طرح کارکنان نقوش لائق مبارکباد ہیں کہ اُن کی جدوجہد اور محنت و کاوش سے ایک اہم ادبی اور تاریخی دستاویز مرتب ہو گئی جس سے تاریخ ادب اردو کے محققین فائدہ اُٹھائیں گے۔ امید ہے کہ گذشتہ نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی سرمۂ نظر ارباب ذوق ہوگا۔

شاہراہ ناولٹ نمبر جلد اول مرتبہ جناب محمد یوسف صاحب جامعی تقطیع کلاں ضخامت ۶۲۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت سات روپیہ پتہ: اردو بازار دہلی نمبر ۶

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ خاص نمبر مختلف ناولچوں پر مشتمل ہے اور یہ سب طبعزاد

نہیں بلکہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے مشہور ادیبوں اور ناول نگاروں کے تراجم ہیں ملکی زبانوں میں ہندی۔ مرہٹی۔ بنگالی۔ پنجابی۔ سندھی۔ تامل اور گجراتی زبانیں شامل ہیں، کسی زبان کے ادب میں وسعت اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ اس کے بولنے والوں کو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے لٹریچر سے باخبر کیا جائے اس حیثیت سے جامعی صاحب کی یہ کوشش بڑی مستحسن اور لائقِ داد ہے۔ اردو کی ناول نگاری کے لئے موجودہ دور دورِ جمود و تعطل ہے۔ امید ہے کہ شاہراہ کا یہ خاص نمبر اس جمود کے توڑنے میں ممد و معاون ثابت ہو گا۔ چند ایک کو چھوڑ کر جتنے ناولٹ اس مجموعہ میں شامل ہیں اُن کو فن کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر تراجم اس قدر شگفتہ، رواں اور سلیس ہیں کہ اگر کیرکٹر مقامی ہوں تو کوئی شخص ان کو ترجمہ سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہ خاص نمبر اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے تاکہ دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ناول نگاری کے موجودہ رجحانات اور اُس کی ٹکنک سے واقفیت ہو۔

الحرم حضرت مدنی نمبر تقطیع متوسط ضخامت ۱۲۴ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ پتہ :۔ مکتبۂ علمیہ قاضی واڑہ میرٹھ۔

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی ادارت میں یہ ماہنامہ کئی سال سے نکل رہا ہے جس میں صاف اور شستہ زبان میں دینی اور اصلاحی مضامین ہوتے ہیں اس رسالہ کا جنوری اور فروری کا نمبر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی یادگار میں شائع ہوا ہے، اس خاص نمبر میں مختصر مختصر مقالات ہیں مگر جامع اور مفید ہیں اور اُن سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بڑی بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے مضامین کی ترتیب کتاب جیسی ہے اس طرح یہ صرف ایک خاص نمبر نہیں بلکہ حضرت شیخ کی ایک مختصر سوانح عمری ہے، مقالات کے علاوہ چند نظمیں اور حضرت کے بعض مکاتیب بھی ہیں، متوسلین حضرت شیخ کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

آج کل جنگ آزادی نمبر تقطیع کلاں ضخامت ۱۳۲ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ

قیمت عہ، پتہ :- پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی۔

۱۹۵۷ء میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ برسی جگہ جگہ منائی گئی تھی اسی تقریب سے دلی کے مشہور سرکاری اردو ماہنامہ آج کل نے بھی یہ خاص نمبر شایع کیا تھا اس میں جنگ آزادی سے متعلق بعض بڑے مفید مضامین ہیں، خاص طور پر "۱۸۵۷ء میں دلی کا کورٹ ڈمنسٹریشن" ۱۸۵۷ء کی کہانی بڑے بوڑھوں کی زبانی، ۱۸۵۷ء میں لکھنئو پر کیا گذری! "متفرقات" ایک اہم دستاویز، بہت مفید اور معلومات آفریں ہیں۔ مقالات کے علاوہ اس جنگ کے نامور زعما اور کانگرس کے لیڈروں کے فوٹو بھی ہیں۔ شروع میں مولانا ابوالکلام نے ڈاکٹر سینی کی کتاب پر جو پیش لفظ لکھا تھا اُس کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ لیکن یہ خلاصہ بہت تشنہ ہے اور مولانا کی اصل تحریر کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں۔ بہتر یہ تھا کہ اس کا مکمل ترجمہ دیا جاتا۔ نمبر موضوع کے اعتبار سے اگرچہ مختصر ہے مگر پھر بھی لائق مطالعہ ہے آغا حیدر حسن اور قاضی عبدالودود کے مضامین میں جو معلومات ہیں وہ شاید کہیں اور نہ ملیں۔

دورِ جدید اُردو نمبر | مرتبہ حافظ علی بہادر خاں تقطیع کلاں ضخامت ۱۶۷ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ

دورِ جدید دلی کا ہفت روزہ پرچہ ہے اگست ۵۸ء میں انجمن ترقی اُردو کی تحریک پر پورے ملک میں جو یوم اردو منایا گیا تھا یہ خاص نمبر اسی کی تقریب میں شائع کیا گیا ہے اس میں اردو زبان سے متعلق اکابرِ ملک کے نثر و نظم کے مضامین اور پیغامات ہیں اور مشاہیرِ ماضی و حال کے فوٹو بھی ہیں۔ مقالات بھی دراصل پیغامات کی حیثیت رکھتے ہیں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اُردو کی عام ادبی۔ لسانی اور تاریخی و قومی حیثیت کے مختلف پہلو بیک نظر سامنے آجاتے ہیں اور اُس سے اردو کی عظمت کا نقش دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے، اس حیثیت سے ہر اُردو دوست کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

سہ ماہی صحیفہ | مرتبہ جناب سید عابد علی عابد و سید سجاد رضوی صاحب۔ تقطیع کلاں۔

کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر ضخامت ۲۸۰ صفحات سالانہ قیمت ۱۲ روپیہ اور فی شمارہ سے تین روپیہ پتہ :- مجلس ترقی ادب نرسنگداس گارڈنز - کلب روڈ - لاہور -

" لاہور میں مجلس ترقی ادب " صحت مند اور تعمیری ادب کی ترقی و ترویج کے لئے قایم ہوئی ہے صحیفہ اُسی کا بلند پایہ اور معیاری سہ ماہی رسالہ ہے - اس میں ادبی - تحقیقی اور مزاحیہ مقالات و مضامین کے علاوہ غزلیں نظمیں ، افسانے - ڈرامے بھی ہوتے ہیں اور اُن سب کا ایک خاص معیار ہوتا ہے - ترقی پسند ادب کے بعض غلط قسم کے نمائندوں نے جو گمراہی پیدا کر دی تھی - اگر صحیفہ اُس کی اصلاح کر سکا تو بڑا کام ہوگا - ایک زمانہ میں علی گڈھ سے سہ ماہی سہیل نکلتا تھا صحیفہ اُس کا ہی مثنیٰ معلوم ہوتا ہے امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے -

کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست | از جناب سید نصیر الدین صاحب ہاشمی تقطیع کلاں - ضخامت ۴۴۳ صفحات کتابت و طباعت بہتر ، قیمت مجلد بارہ روپیہ پتہ :- دفتر اسٹیٹ کمیٹی نواب سالار جنگ مرحوم - دیوان ڈیوڑھی حیدر آباد دکن -

نواب سالار جنگ مرحوم حیدر آباد کی بہت ممتاز اور نمایاں شخصیت تھے مرحوم کا علمی ذوق بڑا پاکیزہ تھا، قلمی کتابوں اور نوادر اشیا کے جمع کرنے کا بڑا شوق رکھتے تھے اُن چیزوں کی وجہ سے ۱۹۴۹ء میں اُن کی وفات کے بعد اُن کا پورا محل ہی سالار جنگ میوزیم بنا دیا گیا ہے - مرحوم کے کتب خانہ میں عربی ، فارسی اور انگریزی اور اردو کتابوں کا بڑا وسیع اور اہم ذخیرہ تھا اس ذخیرہ میں جو اُردو کی قلمی کتابیں تھیں اُن کی وضاحتی فہرست تیار کرنے کا کام انجمن ترقی اُردو حیدر آباد دکن نے جناب سید نصیر الدین ہاشمی صاحب کے سپرد کیا جو اس میدان کا کافی پختہ تجربہ رکھتے ہیں اور اس نوع کے متعدد کام پہلے بھی کر چکے ہیں زیر تبصرہ کتاب یہی کیٹلاگ ہے جو ساتسو پچیس کتابوں پر مشتمل ہے - یہ کتابیں چوبیس فنون پر تقسیم ہیں جن میں اسلامیات ، ادب ، تاریخ ، فنونِ لطیفہ وغیرہ سب ہیں - ہاشمی صاحب نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ہر مخطوطہ کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے - جو حضرات اُردو زبان پر تحقیقاتی کام کرنے کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے لئے اس فہرست کی اہمیت اور افادیت ظاہر ہے - ان کے علاوہ عام لوگ بھی م

م اس کے علاوہ ادب کی وسعت اور اس کے مختلف مدارج ارتقا کا پتہ چلتا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق و نظر اس کی قدر کریں گے اور اس سے فائدہ اٹھائیں گے

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک انقلاب انگیز کتاب، جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔

قیمت للعہ، مجلد ہے

اِسلام کا نظامِ مساجد

نظامِ مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔

قیمت ہے، مجلد للعہ

اسلام کا نظام عِفّت وعِصمت

عِفّت وعِصمت اور اُن کے لوازم پر بصیرت افروز بحث اور نظامِ عِفّت کی اسلامی خصوصیتوں کی دل پذیر تشریح، لائق مطالعہ کتاب، قیمت للعہ، مجلد صہ۔

اسلام کا زرعی نظام

اسلام کے نظامِ زراعت پر ایک جامع کتاب، زمین کی تقسیم کے اصول اور خلافت راشدہ کے زمانے میں کاشتکاروں کے لئے جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ان کی تفصیل

قیمت للعہ، مجلد صہ

اِسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر معرکۃ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

(قیمت ؎ مجلد للعہ)

قرآن اور تعمیر سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم وتربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس کے ذریعہ سے اس سیرت وکردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ متبرک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

قیمت صہ مجلد ؎

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں اصول اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواع اخلاق کی دل پذیر تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے اسلام کے مجموعہ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں پر ثابت ہوتا ہے۔ نظر ثانی کیا ہوا تازہ ایڈیشن۔

قیمت ہے، مجلد مہر

ارشاداتِ نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ:۔ ہماری زبان میں ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی، اس میں حدیثوں کا عربی متن مع اعراب بھی ہے اور صاف وسلیس ترجمہ بھی، ساتھ ہی تشریحی اور تحقیقی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک بصیرت افروز مقدمہ ہے۔

جلد اول قیمت عنہ، مجلد عہ، جلد دوم قیمت لعہ، مجلد عہ

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں، کلام ربانی کا قطعی منشا معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات واقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ اس موضوع پر ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔

قیمت عہ، مجلد ہے

وحی الٰہی مسئلہ وحی کے تمام گوشوں کی دل پذیر تشریح، وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب، نہایت نفیس۔ جدید ایڈیشن۔

قیمت ؎، مجلد للعہ

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہان

جلد ۴۰ — شمارہ ۶

جون ۱۹۵۸ء مطابق ذی قعدہ ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

خوشی کی بات ہے کہ حکومتِ ہند کے ادبی ادارہ ساہتیہ اکاڈمی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تمام تحریروں۔ کتابوں اور خطوں کو چھاپنے کا ایک پروگرام بنایا ہے اور اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بھی بنادی ہے جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ اور جو حضرات اس کمیٹی کے ممبر ہیں وہ بھی اُردو زبان کے جانے پہچانے اہلِ قلم اور ادیب ہیں لیکن چوں کہ مولانا ابوالکلام خواہ اور جو کچھ بھی ہوں اصلاً ایک عالمِ دین ہی تھے۔ اسی حیثیت سے انھوں نے پبلک لائف شروع کی اور اسی حیثیت کے سایہ میں وہ بعد میں سب کچھ بنے۔ اس بنا پر مولانا کا سرمایۂ تحریر زیادہ تر مذہبی مضامین پر ہی مشتمل ہے۔ پھر چوں کہ مولانا نے مختلف وجوہ و اسباب سے یہ مضامین زیادہ تر اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے لکھے ہیں اس لئے ان میں حوالہ یا تعبیر کی بعض غلطیاں بھی ہوگئی ہیں چنانچہ کتاب ترجمان القرآن جو مولانا کی تصانیف میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں اور بعض غلطیاں تو علمی اعتبار سے بڑی فاحش ہیں مثلاً سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں "مالک یوم الدین" کے ماتحت مولانا نے عربی کا یہ شعر نقل کیا ہے

ستعلم لیلی ای دین تداینت　　　　و ای غریم فی التقاضی غریمہا

اس شعر میں مولانا نے "دین" کے لفظ کو بکسر الدال پڑھا ہے حالانکہ صحیح بفتح الدال ہے اور "قرض" کے معنی میں ہے چنانچہ "تداینت" "غریم" اور "تقاضی" ان سب لفظوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس بنا پر یہ نہایت ضروری ہے کہ جہاں کہیں اس طرح کی غلطی ہو اُس کی تصحیح کر دی جائے یا کم از کم فٹ نوٹ میں اُس کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ کمیٹی میں مولانا حفظ الرحمٰن یا مولانا عتیق الرحمٰن جیسے ایک دو عالموں کو بھی شامل کیا جاتا۔ تاکہ مولانا کے مذہبی مضامین کی ترتیب و تہذیب اور اُن کا اڈیٹنگ

خاطر خواہ طریقہ پر ہوتا۔ غالباً کمیٹی کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ تعاون کے لئے اگر ضرورت سمجھے تو دو ایک ناموں کا ممبروں میں اضافہ کرسکتی ہے اگر واقعی ایسا ہے تو ہم کو امید ہے کہ کمیٹی ہماری مخلصانہ گذارش پر توجہ کرے گی۔

پاکستان میں ڈاکٹر خاں صاحب کا دردانگیز واقعۂ شہادت ایک ایسا سانحۂ عظیم ہے کہ شرافت وانسانیت اس کا جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔ مرحوم ہندوستان کی جنگ آزادی کے صف اول کے سپاہی اور مجاہد تھے۔ اس راہ میں انھوں نے کامل عزم واستقلال اور ہمت وجوانمردی کے ساتھ جو سختیاں جھیلی ہیں اور پٹھانوں میں جو ڈسپلن اور ضبط ونظم پیدا کیا ہے وہ ان کے کردار اور صفتِ قیادت کا آئینہ دار ہے۔ مرحوم صرف جنگ آزادی کے مردِ میدان ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک مثالی حکمراں بھی تھے۔ سادگی، خلوص ودیانت، محنت وجفاکشی۔ حق پسندی وعدل گستری، بے لوث خدمتِ بنی نوع انسان۔ ان صفات وکمالات کے باعث پاکستان کی سیاست کے موجودہ دورِ اختلال وانتشار میں تنہا ایک مرحوم کی ذات تھی جن کو عوام کا اعتماد حاصل تھا اور جن کے خلوص ودیانت پر بڑے سے بڑا سیاسی مخالف بھی حرف گیری نہیں کرسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے نوازے اور ان کے مراتب بلند کرے۔

ابھی یہ سطور لکھی جارہی تھیں کہ اچانک اطلاع ملی کہ مولانا سید ابوظفر ندوی نے اپنے وطن دسنہ (بہار) میں وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون، مرحوم پرانے دور کے ندوی تھے۔ تمام علوم اسلامیہ وعربیہ میں دسترس رکھتے تھے، لیکن تاریخ ان کا خاص فن تھا، چنانچہ مرحوم نے جتنے مقالات لکھے اور جتنی کتابیں تالیف کیں اُن میں سے اکثر وبیشتر اسی موضوع پر ہیں۔ اس فن کا بڑا عمدہ اور صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے جو کچھ لکھتے تھے شگفتہ زبان میں لکھتے اور تحقیق کے ذریعہ فراہمیِ معلومات کا حق ادا کردیتے تھے مختصر تاریخ ہند اور تاریخ سندھ دار المصنفین کی طرف سے شائع ہوکر مقبول عام وخاص ہوچکی ہیں۔ ایک ضخیم کتاب "تاریخ گجرات" کے نام سے ندوۃ المصنفین کے زیرِ اہتمام طبع ہورہی ہے۔ مختلف کالجوں

میں پروفیسر رہے اور اب دھر سالہا سال سے احمد آباد میں گجرات اکاڈمی سے وابستہ تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجہ یا بھتیجے تھے اور یوں بھی صورۃً و سیرۃً سید صاحب سے اس درجہ مشابہ تھے کہ ۱۹۵۵ء میں اپنی صاحبزادی کی شادی کے سلسلہ میں کلکتہ آئے اور پہلے سے کسی اطلاع کے بغیر اچانک راقم الحروف سے ملنے کی غرض سے دفتر میں تشریف لے آئے تو مرحوم کو دیکھ کر سید صاحب کی شکل و صورت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اور بے قرار کر گیا، یہ بالکل پہلی ملاقات تھی مگر وہی بزرگانہ شفقت و محبت۔ باتوں میں علمیت اور ذہانت کے ساتھ وہی بھولاپن اور سادگی۔ وہی غایتِ کرم اور توجہ۔ سمدھیانہ میں شادی کا ہنگامہ بپا تھا اس لئے شب غریب خانہ پر ہی بسر کی۔ احمد آباد سے بھی وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہتے تھے اور اُس میں بھی وہی مشفقانہ اور بزرگانہ انداز ہوتا تھا۔ میرے اور اپنے خانگی معاملات پر اس طرح گفتگو کرتے تھے کہ گویا ہم دونوں قریبی رشتہ دار ہوں۔ ان ذاتی اخلاق کے علاوہ بڑے متشرع اور متدین تھے۔ دو راتیں میرے مکان پر گذاریں مگر اُن میں بھی مسافر ہوتے کے باوجود تہجد کی نماز ادا کی اور حسبِ معمول اوراد و وظائف کا ورد کیا۔ حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ اب ایسے بزرگوں سے دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے۔ آئندہ ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترسیں گی اور یہ لوگ کہیں نہ ملیں گے۔

پچھلے دنوں وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسہ میں اقلیتوں کے تحفظ اور اردو زبان سے متعلق اس قدر صاف اور جرأتمندانہ تقریر کی کہ خود اقلیتوں کے بعض لیڈر اور اردو کے بہت سے حامی بھی اس صفائی کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ پنڈت جی کی یہ تقریر اور اس کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز ان دونوں نے اردو تحریک کو دنیا کی ایک ایسی اہم تاریخی دستاویز بنا دیا ہے کہ اب بڑے سے بڑا متعصب اور مخالف بھی اُس کی صداقت میں شبہ نہیں کر سکتا۔ لطلاقی اعتبار سے اردو تحریک کی یہ اتنی بڑی کامیابی اور فتح ہے کہ ایک جمہوریت میں اس سے بڑی فتح کا تصور نہیں کیا جا سکتا اب رہی یہ بات کہ عملاً اس تجویز کا اور پنڈت جی کی تقریر کا اثر کیا ہوگا؟ تو جو لوگ اس رمز سے آشنا ہیں کہ یہ دونوں چیزیں کن تاریخی اور سماجی عوامل کا نتیجہ ہیں ان کو اس میں ذرا شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ بے اثر نہ رہیں گی اور ان کا عملی نتیجہ یقیناً امید افزا ہوگا۔ یہ جو کچھ ہوا صرف اُردو کی فتح نہیں ہے بلکہ ملک میں صحیح جمہوری زندگی کا جو احساس پیدا ہو رہا ہے اس کا ایک نشان ہے اور یہ ملک کے مستقبل کے روشن ہونے کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

اسلام کا نظام امن و امان

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

(۲)

اسلامی قوانین | امن و امان کے بنیادی اجزاء یہ ہیں کہ انسانوں کی جان محفوظ ہو، ان کی عزت و آبرو پر کوئی ہاتھ ڈالنے نہ پائے، ان کی جائداد و املاک اور دولت میں کوئی ناجائز تصرف کرنے نہ پائے، اور پبلک کے کسی فرد کا قانونی سکون و اطمینان برباد نہ ہو سکے،

اسلام نے ان تمام چیزوں کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے، ہم ایک خاص ترتیب سے ان پر ایک اجمالی روشنی ڈالنے کی سعی کریں گے، دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سلسلہ میں کامیاب فرمائیں۔

جان کی محافظت اسلام میں | دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت انسانی جان کو حاصل ہے، کہ غریب ہو یا امیر، سلطان ہو یا گدا، بچہ ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، پھر وہ اونچے خاندان کا چشم و چراغ ہو یا محتاج و دست نگر خاندان سے تعلق رکھتا ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم، کسی بھی دین سے متعلق ہو، مگر ایک شہری و فادار کی حیثیت سے سب کو ضمانت دی جائے، کہ وہ آزادی سے چل پھر سکے، آجا سکے، اور اطمینان و سکون سے اپنے کاموں میں منہمک رہے، تمام خطرات سے اس کے دل پاک و صاف ہوں۔

اسلام سے پہلے قتل و خوں ریزی عام تھی اور اس سے بھی بہت زیادہ جو حالت آج آزاد بھارت اور پاکستان میں ہے ہمارے ان ملکوں میں ردِ عمل اور مذہب کے نام پر قتل و خوں ریزی کا بازار گرم ہے، وہاں خاندان اور وطن کے نام پر یہ مصیبتیں تھیں، جیسا کہ اوپر اشارہ کر آیا ہوں،

قتل و خون کی روک تھام | عرب میں بچیاں زندہ درگور کی جاتی تھیں، بچے فاقہ کے خطرہ سے قتل کئے جاتے تھے، اور یہی نہیں بلکہ ذرا سی بات پر خاندان کا خاندان کٹ مرتا تھا، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری قوت سے ان کے ان جذبات کی روک تھام کی، قدم قدم پر ان کو ان کی ان حرکتوں سے باز رکھنے کی جد و جہد کی۔

یہ تو عیاں ہے کہ انسانوں میں قتل اور خوں ریزی اور فتنہ و فساد کا فطری داعیہ ہے، اور وہ بھی اتنا زبردست کہ فرشتے بھی کانپ اُٹھے تھے، اور ان کو بھی رب العالمین سے یہ درخواست کرنی پڑی تھی۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ (بقرہ - ۴)	فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو اس میں فساد اور خونریزیاں کریں گے۔

پونے چھ سو برس جب بیچ سے وہ برگزیدہ بندے الگ کر دئے گئے ہوں، جو ان کے اس فطری داعیہ کو اعتدال پر لگایا کرتے ہیں اور صحیح رخ پر لگاتے ہیں، تو خود اندازہ کیجئے بعثتِ نبوی سے پہلے کیا حال ہوگا۔

اسلام سے پہلے کی حالت | اگر اختصار کے ساتھ ہم ان حالات کی طرف اشارہ بھی کریں، تو کہنا پڑے گا کہ پوری دنیا شر و فتن کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، امن و امان ناپید تھا، صلح و آشتی کا نام و نشان مٹ چکا تھا، یکجہتی و یگانگت کو لوگ بھول چکے تھے، اور ان کی جگہ فتنہ و فساد کی گرم بازاری تھی، قتل اور خونریزی کا عام چرچا تھا اور رہزنی اور چوری کی وباء نے امن و سکون کو خاکستر کر رکھا تھا، عام طور پر جو مضبوط تھے کمزوروں کو قتل کر ڈالتے تھے، جو قوی تھے وہ ناتوانوں کو بے دردی سے پیس رہے تھے اور نا ممکن تھا کہ کوئی مالی سرمایہ لے کر تنہا ایک جگہ سے دوسری جگہ بے خطر جا سکے۔

عداوت و سنگدلی | حد یہ ہے کہ باپ اپنے معصوم بچوں پر ترس نہ کھاتا تھا، مائیں اپنی ننھی منی بچیوں

کو گود سے پھینکنے پر آمادہ ہو جاتی تھیں، ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کا احترام کرنے کو تیار نہ تھا، اور انسان انسان سے محبت اور پیار کا سلوک فراموش کر چکا تھا، قرآن پاک نے ان کے ان عیوب کی طرف بڑا بلیغ اشارہ فرمایا ہے، اور امن وامان کے بنیادی مرض کی نشاندہی کی ہے۔

وَكُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ — تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا

سنگ دل ماں اور بے رحم باپ کے ظلم وستم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ — اور اس وقت کو یاد کرو) جب لڑکی کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ وہ کس جرم میں زندہ درگور کی گئی

بچوں کا قتل جہاں بچوں کے قتل سے رب العالمین نے منع فرمایا ہے۔ وہیں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ فقر وفاقہ کو حیلہ بنا کر قتلِ ناحق کا خون اپنی گردن پر اٹھاتے تھے اس کے علاوہ قرآن نے مشرکین کی اس رسم قبیح کو صراحتاً بھی بیان کیا ہے ارشادِ ربانی ہے

وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ (الانعام-۱۶) — اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کا قتل کرنا بھلا کر کے دکھایا تاکہ وہ ان کو ہلاک کریں اور اپنے دین کو مشتبہ کریں

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں

كذالك زينوا لهم قتل اولادهم خشية الاملاق ووأد البنات خشية العار (تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۱۸۱) — ایسا ہی شیاطین نے ان مشرکوں کے لئے فقر وفاقہ کے اندیشہ سے اولاد کے قتل اور ننگ وعار کے موہوم) خطرہ سے بچیوں کے زندہ درگور کرنے کو محبوب مشغلہ بنا رکھا تھا

نسل کشی کا رواج شیطان نے انسانوں کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ اپنی

بے وقوفی اور حماقت میں مبتلا تھے، اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے تھے، سوچئے انسان اپنی نسل کو ترقی دیتا ہے، ساری مصیبتیں جھیل کر بال بچوں کی پرورش کرتا ہے مگر ان کا حال یہ تھا کہ یہ خود اپنے ہاتھوں اپنی نسل کشی کے فرائض انجام دے رہے تھے، قرآن نے ان کی اس حماقت کا بھی تذکرہ کیا ہے، ارشاد ہے

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (الانعام - ۱۶)	بے شک وہ لوگ گھاٹے میں ہیں جنہوں نے ناسمجھی سے بغیر علم کے اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ پر جھوٹ باندھ کر ان چیزوں کو حرام ٹھہرایا، جو اللہ نے ان کو رزق دیا، بے شک وہ بہک گئے اور راہ پر نہ آئے۔

بچیوں کا قتل تو عام تھا کہ یہ غریب باعث ننگ عار سمجھی جاتی تھیں، لیکن حد یہ ہے کہ بچوں کے قتل پر بھی جری تھے، جس میں ننگ و عار کی کوئی بات نہ تھی، محض فقر کا خطرہ تھا، اور خطرہ بھی کیا بلکہ یوں کہئے صرف شیطانی وسوسہ۔

انهم كانوا يقتلون اولادهم كما سولت لهم الشياطين ذالك فكانوا يئدون البنات ..... وربما قتلوا البعض الذكور خشية الافتقار (ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۱۸۱)	یہ مشرکین اپنے بچوں کو قتل کر دیا کرتے تھے جس کا شیطانوں نے ان کو سبق پڑھا رکھا تھا پھر بے دردی سے بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے اور بسا اوقات محتاجی کے اندیشہ سے بھی بعض بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا کرتے تھے،

اسلام کا اصلاحی قدم | اسلام نے ان لوگوں کو سختی کے ساتھ بچوں کے قتل سے روکا اور جو فقر و فاقہ کا شیطانی وسوسہ ان پر مسلط ہو چکا تھا، اس سے ان کو نکالنے کی جد و جہد کی، ان کو یقین دلایا کہ ساری مخلوقات کے رزق کی فراہمی رب العالمین کے ذمہ ہے، وہ ہر ایک کی روزی کا سامان کرے گا۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا

اور زمین پر کوئی چلنے والا نہیں ہے مگر اللہ پر اس کی روزی ہے

امن وامان کی سعی اور بچوں کے قتل کی ممانعت

ساتھ ہی رب العالمین نے قتلِ اولاد کے مسئلہ میں رزق کے خدشہ کو دفع کیا اور وضاحت کے ساتھ فرمایا

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ (الانعام ۱۹)

نہ قتل کرو اپنی اولاد کو تنگ دستی کے سبب سے تمھیں اور ان کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔

انسان کی خام عقلی ملاحظہ کیجئے کہ اس نے اپنے کو رزّاق سمجھ رکھا تھا حالانکہ وہ خود بھی اس سلسلہ میں محتاجِ محض ہے۔ پروردگارِ عالم کا احسان ہے کہ اس نے انسانوں کو یقین دلایا کہ ہم جس طرح تم کو رزق دے رہے ہیں اسی طرح تمھارے بچوں کو بھی حاصل ہوتا رہے گا تم اس فکر میں اپنے کو نہ ڈالو اور امن وامان کے خلاف جس فتنہ وفساد کی مشق بہم پہنچا رہے ہو، اسے فوراً بند کرو۔ پھر سوچو تو سہی کہ محض ایک شبہ کی وجہ سے جو شیطانی پیداوار ہے، بچوں کا قتل کون سی دانشمندی ہے، چنانچہ دوسری جگہ اسی مسئلہ کو اس طرح بیان فرمایا گیا

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًا

اور اپنی اولاد کو محتاجی کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی، بے شک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

عرب میں قتلِ اولاد کی بنیاد دو تھیں، ایک کوئی مفلس ہوتا وہ قتل کر دیتا کہ ہم تو پریشاں حالی سے زندگی گذارتے ہیں، یہ کہاں پرورش پائے گا۔ دوسرا وہ شخص بھی بچوں کو قتل کر دیا کرتا، جو کھاتا پیتا ہوتا، اور یہ محض اس اندیشہ سے کہ بچوں کے بڑھ جانے سے، فقر وفاقہ کی نوبت آسکتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے اس زمانہ میں بھی عام طور پر سوچا جانے لگا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صورتوں سے سختی کے ساتھ منع کیا اور انسانی جان کا تحفظ

کیا، ساتھ ہی جہاں سے لوگوں میں سنگ دلی اور خوں ریزی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اس سوراخ کو مضبوطی سے بند کیا۔

قتل اور اسلامی تعلیمات | اسلام نے قتل اور خوں ریزی کو اولاً ترغیب و ترہیب کے ذریعہ بند کرنے کی جدوجہد کی ہے اور لوگوں کے دلوں میں خونِ ناحق کی بُرائی بٹھانے کی سعی کی ہے، پھر ان مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، جو خونِ ناحق سے پیدا ہوتے ہیں ساتھ ہی امن داماں سے اس کا جو گہرا رشتہ ہے اسے اُجاگر کیا ہے تاکہ انسان اس گناہ سے اپنے آپ کو بچا سکے ارشادِ ربانی ہے

ولا تقتلوا النفس التی حرّم اللہ الا بالحق (بنی اسرائیل - ۴)	اور جان کو جسے اللہ نے محترم کیا ہے ناحق قتل نہ کرو۔

آگے اس کا بھی بیان ہے کہ مقتول کے وارث شرعاً قصاص کا اختیار رکھتے ہیں، مگر چوں کہ بعثتِ نبوی سے پہلے ردِ عمل کے نام پر بدلہ سود در سود لیا کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مقتول کے وارث کو بھی اس زیادتی سے روکا ہے، کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو قصاص کا منشا ہی فوت ہو جائے گا، اور چوں کہ مقتول کے وارث غم و غصہ میں اعتدال سے عادۃً تجاوز کے عادی تھے، اس لئے اس پر قید و بند لگانی ضروری تھی، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے

ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً فلا یسرف فی القتل انہ کان منصوراً (بنی اسرائیل ۴)	اور جو شخص ظلم سے مارا جائے، ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ قتل میں (یعنی بدلہ لینے میں) زیادتی نہ کرے، بلاشبہ اس کی مدد کی گئی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے تفسیری ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں

"اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ نے قواعدِ شرعیہ کی رو سے حرام فرمایا ہے، اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق پر قتل کرنا درست ہے، یعنی جب وجوب یا اباحتِ قتل کا کوئی سببِ شرعی پایا جائے اور اس وقت وہ "حرّم اللہ" میں داخل نہیں، اور

جو شخص ناحق قتل کیا جائے، تو ہم نے اس کے وارث حقیقی یا حکمی کو قصاص لینے کا شرعاً اختیار دیا ہے، سو اس کو قتل کے بارے میں حدِ شرع سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے یعنی قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل نہ کرے، کیوں کہ وہ شخص زیادتی نہ کرنے کی صورت میں تو شرعاً طرف داری کے قابل ہے، اور زیادتی کرنے سے فریقِ ثانی طرفداری کے قابل ہو جاوے گا۔ اس لئے زیادتی کر کے منصوریت سے خارج نہ ہونا چاہیئے[1]

قتل کے شرعی وجوہ تین صورتیں ہیں جن میں قتل جائز ہے ایک یہ کہ کسی کو کوئی ناحق قتل کردے دوسرے یہ کہ کوئی شادی شدہ زنا کرے اور اس کا زنا ثابت ہو جائے، تیسرے مرتد جو اپنے دینِ برحق کو چھوڑ کر پھر جائے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا یحل دم امرأ مسلم یشہد	اس مسلمان کا خون حلال نہیں ہے جو خدا
ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول	کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کی شہادت
اللہ الا باحدی ثلاث الثیب	دے مگر تین مجرم میں سے کسی کو بھی قتل کرنا البتہ
الزانی، والنفس بالنفس	جائز ہے شادی شدہ زناکار اور قاتل نفس
والتارک لدینہ المفارق للجماعۃ	اور تیسرا وہ شخص جو دین سے پھر جائے اور جماعت
(للستۃ الا مالکا) (جمع الفوائد ج۱ صفحہ ۲۰۵)	سے کٹ جائے۔

خدا کے نیک بندے اور قتل اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے نیک بندوں کے صفات گنائے ہیں، وہاں یہ صفتیں بھی بیان کی ہیں

والذین لا یدعون مع اللہ الٰہا	اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو
اٰخر ولا یقتلون النفس التی حرم	نہیں مانتے اور نہ اس جان کو ناحق قتل کرتے ہیں
اللہ الا بالحق ولا یزنون، ومن	جسے اللہ نے محترم بنایا، اور نہ زنا کرتے ہیں،
یفعل ذالک یلق اثاما یضاعف	اور جو یہ کام کرے گا وہ گناہ میں پڑے گا اور
لہ العذاب یوم القیامۃ ویخلد	قیامت کے دن اس کو دونا عذاب ہوگا،

[1] بیان القرآن جلد ۲ صفحہ

فیہ مھانا (الفرقان - ۶) اور ذلیل ہو کر اس میں مبتلا رہے گا

جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے محبوب بندوں کی صفات میں جہاں یہ صفت ہے کہ وہ شرک و کفر سے بیزار ہوتے ہیں وہیں یہ بھی صفت ہے کہ وہ قتلِ ناحق سے الگ تھلگ رہتے ہیں، اور جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ سخت عذاب میں گرفتار کیا جاتا ہے، گویا ناحق خون بہانا شانِ ایمان کے سراسر منافی ہے۔

قتلِ ناحق کی ممانعت | اسی طرح قرآن نے ایک جگہ تفصیل بیان کی ہے کہ پروردگارِ عالم نے اپنے بندوں پر کون سے کام حرام کئے، وہاں ان حرام کاموں میں قتلِ ناحق کو بھی بیان کیا ہے ارشادِ رب العزت ہے

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ اور نہ مار ڈالو اس جان کو جس کو اللہ نے حرام کیا
الا بالحق ذالکم وصاکم بہ لعلکم مگر حق پر، اس کی تم کو تاکید کر دی ہے کہ شاید
تعقلون - (الانعام - ۱۹) تم سمجھ لو۔

خونریزی اسلام کی نظر میں | اسلام نے اسے بھی واضح کیا ہے کہ قتلِ ناحق سب سے بڑا جرم ہے، اس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں اس لئے کہ یہ روئے زمین سے امن و امان کو برباد کر دینے والی چیز ہے اور انسان کے سکونِ دل کو سلب کر لینے والی بیماری، اس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ بلیغ تعبیر ہو سکتی ہے، اسے قرآن نے اختیار کیا ہے تاکہ قتل کی شناعت اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے، غور کیجئے اللہ تعالیٰ کس اہمیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، ارشاد ہے

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد جو کسی جان کو بغیر کسی جان کے بدلہ یا بغیر ملک
فی الارض فکانما قتل الناس میں فساد کرنے پر مار ڈالے، تو گویا اس نے مار
جمیعا ومن احیاھا فکانما احیا ڈالا تمام لوگوں کو، اور جس نے جلایا ایک جان
الناس جمیعا (المائدہ - ۵) کو تو گویا اس نے جلایا سب لوگوں کو۔

امن و امان کے برقرار رکھنے کی جو بلیغ تعبیر اللہ تعالیٰ نے یہاں اختیار فرمائی ہے،

اس سے بڑھ کر دوسرا پیرایۂ بیان ممکن ہی نہیں ہے اس کے مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں کہ ایک جان کے قتل کو تمام کائناتِ انسانی کے قتل سے کیوں تعبیر کیا گیا جس کی تفصیل کتب تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے یہاں مجھے طبری کا یہ بیان پسند ہوا

واختار الطبری ان المراد بذالک تعظیم العقوبۃ وشدۃ الوعید من حیث ان قتل الواحد وقتل الجمیع سواء فی استیجاب غضب اللہ وعذابہ (فتح الباری - ج ۱۲ ص ۱۶۵)

یعنی طبری فرماتے ہیں کہ اس آیت میں عقوبت کی عظمت اور وعید کی شدت کا بیان ہے اور بتانا ہے کہ ایک انسان کا ناحق قتل اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کو اسی طرح حرکت میں لے آتا ہے جس طرح تمام انسانوں کا قتل۔

یہ جرم عظیم تو ہے ہی لیکن سوچنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی جرم کا دروازہ ہمت کر کے کوئی کھول ڈالتا ہے، تو پھر وہ عام گذرگاہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اور عام لوگوں کے سامنے یہ ایک بری مثال آجاتی ہے جو بسا اوقات ان کو اس جرم پر جری بنا دیتی ہے، اور جو اہمیت عام طور پر پہلے ذہنوں میں راسخ ہوتی ہے، وہ بتدریج ختم ہونے لگتی ہے، اس لئے جو ناحق ایک بے گناہ کو قتل کرتا ہے، درحقیقت وہ سیکڑوں کے قتل کا سامان فراہم کر جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اہمیت کے پیش نظر فرمایا

ابغض الناس ثلثۃ ملحد فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ ومطلب دم امرأ بغیر حق لیھریق دمہ (بخاری باب من طلب دم امرأ بغیر حق)

مبغوض ترین تین ہیں حرم میں الحاد کا مرتکب، اسلام میں مراسم جاہلیت کو رواج دینے والا اور ناحق کسی کے خون کا خواہش مند کہ اس کا وہ خون بہائے۔

قتل و قتال خلیفہ راشد کی نظر میں منشا یہ ہے کہ گناہگاروں میں مبغوض ترین یہی لوگ ہیں، چنانچہ صحابہ کرام نے اس مسئلہ کو خوب سمجھا تھا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جن دنوں باغیوں

نے خلیفۂ اسلام ذی النورین حضرت عثمان غنیؓ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تھا، میں کسی طرح خدمت عثمانی میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ حضرت! میں امداد کے لئے حاضر ہوا ہوں، حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ مری باتیں سن کر فرمایا

ایسرك ان تقتل الناس جمیعا وایای معھم (ابن کثیر ج ۷ ص۱۸۲) — کیا آپ کو یہ بات خوش کرے گی کہ آپ تمام لوگوں کو قتل کر ڈالیں اور ان کے ساتھ مجھے بھی۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا، حضرت! یہ تو ہرگز پسند نہیں ہے، حضرت عثمانؓ نے میرا یہ جواب سن کر فرمایا

فانك ان قتلت رجلا واحدا فکانما قتلت الناس جمیعا (ج ۷ ص۱۸۲) — جب یہ ہے تو اگر آپ کسی ایک کو قتل کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے گویا کل کو قتل کر ڈالا

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں واپس چلا آیا، اور جس مقصد سے گیا تھا اس میں ہاتھ نہیں ڈالا، پھر تاریخ شاہد کہ حضرت ذی النورینؓ نے خود جامِ شہادت نوش جاں فرمانا تو قبول کیا مگر تلوار اُٹھانے کی اجازت نہ دی۔

یہ تھا عمل اور عملی تفسیر قرآنی آیت کی، اور یہ منزلت تھی امیر المؤمنین کی نظر میں امن وامان کے قیام کی، جس کا اس دور میں تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

قتل کی تاریخ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قتل کی تاریخ بھی بیان کی ہے تاکہ لوگوں کو اس سے عبرت ہو اور سنجیدگی سے اس کے نشیب وفراز پر غور کر سکیں، ساتھ ہی اپنے اندازِ بیان میں اس نے اشارہ کیا ہے کہ اس کی بُنیاد بغض وحسد پر عموماً ہوا کرتی ہے گویا یہ کام صرف کسی مفاد ہی کے پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ عادۃً جذباتِ حسد کی تسکین کے لئے کیا جاتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

واتل علیھم نبأ ابنی ادم بالحق اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاخر قال لاقتلنك — اور اے محمد! آپ ان کو آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ پڑھ کر سنائیے، جب کہ ان دونوں نے اللہ کے نام کی ایک ایک نیاز پیش کی، اور ان میں سے

(المائدہ - ۵) ایک کی مقبول ہوگئی اور دوسرے کی مقبول نہ ہوئی وہ جھلا کر کہنے لگا میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا

یہ پورا واقعہ کئی آیتوں میں پھیلا ہوا ہے اس کا خلاصہ حضرت تھانویؒ کی زبانِ قلم سے سنیئے :

"اے محمد! آپ ان اہل کتاب کو حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا یعنی ہابیل قابیل کا قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنائیے ...... اور یہ قصہ اس وقت ہوا تھا، جب کہ دونوں نے اللہ تعالیٰ کے نام کی ایک ایک نیاز پیش کی، اور ان میں سے ایک کی یعنی ہابیل کی تو مقبول ہوگئی اور دوسرے کی یعنی قابیل کی مقبول نہ ہوئی ...... جب وہ دوسرا اس میں بھی ہارا، تو جھلا کر کہنے لگا، میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا، اس کا ایک (ہابیل) نے جواب دیا، کہ تیرا ہارنا تو ناحق پرستی کی وجہ سے ہے، مری کیا خطا؟ کیوں کہ خدا تعالیٰ متقیوں کا ہی عمل قبول کرتے ہیں، ...... سو اس میں تری خطا ہے یا مری، تو ہی انصاف کر، لیکن اگر پھر بھی تیرا ارادہ ہے تو تو جان، میں نے تو پختہ قصد کر لیا ہے کہ اگر تو مجھ پر مرے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرے گا تب بھی میں تجھ پر ترے قتل کرنے کے لئے ....

... ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں، کیوں کہ میں تو پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں ..

... میں تو یوں چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گناہ کا کام نہ ہو، گو مجھ پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کرے ..... پھر تو دوزخیوں میں شامل ہو جاوے، اور یہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی، ..... یہ جو سنا کہ مدافعت نہ کرے گا، چاہیئے تو یہ تھا کہ گداختہ ہو جاتا مگر .. اس کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا، پھر آخر اس کو قتل ہی کر ڈالا، جس سے کم بخت بڑے نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہوگیا۔"[1]

قتل ناحق اور اس کا انجام قرآن کے اس تاریخی واقعہ کو بغور مطالعہ کیجئے، تو کتنی ہی باتیں سمجھ میں آئیں گی، اولاً یہ کہ قتل پر کوئی خدا ترس آمادہ نہیں ہو سکتا، یہ ان لوگوں کا کام ہو سکتا ہے۔

[1] بیان القرآن ج ۳ ص۲۲

جو خدا کا خوف دل میں نہیں رکھتے، ثانیاً یہ کہ اس کی عمومی وجہ بغض وحسد ہوتی ہے ثالثاً یہ کہ قاتل خدا کے احکام کا باغی ہے اور سخت گنہ گار، رابعاً یہ کہ قاتل نفع میں نہیں رہتا، بلکہ سخت خسارہ میں ہوتا ہے، صحیحین میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا تقتل نفس ظلماً الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمھا لانہ اول من سن القتل (مسلم ج ۲ ص ۶۰)

جب بھی کوئی جان ظلم کی وجہ سے قتل کی جاتی ہے تو اس کے خون کا ایک حصہ آدمؑ کے اس پہلے فرزند پر آتا ہے، جس نے قتل کی بنیاد ڈالی کیوں کہ اس سلسلہ میں پہلا مجرم وہی شخص ہے

تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تفصیل سے آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا واقعہ اس لئے بیان کیا تاکہ لوگ اس کی قباحت کو محسوس کریں، اور اس گناہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کریں، یہ جو حدیث نقل کی گئی اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قتل کا موجد جس طرح سارے قتل وخون کے ایک بڑے حصہ گناہ کا بار اپنی گردن پر اٹھاتا ہے کم وبیش یہی حال اس کا بھی ہے جو پہلے پہل کسی آبادی میں اس خونِ ناحق کا رواج ڈالتا ہے حدیث میں آیا ہے

من سن فی الاسلام سنۃ سیئۃ کان علیہ وزرھا ووزر من عمل بھا الی یوم القیامۃ (فتح الباری ج ۱۲ صفحہ ۱۶۲)

جو شخص اسلام میں کسی بُری رسم کو رواج دیتا ہے اس پر اس برائی کا گناہ اور ساتھ ہی قیامت تک جتنے لوگ اس برائی کو کرتے ان کا گناہ ہوتا ہے،

انسانی جان کے احترام پر بیعت انسانی جان کی قدر وقیمت جو اسلام کی نظر میں ہے، کہیں اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کے لئے بیعت لیا کرتے تھے تو جہاں دوسری ضروری باتوں کا اقرار لیا کرتے وہاں اس کا بھی اقرار لیتے کہ قتل نہ کریں گے۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ خود فرماتے ہیں کہ میں ان نقباء میں سے ہوں جنھوں نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیعت کن چیزوں کی لیا کرتے تھے، اور انھوں نے کن امور پر بیعت کی، خود بیان فرماتے ہیں۔

بایعناہ علی ان لا نشرک باللہ شیئا ولا نزنی ولا نسرق ولا نقتل النفس التی حرم اللہ ولا ننھب الخ (بخاری باب من احیاہا)

ہم نے آنحضرتؐ سے اس بات پر بیعت کی کہ اللہ کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، زنا نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، جس جان کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہ کریں گے اور لوٹ مار نہ کریں گے

غور کریں کہ اسلام امن وامان پر کس قدر زور دیتا ہے، اور انسانی جان کی قیمت کو کس طرح اُجاگر کرتا ہے، بنیادی عقائد میں داخل ہے کہ جس طرح آدمی توحید کا اقرار کرے، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قتلِ ناحق، چوری، ڈکیتی اور فتنہ وفساد سے بھی الگ تھلگ رہنے کا اقرار کرے۔

عورتوں سے بیعت قرآنِ پاک نے جہاں عورتوں کے بیعت کا تذکرہ کیا ہے، وہاں اس کا بھی بیان ہے کہ عورتیں اس پر بھی بیعت کیا کرتی تھیں۔

ولا یقتلن اولادھن (ممتحنہ - ۲)

کہ وہ سب عورتیں اپنے بچوں کو قتل نہ کریں گی

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کی ایک جماعت کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم سب اس بات پر بیعت کرو کہ شرک سے گریزاں رہوگے، چوری نہ کروگے زنا میں مبتلا نہ ہوگے، اور اپنے بچوں کو قتل نہ کروگے، اور اسی طرح کی اور باتیں، صحابۂ کرام کا بیان ہے

فبایعناہ علی ذالک (بخاری ۱۷ص)

چنانچہ ہم نے آں حضرت صلعم سے ان چیزوں پر بیعت کی

سب سے بڑا گناہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، ای الذنب اعظم عند اللہ (خدا کے یہاں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے)

فرمایا یہ کہ تم خدا کا کسی کو شریک و ہمسر بناؤ (ان کا بیان ہے کہ پھر میں نے سوال کیا ثم ای (کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے) آپ نے فرمایا

ثم ان تقتل ولدک مخافۃ ان یطعم معک (مسلم ج ۱ ص ۶۳)

پھر یہ کہ تو اپنے بچوں کو اس اندیشہ سے مار ڈالے کہ وہ ترے ساتھ کھائیں گے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں

ان اکبر المعاصی الشرک وھذا ظاھر لا خفاء فیہ وان القتل بغیر حق یلیہ ولہذا قال اصحابنا اکبر الکبائر بعد الشرک القتل وکذا نص علیہ الشافعی (شرح مسلم ج ۱ ص ۶۳)

سب سے بڑا گناہ شرک ہے جو ظاہر ہے اور جس میں کوئی خفا نہیں، اور پھر بلاشبہ قتلِ ناحق بھی اسی کے لگ بھگ ہے اور اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے کہا کہ شرک کے بعد اکبر الکبائر قتلِ ناحق ہے اور امام شافعی نے بھی ایسی ہی صراحت کی ہے

قتل اور اس کا گناہ ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات مہلک چیزوں سے اجتناب کرو، پوچھا گیا وہ کیا ہیں، تو آپ نے فرمایا

الشرک باللہ وقتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق الخ (مسلم ج ۱ ص ۶۴)

اللہ کا شریک بنانا اور اس جان کو قتل کرنا جسے اللہ نے قتل کرنا حرام کیا ہاں حق کے لئے البتہ گنجایش ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز میں قتل اور خوں ریزی کی شناعت ذہن نشین کرنے کی سعی فرمائی ہے ایک دفعہ آپ نے خونِ ناحق کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا

لن یزال المومن فی فسحۃ من دینہ مالم یصب دما حراما (بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۴)

مومن جب تک ناحق خوں ریزی میں مبتلا نہیں ہوتا اپنے دین کے باب میں کشادگی میں رہتا ہے

کتنا مؤثر اندازِ بیان ہے کہ آدمی پڑھنے کے ساتھ اس دعا میں منہمک ہو جاتا کہ پروردگار

عالم ہمیں اس بڑے گناہ سے محفوظ رکھنا۔

مسلمان کا احترام | اب تک عموماً ایسی آیتیں اور حدیثیں نقل کی گئی ہیں جن سے نفس قتلِ ناحق سے روکا گیا ہے، اور انسانی جان کی قدر و قیمت اجاگر ہوتی ہے، لیکن انسان جب ایمان کے دائرہ میں داخل ہو جائے، اور مسلمان و مومن بن جائے تو اس کی قدر و منزلت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا، یہ تو درست ہے کہ انسانی جان کی قیمت بہت زیادہ ہے ہی، مگر ایمان کے بعد مومن جان کی قیمت عام انسانی جان سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دراصل خدا کی امانت اور اس کی ملک ہو جاتی ہے، قرآن میں بتایا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے، اس لئے قدرتی طور پر بھی اس کی قدر و منزلت دو چند ہونا ہی چاہیئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاءہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذابا عظیما (النساء)

اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے گا اس کی سزا دوزخ ہے وہ اسی میں رہے گا اور اللہ کا اس پر غضب ہوگا اور اس کی لعنت، اور اس نے اس کے لئے بڑا بھاری عذاب تیار کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کل ذنب عسی اللہ ان یغفرا لامن مات مشرکا، او من قتل مومنا متعمدا۔ (ابی داؤد جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۷۰)

ہر گناہ کے متعلق امید ہے کہ اللہ معاف کر دے سوائے اس شخص کے جو مشرک مرے یا جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر ناحق مار ڈالے۔

یہ منشا نہیں ہے کہ مومن کو جو مسلمان قتل کرے اس کی بخشائش نہ ہوگی، بلکہ اس کی اہمیت جتانے کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ مومن کی جان اس قدر قیمتی ہے کہ جو

اسے ناحق ضائع کرے وہ اس قابل باقی نہیں رہتا ہے کہ اس پر رحم کیا جائے۔

مومن کا قتل اسلام کی نظر میں | ایک دفعہ مومن کی جان کی قدر و قیمت کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا

قتل المومن اعظم عند اللہ من زوال الدنیا ۔ للنسائی

دنیا کے تہ و بالا ہونے سے بڑی بات اللہ کے نزدیک مومن کو مار ڈالنا ہے

(جمع الفوائد ج ۱ ص ۳۷۴)

ایک دفعہ دوسرے انداز میں مسلمانی جان کی اہمیت آپ نے اس طرح ظاہر فرمائی

لو ان اھل السماء و اھل الارض اشترکوا فی دم مومن لاکبھم اللہ فی النار ۔ للترمذی (ایضاً)

اگر تمام زمین و آسمان والے بھی کسی مسلمان کے خون میں شریک ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو جہنم میں اوندھا ڈال دے گا

ترمذی کی ایک حدیث ہے

لزوال الدنیا کلھا اھون علی اللہ من قتل رجل مسلم قال الترمذی حدیث حسن صحیح

ساری دنیا کی بربادی ایک مسلمان کے قتل کے مقابلہ میں اللہ کے نزدیک بالکل بے قیمت ہے

(فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۶۶)

ان احادیث کو بغور پڑھا جائے اور سوچا جائے کہ رب العالمین نے مسلمانوں کو کس شدومد کے ساتھ قتل و خوں ریزی سے منع کیا ہے، اور کیا اس انداز بیان کے بعد کسی مسلمان کو جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اس جرم میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو برباد کرے۔

(باقی آئندہ)

جدید عربی شاعری کے علم بردار

از

(جناب مولوی رشید احمد صاحب ارشد ایم اے استاد ادبیات عربی کراچی یونیورسٹی)

نپولین بوناپارٹ کا حملہ مصر مشرق وسطیٰ کی بیداری کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور اسی کے ذریعے مصر مغربی علوم سے آشنا ہوا اس حملہ کے بعد مصر نے نہ صرف علمی اور اقتصادی حیثیت سے ترقی کی بلکہ عربی ادب کی تحریکات میں بھی مصر تمام عربی ممالک کا رہنما بن گیا اس وقت عربی زبان نے جو ممالیک مصر کے زوال پذیر عہد میں ایک بگڑی ہوئی عامی زبان بن کر رہ گئی تھی ایک نئی کروٹ لی، قرآن کریم کی اس زندۂ جاوید زبان میں مغربی علوم وفنون کے تراجم ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ فصیح و بلیغ عربی ادب نمودار ہونا شروع ہوا اس مقصد کے لئے جامعہ ازہر کی ٹمٹماتی ہوئی شمع پھر روشن ہوئی اور وہاں کے علماء کے ذریعہ ان تراجم کی زبان میں فصیح عربی کا عنصر شامل کیا گیا۔ اس علمی اور تعلیمی ترقی کا سہرا محمد علی پاشا کے سر ہے جس نے نہ صرف مصر کو خود مختار بنایا بلکہ اسے علم سے بھی روشناس کرایا اس نے تعلیمی بیداری قائم کرنے کے لئے اہل مصر کو مغربی علوم وفنون، سائنس اور طب جدید سے واقف کرایا۔ اور مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے تراجم فصیح عربی زبان میں کرائے، اس نے عربی فصاحت کی بنیاد ڈال کر تعلیمی بیداری کے ساتھ ساتھ قوم میں ذہنی اور سیاسی بیداری بھی پیدا کی۔ مگر عربی شاعری کو عروج اس کے بعد اسماعیل پاشا کے زمانے میں ہوا جو خود بھی تعلیم یافتہ انسان تھا اور ادیبوں اور شاعروں کا قدردان بھی تھا اس کے زمانے میں علی ابو النصر اور علی اللیثی مشہور شاعر تھے

جدید ادبی رجحانات کا پس منظر اس قسم کے قدیم شعراء نے عربی شاعری کو غیر فصیح اور عامی زبان سے پاک کیا اور خالص فصیح عربی میں قدیم عروض وقافیہ کے ساتھ اشعار کہنے شروع کئے مگر

ان میں کوئی جدت نہ تھی البتہ زبان و بیان کے لحاظ سے ان کی شاعری مصر کے دورِ تنزل سے بہتر تھی۔ آخرکار حالات نے ایک نئی کروٹ لی جس کے نتیجے میں انگریزوں نے نہر سویز پر قبضہ کر لیا اور خود شاہِ مصر کی غداری کی وجہ سے تمام مصر پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تھا جس کو اہلِ مصر نے کسی طرح پسند نہیں کیا۔ چنانچہ جب مصری انگریزوں کی غلامی میں آ گئے تو اس وقت عوام اور تعلیم یافتہ اشخاص کو اپنی کمزوریوں کا احساس ہوا وہ محسوس کرنے لگے کہ یہ غلامی کا طوق اس لئے ان کے گلے پڑ گیا ہے کہ عوام کی جہالت، نا اتفاقی اور سیاسی کمزوریوں کی بنا پر غیروں کو ان پر حکومت کرنے کا موقع ملا ہے چوں کہ ملک کا ایک بڑا طبقہ رفتہ رفتہ فرانسیسی زبان کے ذریعے جمہوریت اور آزادی و حریت کے خیالات سے آشنا ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے اس معاملے میں عوام کی رہنمائی کی، اس حریت و آزادی کی سیاسی تحریک کا علم بردار مصطفٰے کامل تھا جس نے اپنی تقریروں کے ذریعہ قوم میں آزادی کی روح پھونکی اور اس کے ساتھ ساتھ نئے ادیبوں شاعروں اور صحافیوں نے اپنے مقالات نظموں اور اخبارات کے ذریعے قوم کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس طرح عربی شاعری میں حریت و آزادی اور جمہوریت کے نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ ان ادبا و شعراء نے یہ بھی محسوس کیا کہ عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور منظم طاقت حاصل کرنے کے لئے انھیں صرف انگریزوں کے خلاف صف آرا کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے انھیں اپنی قوم کی اندرونی کمزوریوں کو دور کرنا بھی ہے۔ قوم میں جہالت اور سیاسی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے غدار لوگ قوم فروشی کر کے انھیں غلط راستے پر لے جائیں اور ان میں انتشار پیدا کریں۔ اس لئے اس کے ساتھ ساتھ انھیں علم کی روشنی سے آراستہ کرنا بھی ضروری ہے۔ انھیں اتحاد و اتفاق کا سبق دینا بھی ہے۔ خواتین بالکل جاہل اور توہمات پرست ہیں انھیں بھی تعلیم دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ جاہل عورتیں بہادر اور مجاہد نوجوان نہیں پیدا کر سکتیں۔ بعض لوگوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سخت قسم کا پردہ ترقی کے

راستے میں سخت رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں قوم میں انتہائی غربت و افلاس کا دور دورہ تھا۔ اس لئے اس کا انسداد کرنا بھی ضروری تھا تاکہ یہ سب رکاوٹیں دور ہو کر قوم منظم طریقے سے اپنے اجنبی دشمن کے مقابلے میں صف آرا ہو سکے۔ لہذا جب ان مسائل کو سامنے رکھا گیا تو قومی رہنما اخبار نویس ادیب اور شاعر سب نے مل کر زیادہ تر انگریزوں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے آواز بلند کی اور اسی کے ساتھ قوم کی اندرونی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے بھی کوشش کرتے رہے۔

مذکورہ بالا سیاسی، سماجی، نسوانی اور تعلیمی مسائل پر جن لوگوں نے شدومد کے ساتھ اظہار رائے کا آغاز کیا ان میں محمود سامی البارودی اور حافظ ابراہیم کا نام پیش پیش ہے تحریکِ حریت کی شاعری کا بانی البارودی ہے جس نے خود بھی سیاسی تحریک میں عملی حصہ لیا۔ اور اپنی شاعری کے ذریعہ قوم میں آزادی کی روح پھونکی مگر وہ شاعر جس نے مکمل طریقے سے مذکورہ بالا مسائل کو پیش کرتے ہوئے قوم کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچانے کی کوشش کی، وہ حافظ ابراہیم تھا۔

محمود سامی پاشا البارودی البارودی عرابی پاشا کی انقلابی تحریک حریت کے لیڈروں میں سے تھا، وہ شمشیر و قلم دونوں کا شہسوار تھا ابتداء وہ مصر کی اس ابتدائی فوج کا جرنیل تھا جس نے ترکوں کے دوش بدوش جنگ کر کے بلقان اور کریٹ کے معرکوں میں داد شجاعت دی تھی۔ اس کے بعد وہ مصر کے محکمۂ فوج کا افسر اور محکمۂ اوقاف کا ڈائرکٹر ہو گیا تھا سرکاری حلقوں میں اس کا بہت بلند مقام تھا۔ مگر جب انگریزوں نے اپنی استبدادی حکومت مصر میں قایم کرنی چاہی تو اس موقع پر عرابی پاشا کے ساتھ البارودی نے بھی انگریزوں اور اس وقت کی مصری حکومت کے برخلاف علم بغاوت بلند کیا جس کے نتیجے میں عرابی پاشا کی بغاوت دبا دی گئی اس وقت البارودی کو جلاوطن کر کے ہندوستان کے قریب جزیرۂ سیلون میں نظر بند کر دیا گیا جہاں اس نے اپنی جلاوطنی کے سترہ سال گزارے اسی عرصے میں اس کی بینائی جاتی رہی تھی بعد میں اسے رہا کر کے

مصر بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے گوشہ نشینی میں باقی وقت گذارا اور ۱۹۰۴ء میں وفات پائی
البارودی نے عربی شاعری کی تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے قدیم انداز کو پھر زندہ کیا۔
اس کی شاعری صنائع بدائع کے دوراز کار تکلفات سے خالی تھی۔ اس کا اندازِ بیان سنجیدہ
اور پُرشکوہ تھا۔ تحریکِ آزادی کا علم بردار ہونے کی وجہ سے اس نے سب سے پہلے حریت اور قومیت
کے خیالات عربی شاعری میں پیش کئے اور ایک ایسی شاعری کی بنیاد ڈالی جس کی عمارت کو حافظ
اور شوقی نے اس قدر بلند کر دیا کہ وہاں پہنچنا عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہو گیا۔

بارودی کا کلام قدیم شعراء کے عمدہ طرز کا عطر ہے اس نے تمام اعلیٰ ترین عربی شعراء کے
کلام اور طرزِ بیان کی خوبیاں اپنے اندر سمو لی تھیں اور جب اس کی کسی نظم کا مطالعہ کیا جائے
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مشاہیر شعراء کی روحیں اس کی روح کے گرد چکر لگا رہی ہیں اور
اس کے اشعار کے اوپر منڈلا رہی ہیں۔ بارودی نے کوئی نیا طرز نہیں ایجاد کیا اور نہ اس نے اچھوتے
مضامین پیش کئے ہیں تاہم وہ عمدہ زبان و تراکیب کو ایسے مضامین و خیالات پر ترجیح دیتا تھا
جنہیں بھدے انداز میں پیش کیا جائے۔[1] ایک بہادر سپہ سالار ہونے کی وجہ سے قدیم شعراء کی
طرح دلیرانہ اقدامات اور شجاعت کی عظمت و بڑائی کا تذکرہ اس کے کلام میں غالب ہے مگر اس
کے علاوہ اس نے تمام قدیم اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

ولی الدین یکن حافظ اور شوقی کے زمانے میں ولی الدین یکن بھی ان حریت پسند عربی شعراء کی جماعت
میں شامل تھے جنہوں نے مشرقی اور مغربی ادب کو ملا کر ایک نئی اور درمیانی شاہراہ ادب
نکالی اور عربی ادب میں آزادیٔ افکار، حریت پسندی اور جذبات نگاری کا ایک نیا نمونہ پیش
کیا۔ افسوس ہے کہ یہ ہونہار شاعر حافظ اور شوقی سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا اور سلطان
عبدالحمید خاں اور دوسرے ظالم حکمرانوں کے فولادی پنجے نے اس کے جسم کو جکڑے رکھا اس
وجہ سے اس کے نظم و نثر کا ذخیرہ بہت کم ہے اور اس نے اپنے معاصر شعرا کی طرح اس قدر

[1] تاریخ الادب العربی للزیات ص ۴۵۱

شہرت بھی حاصل نہیں کی کیوں کہ تقلید پرست زمانہ اس کی قدر شناسی نہیں کرسکتا تاہم جیسا کہ غالب کہتا تھا۔

"شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"

اسی طرح وہ خود کہتا ہے

"اگر آج اہلِ زمانہ میرے کلام سے روگردانی کر رہے ہیں تو کل ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کے فرزند میرے کلام پر فریفتہ ہوں گے۔"

بہرحال ولی الدین یکن کے حساس دل و دماغ نے اپنی شاعری اور نثر نگاری کے ذریعہ ایک طرف سے سلطان عبد الحمید خاں اور دیگر ظالم امراء و حکام کے ظلم و استبداد کے قصر کو مسمار کیا تو دوسری طرف سے بلادِ عربیہ میں حریت و آزادی، انصاف و عدل، جمہوریت پسندی اور روشن خیالی کی روح پھونکی وہ ۱۸۷۳ء میں ترکی میں پیدا ہوا۔ اس لئے ترکی اثرات اس پر غالب تھے اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت نگاری اختیار کی مگر ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید خاں کے مظالم کا شکار ہو کر جلاوطنی اور قید و بند کی سختیاں برداشت کرتا رہا اس لئے اس نے سلطان مذکور اور ان کے ظالم حکمرانوں کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ اور امیر الشعراء شوقی کے برخلاف جو خلافتِ عثمانیہ کے ہمیشہ وفادار رہے، ولی الدین یکن ان کا کٹر مخالف تھا چنانچہ جب خلیفہ عبد الحمید خاں کی معزولی پر شوقی نے اظہار افسوس کے طور پر ایک نظم لکھی تھی تو اس نے اس کے جواب میں ایک نظم لکھی جس میں اس کی معزولی پر اظہارِ مسرت تھا اس کے دیوان کی نظمیں سات حصوں میں منقسم ہیں۔

۱۔ سیاسی نظمیں۔

۲۔ مرثیے۔

۳۔ مدح۔

۴۔ ہجو۔

۵ - دہریات یا شہر آشوب -

۶ - غزل یا عاشقانہ نظمیں -

۷ - متفرق نظمیں اور قطعات -

شاعر موصوف کی سیاسی اور وطنی نظمیں بہت زور دار ہیں' اسے سرزمین مصر سے والہانہ محبت تھی جس کا اظہار وہ اپنی لطیف اور نرم و نازک شاعری میں کرتا ہے - اس کی تمام نظمیں مسلسل خیالات پر مشتمل ہیں - جن کی زبان موقع اور محل کے مطابق سیاسی نظموں میں زور دار اور غزلوں میں نرم و نازک ہے' دیوان مختصر ہے مگر تنوع اور بیش قیمت خیالات کا حامل ہے شاعر موصوف نے ۱۹۳۱ء میں وفات پائی [1]

ولی الدین یکن کی شاعری اس زمانے کے ماحول پر شدید تنقید کی آئینہ دار تھی - اس کی شاعری محض بزم اور محفل کی زینت نہ تھی جیسا کہ اس کے معاصر اسماعیل صبری کی شاعری تھی بلکہ وہ اپنے زمانے کی سیاست اور ماحول کے خلاف سخت تنقید تھی اس زمانے میں مغرب اور انگریزوں کے اثر سے جمہوریت اور اصلاح معاشرت کی تحریکات زوروں پر تھیں اس لئے اس نے ان تحریکات کی پُرجوش حمایت کی - جمہوریت اور مغربی معاشرت کی تائید میں وہ اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ وہ انگریزوں کی جمہوری حکومت کو پسند کرتا تھا اور چونکہ ابھی تک انگریزوں کی استعماری چالیں بے نقاب نہیں ہوئی تھیں اور انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ عوام میں شدید نہیں ہوا تھا ، اس لئے مصری تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت ، جو سلطان عبد الحمید خاں کے ظلم و استبداد کا بری طرح سے شکار ہو چکی تھی ، انگریزوں کو ترکوں پر ترجیح دینے لگی کیونکہ انگریزوں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ملکی اور قومی ترقی میں ان کی بہت مدد کریں گے اس طرح وہ انگریزوں کی اس پالیسی کا شکار ہو گیا کہ مصر میں ترکوں کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت بڑھا کر انھیں اپنا حامی بنا لیا جائے چنانچہ ولی الدین یکن نے بھی اپنی جمہوریت پسندی کی بنا پر اپنے بعض اشعار اور تحریروں میں انگریز افراد کی حمایت محض اسی بنا پر کی تھی کہ اس کے خیال میں یہ قوم جمہوریت اور آزادی پسند ہے

[1] ولی الدین کے مزید حالات اور سوانح حیات کے لئے ملاحظہ ہو میرا مقالہ مندرجہ العلم کراچی شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۶ء

اور دوسری قوموں کو جس میں مصر بھی شامل ہے، آزاد کرانا چاہتی تھی، چنانچہ اس نے ایڈورڈ ہفتم کے انتقال پر اس کے مرثیے میں یہ اشعار کہے تھے

ابا الاحرار لا ینساک حرٌ | شباب ھم یجلک والکھول
رفعت بناءھم وجریت معھم | کذاک اللیث یتبعہ الشبول
تنادیک الشعوب بکل ارض | فلیتک سامع ماذا تقول

۱۔ اے حریت پسندوں کے باپ تمھیں کوئی حریت پسند فراموش نہیں کرسکتا۔ اس گروہ کے نوجوان اور بوڑھے دونوں تیری تعظیم کرتے ہیں۔

۲۔ تم نے ان کی (آزادی کی) عمارت کو بلند کردیا اور ان کے ساتھ دوڑتے رہے۔ شیر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے شیروں کے بچے دوڑتے پھرتے ہیں۔

۳۔ ہر ملک وزمین کی قومیں تمھیں پکار رہی ہیں (کاش جو کچھ وہ کہہ رہی ہیں اسے تم سن سکتے)

اس کے برخلاف جب سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی پر شوقی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے ایک نظم لکھی تو ولی الدین یکن اس پر بہت برافروختہ ہوا اور نہایت غضب ناک لہجے میں اس نے اس کی تردید میں ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

ھاجتک خالیۃ القصور | وشجتک آفلۃ البدور
وذکرت سکان الحمی | ونسیت سکان القبور
وبکیت بالدمع الغزیر | لباعث الدمع الغزیر
ولو اھب المال الکثیر | وناھب المال الاثیر
حامی الثغور الباسمات | مضیع آھلۃ الثغور

۱۔ تمھیں شاہی محلات کی ویرانی نے تڑپا دیا اور وہاں کے بدر کامل کے غروب نے تمھیں بہت رنجیدہ کیا۔

۲۔ تم نے وہاں کے محفوظ مقامات کے باشندوں کا تذکرہ تو کیا مگر وہ لوگ (جو اس کے ظلم

وستم کا شکار ہو کر قبروں میں دفن ہو چکے ہیں انھیں تم فراموش کر چکے ہو۔

۳۔ تم اس پر آنسو بہار ہے ہو جو (عوام) کو خوب رلانے کا ذریعہ بنا تھا۔

۴۔ تم اس کو رو رہے ہو جو دوسروں کا مال لوٹ کر لوگوں پر بخشش کرتا تھا۔

۵۔ سرحدوں کی حفاظت کرتا تھا مگر سرحد کے رہنے والوں کو تباہ و برباد کر رکھا تھا۔

ان اشعار کے بعد اس نے شوقی کی ذات پر براہ راست اس طرح حملہ کیا

لمّا اُدیلَ من السریر — بکاہ عُبّادُ السریر

اسِفوا علیہ و انّما — اسفوا علی المال الوفیر

(اور جب وہ تخت سے اتارا گیا تو تخت و تاج کے غلاموں نے اس پر آنسو بہائے انھوں نے اس پر اظہار افسوس کیا مگر حقیقت میں ان کا اظہار افسوس اس مال کثیر کی وجہ سے تھا جو انھیں ملا کرتا تھا اور اب یہ بخشش کا دروازہ بند ہو گیا ہے)

اس زمانے کی گوناگوں اور پیچیدہ سیاسی حالات کی بنا پر ولی الدین یکن کے لئے مشکل تھا کہ وہ خلافتِ عثمانی کے تعصبات اور ظلم و استبداد کے مقابلے میں انگریزوں کے جمہوری دور، اور ان کی حریت پسندی کی تعریف نہ کرے یہی وجہ ہے کہ مشہور عربی نقاد ڈاکٹر محمد مندور اپنے ایک مقالہ میں ولی الدین یکن کی شاعری کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے آخر میں یہ فیصلہ صادر کرتا ہے۔

"یہ حقیقت ہے کہ ولی الدین یکن کا زمانہ مختلف سیاسی نظریوں میں منقسم تھا اور لوگوں کا مختلف سیاسی نظریوں میں سے کسی ایک پر قائم رہنا بہت دشوار ہو گیا تھا وہ تذبذب کی حالت میں تھے اور صحیح راستہ معلوم کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا لہذا ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم ان ناگزیر اور نامساعد حالات اور ماحول پر اظہار افسوس کریں جنہوں نے سازش کر کے شاعر موصوف کو انگریزوں کے کیمپ کے قریب لا کھڑا کر دیا تاکہ وہاں جا کر خلافت عثمانی کے ظلم و استبداد سے بچ سکے اس چیز سے اس کی شہرت کو دھکا لگا اور اس

کی اس شاعرانہ اور ادبی عظمت کو نقصان پہنچا۔ جس کا وہ ایک عظیم شاعر اور عظیم انشار پرداز کی حیثیت سے مستحق تھا۔ تاہم وہ ایک خود دار اور حریت پسند انسان تھا جو کسی کی خوشامد کرنا نہیں جانتا تھا۔ اور فانی زندگی کی حقیر چیزوں کے حصول کے لئے اس نے اپنے قلم اور ذہانت کا کبھی بے جا استعمال نہیں کیا۔"[1]

رلی الدین یکن کے متعلق یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اس نے اپنا مقصدِ زندگی شاعر بننا اور اس میں کمال پیدا کرنا نہیں قرار دیا۔ وہ پیشہ ور شاعر نہیں تھا بلکہ اس نے ظلم و ناانصافی کے خلاف جہادِ مسلسل کا اسے ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔ نظری طور پر وہ ایک صحافی تھا جس نے اخبارات اور نثر کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا مگر زمانہ کی برائیوں کے خلاف اس کے جذبات اس قدر بھڑک چکے تھے کہ نثر کے سیدھے سادھے الفاظ اس کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوئے اس لئے وہ شدید قسم کے جذبات کو نظم میں ادا کرنے پر مجبور ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مضامین کے مجموعوں میں جو "الصحائف السود" "التجاریب" اور "المعلوم والمجہول" کے نام سے مشہور ہیں، ہر مضمون کا آغاز اپنے چند اشعار سے کرتا ہے جو اس کے گہرے اور شدید جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بہر حال وہ قید و بند کے مصائب اور سیاسی اور معاشرتی الجھنوں میں اس قدر گرفتار رہا کہ وہ اشعار کا بہت بڑا مجموعہ نہیں تیار کر سکا جس کی بنار پر اسے شوقی و حافظ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے تاہم اس کے اشعار کی سہل ممتنع زبان اور اس کے پُر خلوص جذبات پڑھنے والے پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی شاعری اور اس کی قلم خود اسے اپنی زندگی میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکی تاہم اسے یقین تھا کہ اس کے خیالات اس کی قوم کو ضرور فائدہ پہنچائیں گے اور جب ظلم و ستم کا تاریک دور ختم ہو جائے گا اس وقت اس کے ہم وطن عرب اور ترک اس کے خیالات اور اصلاحی تجاویز کی قدر کریں گے۔ اس امید کا اظہار اس نے اپنے ان دو شعروں میں کیا تھا جن کے متعلق اس نے یہ

---

[1] مجلۃ الادیب بیروت ماہ جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ نمبر ۸۷

وصیت کی تھی کہ وہ اس کے دیوان کے سر ورق پر اس کی تصویر کے نیچے درج کر دیئے جائیں وہ دو شعر یہ ہیں۔

مَا کَانَ اَھْنَانِی وَاَسْعَدَنِی   لوکان ینفع معشری قلمی

انا لی فوادہ ا نزھہ   لکن یُراقِبُ مایقول فمی

ا۔ میرے قلم نے میری زندگی کو خوش گوار نہیں بنایا کاش میرا قلم میری قوم کو فائدہ پہنچاتا۔

۲۔ میں اپنے دل کو بالکل پاک وصاف قرار نہیں دے سکتا مگر وہ الفاظ جو میرے منہ سے نکلتے تھے، دل ان کی نگرانی ضرور کرتا تھا۔[۱]

اپنی کتاب "المعلوم المجہول" کو شائع کرتے وقت اس نے یہ لکھا تھا "اس کتاب میں چند چیزیں بیان کی گئی ہیں اور چند چیزیں چھوڑ دی گئی ہیں دنیا کے حالات ایسے ہیں کہ انسان اپنے دل کی ہر بات کو صاف ظاہر نہیں کر سکتا۔ جب ظلم و ستم کی حکومتیں ختم ہو جائیں گی اور عوام عدل و انصاف کی نعمت سے بہرہ ور ہوں گے اس وقت وہ میری کتاب کو اطمینان سے پڑھیں گے اور اگر خداوند تعالیٰ نے ہماری قوموں کو اس سے زیادہ ترقی عطا کی اور اس وقت تک میں زندہ رہا تو اس وقت میں اپنے دل کی بات اشاروں کے بجائے صاف صاف بیان کروں گا۔

اسماعیل صبری | ولی الدین یکن کا معاصر مگر اس سے متضاد خصوصیات کا حامل اسماعیل صبری بھی ابتدائی دور کے جدید عربی شعراء میں بلند مقام پر فائز ہے یہ دونوں شاعر شوقی اور حافظ کی شہرت کے سامنے ماند پڑ گئے تھے تاہم جدید شاعری کے پیش رو کی حیثیت سے انھیں بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسمٰعیل صبری ۱۸۵۴ء میں بمقام قاہرہ پیدا ہوا ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مصری طلباء کی ایک جماعت کے ساتھ فرانس اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گیا وہاں اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی مصر واپس آ کر وہ جج مقرر ہوا اس کے بعد بتدریج حکومت کے اعلیٰ

---

[۱] محاضرات عن ولی الدین یکن از دکتور محمد مندور مطبوعہ مطبعۃ نہضۃ مصر قاہرہ۔

سرکاری عہدوں پر سرفراز ہوا۔

۱۹۰۷ء میں وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوا وہ مصر کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کی شاعری عوامی جذبات اور خیالات کی ترجمانی نہیں کرتی۔ مصر کے حوادث اور دنیا کے اہم واقعات کا اثر اس پر بالکل نہیں ہے وہ ڈرائنگ روم کا شاعر اور اعلیٰ مہذب طبقے کی "بزم خاص" کی شمع محفل بنا رہا ایک بڑی خصوصیت اس کے کلام کی یہ ہے کہ اس کی شاعری تڑپا دینے، سوز و گداز، اور شدید احساسات سے خالی ہے اس کا نرم و نازک کلام مکمل سکون اور ٹھنڈک بخشنے والا ہے، اور ولی الدین یکن کی طرح اس میں کسی قسم کی تلخی، شدت، احساسِ طنز اور مایوسی کا جذبہ نہیں ہے اسی طرح حافظ ابراہیم کے کلام کی طرح مصر کے حوادث اور اہم سیاسی واقعات سے بے نیاز ہے۔

اس نے فرانس میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی تھی تاہم اس کی ابتدائی شاعری عربی کے قدیم کلاسکل انداز میں رہی مشہور مصری نقاد زیات کے قول کے مطابق وہ عباسی دور کے مشہور جمالیاتی شاعر بحتری کا پیرو رہا اس مشہور شاعر کی طرح وہ عمدہ اور فصیح و نازک الفاظ اور اچھوتے خیالات اپنی شاعری میں پیش کرتا رہا اور ساری عمر محبت، حسن، دوستی، اور موت کے گیت گاتا رہا۔ اس کے نرم، نازک الفاظ اور فصیح اندازِ بیان بحتری کی یاد کو تازہ کرتے رہیں گے جس کے متعلق ابوالعلاء المعری کا مقولہ ہے کہ متنبی اور ابو تمام فلسفی ہیں مگر حقیقی شاعر بحتری ہے[۱]۔

اسماعیل صبری کے کان موسیقیت سے آشنا تھے اس لئے اس کے الفاظ و تراکیب میں موسیقیت اور ترنم ہے اس کی شاعری سراسر غنائیہ ہے اور اس لئے ابتدائی قصائد کو چھوڑ کر، عام طور پر مختصر نظمیں اور قطعات لکھے ہیں اور زبردستی شعر کہنے کی کوشش نہیں کی ہے جب اس کی طبیعت شعر کہنے پر آمادہ ہوتی تھی اس وقت وہ شعر کہا کرتا تھا۔

اس کا کلام مہذب شہریوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور خاص کر

---

[۱] تاریخ الادب العربی للزیات مطبوعہ مصر۔

وہ قاہرہ کے اس اعلیٰ طبقے کے سبک، نرم و نازک جذبات کا ترجمان ہے۔ جن میں تلخی، طنز اور جذبات کی شدت و گہرائی نہیں ہے۔ وہ ملک کی سیاست و معاشرت پر تنقید نہیں کرتا ہے اور نہ اسے قوم کے احساسات کی ترجمانی سے تعلق ہے۔ وہ صرف اپنے دل کے نازک جذبات کو اپنے اشعار میں پیش کرتا ہے جو عام طور پر دوستوں کی بے وفائی، ہجر و جدائی کی سوزش، اندرونی محبت کی کسک، فلسفہ، حسن و موت کے اظہار پر مشتمل ہیں یہاں تک کہ موت بھی اس کے نزدیک ڈراؤنی اور قابلِ نفرت نہیں ہے بلکہ اس کا خیال ہے کہ وہ شفیق ماں کی طرح انسان کی ہمدرد ہے اور اس کے رنج و غم کو دور کرتی ہے چنانچہ ایک موقع پر کہتا ہے

یاموت، ها انا ذا فخذ — ما ابقت الایام منی
بینی و بینک خطوۃ — ان تخطها فرجت عنی

۱۔ اے موت! میں تمھارے سامنے (موجود) ہوں (حادثات) زمانہ نے جو کچھ (طاقت) مجھ میں چھوڑ دی ہے وہ تم لے جاؤ۔

۲۔ میرے اور تمھارے درمیان ایک قدم (کا فاصلہ) ہے اگر تم (یہ قدم) عبور کر لوگی تو مجھے (ان تکلیفوں سے) نجات دوگی۔

وہ زندگی کی تکلیفوں سے اکتا کر موت کی مادرانہ آغوش میں پناہ لینے کے فلسفۂ حیات و ممات کو اس طرح بیان کرتا ہے

ان سئمت الحیاۃ فارجع الی الارض — تنم آمنا من الاوصاب

۱۔ اگر تم زندگی سے اکتا گئے ہو تو زمین کی طرف رجوع کرو۔ وہاں تم رنج و غم سے محفوظ رہ کر چین کی نیند سوؤ گے۔

تلک امٌ احنی علیک من الامّ — التی خلقتک للاتعاب

۲۔ وہ اس ماں سے بھی زیادہ تم پر مہربان ہے جس نے تمھیں تکلیفوں کے لئے پیدا کیا تھا۔

لا تخف فالممات لیس بماحٍ — منک الا ما تشتکی من عذاب

۳۔ ڈرومت! موت تمھیں نہیں مٹائے گی۔ البتہ وہ تمھاری تکلیفوں کو دور کردے گی۔

وحیاۃ المرءِ اغتراب فان مات　　　فقد عاد سالماً للتراب

۴۔ انسان کی دنیاوی زندگی ایک سفر ہے جب وہ مرتا ہے تو وہ صحیح وسالم اپنی زمین کے اندر واپس آجاتا ہے۔

اسماعیل صبری کے کلام کو اس کی خصوصیات کی بنا پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ اس کا ابتدائی کلام ہے جو قدیم طرز کے مطابق مصر کے بادشاہ اسماعیل پاشا اور توفیق پاشا اور دیگر امرار مصر کی مدح و تہنیت میں ہے۔ قدیم طریقے کے مطابق اس کی ابتدار، غزل اور تشبیب سے ہوتی ہے، یہ ابتدائی کلام اپنے قدیم طرز کے باوجود اس کی نادر الکلامی اور سلاستِ بیان کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اس کے کلام کا دوسرا حصہ ہی اس کی اصل خصوصیات کا آئینہ بردار ہے۔ وہ اپنے شعروں میں الفاظ کے انتخاب میں بہت محنت اور کاوش کرتا تھا۔ اور ان میں مناسب کانٹ چھانٹ اور چھان بین کے بعد بہت چھوٹی نظمیں کہا کرتا تھا۔ اس کے قطعات دو۲ شعروں سے چھ۶ شعروں تک ہوتے تھے[1]۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اس کے کلام میں سکون ہے۔ اس لئے وہ اپنے دشمنوں سے بھی انتقامی جذبہ کا اظہار نہیں کرتا ہے بلکہ صلح پسندی کا ثبوت پیش کرتا ہے چنانچہ اس بارے میں وہ یوں رقم طراز ہے

اذا خاننی خلّ قدیم وعقّنی　　　وفوّقتُ یوماً فی مقاتلہ سھمی

جب کبھی میرا پرانا دوست مجھ سے بے وفائی کرتا ہے اور میری نافرمانی کرتا ہے تو اس وقت میں تیر کمان لے کر اس سے جنگ کے لئے تیار ہوجاتا ہوں۔

تعرّض طیف الود بینی وبینہ　　　فکسّرتُ سھمی وانثنیت فلم ارمی

[1] جواہر الادب للہاشمی مطبوعہ مصر

مگر اس وقت قدیم محبت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں تیر کمان توڑ کر لوٹ جاتا ہوں پھر اس پر تیر نہیں چلاتا۔

آخر عمر میں جب وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا اور ادبی حلقے اسے بھول گئے تھے۔ تو ایسے موقع پر بھی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے خلاف اس کے دل میں کوئی تلخی نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس نے اپنے شعروں میں ان جذبات کا اظہار اس طرح کیا۔

أین صبری من یذکر الیوم صبری　　بعد أعوام عزلة وشهور

اسألوا الشعر فهو اعلم هل ۲　　اکلته الاسماک طی البحور

۱۔ صبری کہاں ہے؟ آج صبری کو کون یاد کرے گا جب کہ وہ کئی سالوں سے گوشہ نشین ہو گیا ہے

۲۔ تم شعر و شاعری سے دریافت کرو جو اس سے بہتر طریقے سے واقف ہیں کہ آیا اسے مچھلیاں سمندر کی تہہ میں کھا گئی ہیں یا نہیں!

اسماعیل صبری پر کون کون سے شعراء کے اثرات ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے بعض نقادوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چوں کہ صبری نے فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی اس لئے اس زمانے کے فرانسیسی ادب و شاعری کا اثر اس پر غالب ہے کیوں کہ اتفاق سے اس زمانے کی فرانسیسی شاعری اس کی طبیعت اور قاہرہ کے ماحول سے خاص طور پر مناسبت رکھتی تھی۔ بالخصوص وہ مشہور فرانسیسی شاعر لامارتین سے زیادہ متاثر ہے مشہور مصری نقاد عباس عقاد کی یہی رائے ہے۔ اس کے ثبوت میں اس کی وہ مشہور نظم پیش کی جاتی ہے جو اس نے سنہ ۱۹۰۱ء میں "لواء الحسن" کے نام سے شائع کرائی تھی جس میں اس نے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق حسن و محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

مگر مصر کے نوجوان نقاد ڈاکٹر مندور کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ انھوں نے لامارتین اور فرانسیسی ادب و شاعری کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ صبری کی اس نظم اور فرانسیسی شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے[1]

---

[1] ملاحظہ ہو مقالہ ڈاکٹر محمد مندور مجلہ الادیب بیروت مارچ ۱۹۵۶ء

اسماعیل صبری خوش قسمت انسان ہے کہ کچھ عرصے سے اس کی شاعری کی طرف بڑے بڑے نقادانِ فن متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس کے مخالف اور موافق دونوں اس پر تنقید کر رہے ہیں۔ چنانچہ مخالفین میں احمد محرم اور عمر دسوقی ہیں جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ تقلیدی شاعر ہے۔ ڈاکٹر محمد صبری اور ڈاکٹر محمد حسن ہیکل اور عقاد نے اپنی کتابوں میں شاعر موصوف کے ساتھ زیادہ انصاف کیا ہے۔ ڈاکٹر طہٰ حسین، انطون الجمیل، احمد امین احمد الزین نے اس کے دیوان پر مقدمات لکھ کر شاعر موصوف کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔[1]

مشہور عربی ادیبہ اور شاعرہ مس زیادہ نے صبری کی اصل خصوصیات کو معلوم کر کے اس کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے شاعر موصوف کے مندرجہ ذیل دو شعروں کو بہت پسند کیا ہے۔

اتصی فؤادی فما الذکری بنافعۃ ولا بشافعۃ فی رد ما کانا

سلا الفؤاد الذی شاطرتہ زمنا حمل الصبابۃ فاخفق وحدک الآنا[2]

۱۔ اے دل! تو یاد میں لگ کر کیوں کہ بہت یاد کرنا تو کچھ زیادہ فائدہ مند ہے اور نہ گذری ہوئی چیزوں کو لوٹانے کی سفارش کر سکتا ہے۔

۲۔ وہ دل نہیں رہا جو عرصہ دراز تک محبت کے بار گراں کو اٹھانے میں تیرا شریک تھا اس لئے اب تو تن تنہا دھڑکتا رہ۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے ان شعروں پر اس طرح رائے زنی کی ہے۔

"کیا تم (شعروں کی) اس روح سے زیادہ اور کوئی شیریں روح معلوم کر سکتے ہو اور اس جذبہ سے زیادہ اور کون سا جذبہ صادق ہو سکتا ہے جس کا لہجہ بہت ہی زیادہ نرم و نازک اور جس کی موسیقی بہت زیادہ لطیف اور شاندار ہو مصری عوام کے جذبات کی ترجمانی اس موسیقیت سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ اس سے پہلے شعر میں نافعۃ و شافعۃ کے الفاظ کو مناسب طریقے سے مربوط کیا گیا ہے۔ یہ دونوں الفاظ مصری عوام کی معمولی روزمرہ کی گفتگو سے ماخوذ

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ دیوان اسماعیل صبری ۳۵

ہیں مگر شعر میں انھیں استعمال کر کے یہ الفاظ نہایت شاندار طریقے سے بلند ہو گئے ہیں اور سادہ ہونے کے باوجود بہت بڑی عظمت حاصل کر گئے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر کوئی مغنی انھیں اپنے گیتوں میں شامل کر لے۔"[1]

ڈاکٹر محمد صبری اپنی کتاب میں اسماعیل صبری کی شاعری کی تحلیل و تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

"ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ صبری اپنے ہم عصروں میں غنائیہ شاعری میں منفرد ہیں۔ اس پر مزید ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ادب عربی میں اس کو اس بلند منصب پر سرفراز کرنے والے اس کے وہ قطعات ہیں جو آسمان کی بلندیوں میں گھومتے رہتے ہیں ان قطعات کی امتیازی خوبی صرف اس کے جدید اور نادر معانی تخیلات میں نہیں ہے جن کے بغیر لوگ اس کے اشعار کو سمجھ نہیں سکتے بلکہ ان قطعات کا نمایاں وصف اس روح میں پوشیدہ ہے جو ان میں سے چھن چھن کر نظر آتی ہے ان میں جذبات و احساسات کی ایسی پر سکون تصویر کھینچی گئی ہے جس میں تصنع کی آمیزش نہیں ہے یہ تصویر عقل سے پہلے قلب کو مخاطب کرتی ہے (قلبی جذبات کو اپنی طرف متوجہ کراتی ہے) اس کی شاعری اپنے حقیقی صاف چشمے سے سیراب ہے۔ کیوں کہ شعر شعور کا دوسرا نام ہے اور یہ عروضی اوزان محض ایک نغمہ ہیں"[2] (باقی آئندہ)

---

[1] مقدمہ دیوان اسماعیل صبری [2] ادب و تاریخ مطبوعہ قاہرہ، مصر

علوم قدیمہ کا تحفظ

از

جناب مولوی مرزا محمد یوسف صاحب استاذ عربی گورنمنٹ مدرسہ عالیہ رام پور

زیرِ نظر مقالہ اس خیال سے شائع کیا جارہا ہے کہ اس تقریب سے اصلاحِ نصاب کے مسئلے پر اُن اصحابِ علم کو بھی کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا جو فاضل مقالہ نگار کے طریق فکر سے اتفاق نہیں رکھتے۔

مضمون میں علومِ قدیمہ کے تحفظ اور درسِ نظامی کے درمیان جس طرح کا ربط ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بہت کچھ محلِ نظر ہے اور یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ مدارس عربیہ کے موجودہ جامد و خامد نصاب میں اصلاح و ترمیم کے بعد علومِ قدیمہ کے قابل حفاظت حصے کا تحفظ نہ ہوسکے، بہرحال اس موضوع سے متعلق مختصر اور جامع مقالات کے لئے "برہان" کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ "برہان"

مدارس عربیہ کی اصلاح اور اُن کے نصاب پر نظرِ ثانی کا مسئلہ عرصے سے بہی خواہانِ ملت کا موضوعِ فکر بنا ہوا ہے۔ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ اصلاح ہوتی ہی رہی ہے۔ آخر "درس نظامی" کی ابتدار بھی تو ملا نظام الدین کے ایک اصلاحی اقدام ہی کا نتیجہ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آج کل کی اصلاح قدیم اصلاحوں سے بنیادی طور پر مختلف ہوگی۔ پہلے زمانے میں ملک کے عام تعلیمی نظام میں مدارس عربیہ ہی کی ریاست تھی۔ آج یہ کیفیت بدل گئی ہے، یہاں تک کہ بعض مصلحین کے نزدیک تو یہ ایک دقیانوسی نظام ہے جسے بدلے ہوئے حالات میں ختم ہوجانا چاہئے (حالاں کہ یہ مایوسی بھی اتنی ہی غلط ہے جتنی گزشتہ صدی کی ہٹ دھرمی) اس کی وجہ حسب ذیل ہے۔

تعلیم معاشرتی نظام کے تابع ہوا کرتی ہے بالخصوص عمومی تعلیم ملک کی سیاسی و اقتصادی تنظیم میں رئیس نہیں بلکہ مرؤس ہوا کرتی ہے مسلمانوں کو اپنے عہد حکومت میں اپنی حکومتی مشینری چلانے کے لئے خاص قسم کے کاری گر درکار تھے۔ سماجی نظام اسلامی تھا اور اس کی مخصوص اقدار حیات تھیں اس لئے تعلیم اور نصاب کا ایک خاص انداز رہا۔ آخری مغل تاج داروں کے عہد میں طوائف الملوکی اور انتشار نے ملک کا جو معاشرتی مزاج بنا دیا تھا اُس کے لئے قدیم نظامِ تعلیم

میں تبدیلی کی ضرورت تھی، وہ ملا نظام الدین نے پوری کی۔ انگریزوں کے زمانے میں حکمرانوں کو ایک خاص قسم کے کل پرزے درکار تھے لہٰذا اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں اسی نہج پر بنیں اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اس مخصوص نظام کو چلانے میں حکمرانوں کا بہت اچھی طرح ہاتھ بٹایا۔ آزادی کے بعد معاشی و معاشرتی رجحانات بدل گئے ہیں اس لئے تعلیم کے متعلق بنیادی نظریات بھی بدل رہے ہیں اور ان بنیادی تبدیلیوں کا اثر تعلیمی نظام اور نصاب پر بھی پڑنا ناگزیر ہے اس کی تفصیل کا میں اہل نہیں اور نہ یہ میرے موضوع کے تحت آتی ہیں۔

انگریزوں کے عہد میں اگرچہ غدر نے مسلمانوں کی کمر ہمت توڑ دی تھی پھر بھی ان کی حمیتِ قومی نے اپنی قدیم تہذیب و ثقافت کے برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ پچھلی صدی میں قدامت و جدت کی کشمکش اور انگریزی تعلیم کی حرمت اور اس کے باوجود اس کی مقبولیت اسی جذبہ کا نتیجہ تھیں۔ اس کشاکش میں مدارس عربیہ نے اپنے وجود ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ وہ اس پر بھی مصر رہے کہ ملک کی عام تعلیمی ضرورتوں کے پورا کرنے کے ہم ہی ذمہ دار ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے یہاں نئی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام نہیں کیا البتہ نئی ضرورتوں کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اس میں اُن کو کہاں تک کامیابی ہو سکتی تھی۔

بیسویں صدی شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ عربی مدارس نے اپنی ہزیمت کو محسوس کیا۔ جنگ عظیم اور جنگ اعظم نے اس احساس میں شدت پیدا کی اور پچھلی صدی کے افراط کے ردِ عمل کے نتیجے میں ایک "نومیدی و مایوسی جاوید" کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس کیفیت کا اظہار کہیں مصلحین کے اندر عربی مدارس سے بیزاری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کہیں اُن کے اندر انقلابی تبدیلیوں کے مطالبے کی صورت میں لیکن نہ پچھلی صدی کا اصرارِ بے جا مستحسن تھا اور نہ یہ قنوطیت و تشاؤم پسندی ہی قابل ستائش ہے۔

اس سلسلے میں ایک اصولی حقیقت عموماً نظر انداز کر دی جاتی ہے ہر چند کہ معاشرتی ہیئت ترکیبی کے نتیجے میں عمومی تعلیم کا ایک خاص نظام پیدا ہونا فطری ہے مگر ایک ترقی یافتہ ملک کے لئے

عمومی تعلیم کے علاوہ اپنے افقِ ذہنی میں وسعت پیدا کرنا بھی ضروری ہے یعنی ملک کا ہر قسم کی معلومات سے آشنا رہنا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ملک کا ہر متعلم تمام عمومی و خصوصی مضامین سے واقف ہو۔ تمام خصوصی مضامین سے آشنائی تو درکنار، تمام عمومی مضامین سے واقفیت بھی تکلیف مالایطاق ہے۔ یورپ اتنا ترقی یافتہ ہے پھر بھی وہاں سب طالب علم بی ایس سی نہیں ہوتے بہت سے بی اے ہوتے ہیں یعنی سائنس جو یورپ کے مخصوص حالات کے پیش نظر وہاں عمومیت کا درجہ رکھتی ہے، اس سے اکثر طلبہ ناآشنا رہتے ہیں یا اتنے آشنا نہیں ہوتے جتنے اُن کے بی ایس سی ہم جماعت۔

جب تمام عمومی مضامین سے آشنائی ہر متعلم کے لئے ناگزیر و لابدی نہیں قرار دی جاسکتی تو جملہ خصوصی مضامین سے اُن کی واقفیت کا کیا سوال۔ لہٰذا خصوصی مضامین سے آشنائی صرف مخصوص طبقہ تک رہنا ضروری ہے۔ ہم اپنی اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ترقی یافتہ ملک کے لئے ہر خصوصی مضمون سے آشنائی فرض کفایہ ہے۔

مضامین تعلیم کے اس امتیاز کے بعد عربی مدارس کی حالیہ تاریخ پر پھر ایک نظر ڈالئے۔ زندگی کی اس دوڑ میں انھیں جو ہزیمت ہوئی اُس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جو مضامین مدارسِ عربیہ میں پڑھائے جاتے ہیں آج اُن کی نوعیت "خصوصی مضامین" کی ہے۔

لیکن چوں کہ ہمارا ملک ایک ترقی یافتہ ملک ہے اس لئے اس میں ان خصوصی مضامین کی تعلیم کا انتظام رہنا چاہئے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اس انتظام کی کیا شکل ہونا چاہئے یہ خصوصی مضامین کی نوعیت پر موقوف ہے جس کی تفصیل یہ ہے

خصوصی مضامین کی مختلف نوعیتیں ہیں:

اوّلاً وہ خصوصی مضامین جن کی سماج من حیث الکل کو ضرورت ہے لیکن ہر فرد اُس میں کمال حاصل نہیں کرسکتا جیسے پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے استعمال کے سلسلے میں تحقیقات، یا جن کی سماج کی اکثریت میں قدر ہے اگرچہ ہر فرد سے اُس میں تبحر کی توقع نہیں کی جاتی مثلاً فوٹوگرافی۔

دوسرے وہ خصوصی مضامین جن کی سماج من حیث الکل کو ضرورت نہیں ہے صرف اُس کا ایک حصہ اُس کا حاجتمند ہے مثلاً دینیات یا دھرم شاستر کی تعلیم، اول الذکر صرف مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے۔

تیسرے وہ خصوصی مضامین جو تاریخ کے کسی دور میں بہت مقبول تھے اور بہ نظرِ عزت دیکھے جاتے تھے انھیں بھی ذہنی جستجو کی تشفی کے لئے برقرار رہنا چاہئے۔ اگرچہ ان کے متخصصین کی تعداد بھی کم ہوگی۔ ان تیسرے قسم کے مضامین کی چند قسمیں ہیں

(الف) وہ مضامین جو سوسائیٹی کے لئے مضر ہیں مثلاً سحر جادو کہانت وغیرہ۔

(ب) وہ مضامین جو سوسائیٹی کے لئے مضر تو نہیں ہیں مگر ان کی ضرورت بھی نہیں ہے مثلاً امم بائدہ کی لسانیات

(ج) وہ مضامین جو کسی زمانے میں مفید تھے مگر جنھوں نے ترقی کر کے اب موجودہ عمومی مضامین کی شکل اختیار کر لی ہے مثلاً یونان کی ریاضی وہیئت مسلمانوں کا فلسفہ وغیرہ

عربی مدارس کے زیرِ درس مضامین تینوں قسموں کے تحت میں آتے ہیں۔ کیوں کہ درسِ نظامی کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

لسانیات، دینیات، معقولات۔

۱۔ ہندوستان جیسے ملک کو جو بین الاقوامی سیاسی توازن میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے باہر کے ہر ملک سے بالخصوص مشرق وسطیٰ سے ثقافتی تعلقات کے علاوہ ڈپلومیٹک تعلقات رکھنا ناگزیر ہیں۔ اس کے لئے ان ممالک کی زبان، کلچر اور قدیم تاریخ سے آشنائی ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کاشتکار اور مشین کار کے لئے سفارتی اداروں میں جانا ضروری نہیں ہے اس لئے چالیس کروڑ کی آبادی کو مصر و شام کی زبان، کلچر اور تاریخ کے مطالعے کی نہ ضرورت ہے نہ فرصت۔ لیکن بہر حال ملکی انتظام اور قومی وقار کے لئے ضروری ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ہمارے سفارت خانے زیادہ سے زیادہ عظیم الشان پیمانے پر قائم ہوں اور انھیں چلانے

کے لئے ہمیں ایسے افراد پیدا کرنا ہیں جو عربی زبان مسلمانی کلچر اور اسلامی تاریخ کے خصوصی ماہر ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان خصوصی مضامین میں زیادہ مہارت تامہ رکھتے ہوں بہ مقابلہ ملک کی درسگاہوں کے عمومی مضامین کے کیوں کہ جن اہم فرائض کی ادائیگی کے لئے وہ وہاں بھیجے جاتے ہیں اُن کی تکمیل بغیر ان خصوصی مضامین کے ناممکن ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مصر میں ہندوستانی قونصل خانہ کا ایک فرد حساب وہندسہ سے ناآشنا ہو یا ہندی میں کچا ہو اور پھر بھی وہ اپنے فرائض مفوضہ کو ادا کرسکے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ عربی زبان سے ناآشنا ہو (ورنہ وہ وہاں کے باشندوں کی بات نہیں سمجھ سکے گا) یا مسلم کلچر سے ناواقف ہو (ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کو شریعت اسلامیہ پر عمل کرتے دیکھ کر استعجاب یا ازدراء کا اظہار کرے اور اس طرح مودت کے بجائے منافرت کا موجب بن جائے) یا اسلامی تاریخ پر عبور نہ رکھتا ہو (ورنہ اندیشہ ہے کہ اُن کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں کوئی مضحکہ خیز بات کہدے اور اس طرح ہماری قومی جہالت کے طعنہ کا سبب بن جائے)

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اس قسم کے اہم فرائض کی ادائیگی کے لئے عربی مدارس کے طلبہ زیادہ خوش سلیقہ ثابت ہوسکتے ہیں اگرچہ وہ عمومی مضامین سے زیادہ واقف نہ ہوں۔

۲۔ ہندوستانی سماج کے ایک اہم طبقے کو جو ہرچند کہ اقلیت میں ہے لیکن بہرحال ایک اہم اقلیت ہے اپنے بچوں کی دینی تعلیم ضرور دلوانا ہے۔ یہ تعلیم اُس کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی سماج من حیث الکل کے لئے عمومی مضامین کی۔ اس لئے ایسے افراد کی تربیت ضروری ہے جو اس فریضے سے کماحقہ عہدہ برآ ہوسکیں۔ ظاہر ہے یہ مقدس فریضہ صرف عربی مدارس کے طلبہ ہی انجام دے سکتے ہیں۔

۳۔ تیسری قسم کے خصوصی مضامین میں سے جہاں تک (الف) کا تعلق ہے عربی مدارس کے نصاب میں اس قسم کا کوئی مضمون ہی نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں تک (ب) کا تعلق ہے اُن کے یہاں "قرون خالیہ" کی "السنہ" کی مد میں کچھ نہیں ہے ہاں جہاں تک (ج) کا تعلق ہے

متداول درس کا ایک اہم حصہ اس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے اس سلسلے میں پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں اس قسم کے مضامین کی تعلیم و تخصص کا کیا طریقہ ہے۔ عموماً وہاں ان مضامین کی تعلیم یا تو عام تعلیمی درس گاہوں میں ہوتی ہے یا خصوصی مدارس میں عام تعلیمی درسگاہوں کے ابتدائی مدارج میں طالب علم صرف عمومی مضامین ہی پڑھتا ہے۔ جامعی تعلیم کے ابتدائی سالوں میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے کسی خصوصی مضمون (مثلاً اسلامیات) کے مبادی کو لے لیتا ہے، بیچ کے سالوں (ایم اے) میں اس کا مستقل مطالعہ کرتا ہے اور آخری سالوں (ڈاکٹریٹ) میں اس کے کسی مخصوص پہلو پر تخصص کرتا ہے خصوصی مدارس عموماً تعلیم کے آخری مراحل پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں وہی طالب علم داخل ہو سکتے ہیں جنھوں نے عمومی مضامین میں ثانوی تعلیم حاصل کی ہو۔ باقی تشکیل عمومی درس گاہوں کی سی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں بعض یونیورسٹیوں نے (رج) کا بعنوان اسلامیات انتظام کیا ہے مگر بلا خوف لومۃ لائم کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تخصصین میں وسعت ہو تو ہو گہرائی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے مثلاً جو لوگ عربی کا متداول نصاب گھر پر پڑھے نہیں ہوتے اور یونیورسٹیوں میں بی اے یا ایم اے مسلم فلاسفی میں کرتے ہیں وہ فلسفہ اور دیگر علوم میں تو ماہر ہوتے ہیں لیکن اسلامی فلسفہ میں مدارس عربیہ کے طلبار کے ہم پایہ نہیں ہوتے۔ تاریخ فلسفۂ اسلام سے وہ بھلے واقف ہوں مگر مسائلِ فلسفیہ سے زیادہ واقف نہیں ہوتے اور اگر ہم اس بات کو بھی ملحوظ رکھیں کہ مدارس عربیہ کے طلبہ کی اوسط ذہانت ان جامعی طلبہ کی ذہانت سے بدرجہا پست ہوتی ہے (جس وجہ سے بھی ہو) تو یہ فرق اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے مضامین کا ہے مثلاً فقہ کے ضمن میں ایک کامیاب وکیل ہائی کورٹ کے نظائر سے زیادہ واقف ہوتا ہے مگر فقہار کے اختلافات اور وجوہِ استدلال سے نہیں۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ مدارس عربیہ کے پاس جادو کی چھڑی ہوتی ہے کہ جہاں گھمایا اور طالب علم بحر العلوم ہو گیا۔ نہیں اصل وجہ "کاربکثرت" ہے۔ اُن کے نظام تعلیم میں انھیں مضامین

پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے مثلاً منطق ابتدائی درجات ہی سے شروع ہوتی ہے اور پھر صغریٰ سے لے کر حمد اللہ اور قاضی مبارک تک طوعاً وکرہاً پڑھنا ہی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

گر نستانی بستم می رسد

طالب علم خواہی نخواہی بہت سی ایسی باتوں سے واقف ہو جاتا ہے جو مسلم فلاسفی کے ایم اے کو بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کہ وہ تین چار سال سے زیادہ ان مضامین پر صرف نہیں کرتا۔ اس کی معکوس مثال انگریزی اور ریاضی وغیرہ ہیں۔ بعض عربی مدارس میں منتہی طلبہ انگریزی پڑھتے ہیں مگر اُن میں یقیناً وہ لیاقت نہیں آتی جو ایک جونیر اسکول کے معمولی طالب علم میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ تکمیلِ نصاب کے سلسلے میں بعض طلبا خلاصۃ الحساب پڑھتے ہیں مگر وہ تمہر حاصل نہیں ہوتا جو پرائمری اسکول کے طالب علم کو ہوتا ہے۔

اس لئے اگر عربی مدارس اسلامیات میں تفوق کا دعویٰ کریں تو اس سے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہئے یہ تو "کار بکثرت" کا فطری نتیجہ ہے۔

بہر حال ایک ترقی یافتہ اور بین الاقوامی وقار کے مستحق ملک کی حیثیت سے ہمارے ملک کو عربی زبان کلچر اور تاریخ کی تعلیم کے لئے عربی مدارس کا قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ اسی طرح ان علوم کو برقرار رکھنے کے لئے جنھوں نے ترقی کر کے جدید سائنس و فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے ان مدارس کا وجود ناگزیر ہے اور یہ ایسا خیال ہے جس پر غور و فکر کرنے والے ذہن کو جلد یا بدیر پہنچنا ہے پھر جہاں تک مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا تعلق ہے ان مدارس سے بے اعتنائی یا بیزاری قومی خودکشی کے مترادف ہوگی۔

چند متعلقہ مسئلے

جب یہ امر ثابت و متحقق ہو گیا کہ ہر نقطۂ نظر سے مدارس عربیہ کی بقا ضروری ہے تو چند اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

متعلمین کا مستقبل۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ ان مدارس کا اور ان کے طلبہ کا ہماری سماجی زندگی میں کیا مقام ہے۔ بدقسمتی سے معاشرتی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور اقدار حیات ابھی تک متعین نہیں ہو پائیں۔ اس کے نتیجہ میں بہت سی باتیں ایک غیر متیقن حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ پھر بھی اس مسئلے کو حل کرنا ہی ہوگا۔

میں نے کہا تھا کہ ان مدارس کی تین حیثیتوں سے ضرورت ہے۔ سماج کے لئے انتظامی امور کے واسطے، مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم کے واسطے ملک کے لئے تنقیف اور اُفقِ ذہنی کی وسعت کے واسطے

پہلی غرض سے ان کی نگہداشت سماج من حیث الکل اور حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت مختلف قسم کے تعلیمی ادارے محض حکومتی اغراض کے لئے چلاتی ہے جن کے مصارف محض خزانۂ عامرہ ہی سے پورے کئے جاتے ہیں اور جن کے فارغ التحصیل متعلمین کے معاشی مستقبل کی ضمانت حکومت اپنے ذمہ لے لیتی ہے یہی اصول یہاں بھی کارفرما ہونا چاہیے۔ فرق اتنا ہے کہ مروجہ خصوصی درس گاہوں میں صرف اتنے ہی طلبہ کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے جن کی حکومت کو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے ضرورت ہوتی ہے یہاں طلبہ کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی اس لئے اصول یہ ہونا چاہیے کہ حکومت مشرقِ وسطیٰ کے لئے سفارتی اغراض کے واسطے اہلکاروں کا انتخاب مدارس عربیہ کے طلبہ ہی میں سے کرے یا یہاں کے منتخبین کا ایک کوٹا مقرر ہونا چاہیے۔ آخر انتظامی ملازمتوں کے لئے بھی تو اہلکاروں کا انتخاب جامعات ہی کے طلبہ سے ہوتا ہے۔

دوسری غرض سے ان مدارس کی نگہداشت صرف مسلمانوں ہی کے ذمہ ہے۔ اُنہیں اپنے بچّوں کو دینی تعلیم ضرور دلوانا ہے اس لئے ایسے افراد کی تربیت کی ضرورت ہے جو اس فریضہ سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہو سکیں۔ لہٰذا ایسے اداروں کی بھی ضرورت ہے جو ایسے افراد تیار کرسکیں۔ اس مسئلے کو دو نقاطِ نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔

اولاً: جو افراد عربی مدارس سے فارغ ہو کر نکلیں اُن کے لئے روزگار مہیا کرنے کے لئے مسلمان بچّوں کی مذہبی تعلیم کا دھندا تلاش کریں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مصنوعی تنفس کے ساتھ مدارس

عربیہ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اصول زیادہ عرصے نہیں چل سکتا۔

ثانیاً سماج کے ایک اہم طبقہ کی مخصوص تعلیم کے لئے معلمین کی تیاری کے واسطے چند خصوصی اداروں کی ضرورت ہے اس طرح عربی مدارس خود اپنے افادی استحقاق کی بنا پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اگرچہ سوال یہاں بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ان متعلمین کا مستقبل کیا ہوگا مگر اب "طلب اور رسد" کے اصول پر اسے حل ہونا چاہئے۔ اس کے لئے پہلے احساسِ طلب میں شدت پیدا ہونا چاہئے یعنی سماج کے ایک اہم طبقے کی تعلیم کے لئے ایک مخصوص نوع معلمین کی ضروری ہے۔ اگر یہ شدتِ احساس پیدا ہو جاتی ہے تو خود سماج کو اُن کا کفیل ہونا پڑے گا۔ براہِ راست یا بتوسط نمایندہ حکومت

تیسری غرض سے یہ امر مسلم ہے کہ اُن علوم قدیمہ کو برقرار رہنا ہے جن کی ترقی یافتہ شکل موجودہ سائنسی اور فلاسفی ہیں۔ اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک ملی دوسری ثقافتی۔

ملی حیثیت سے ان کی نگہداشت اُس ملت کا فرض ہے جس کے اسلاف نے ان علوم و فنون کی ترقی میں خون پسینہ ایک کیا ہو۔

ثقافتی حیثیت سے ملک کی نمایندہ حکومت کا فرض ہے کہ ایک ترقی یافتہ ملک میں جہاں جملہ علوم وفنون کی سرپرستی کی جاتی ہے ان علوم کی بھی سرپرستی کرے اور ان کے تحفظ و بقا کے لئے ٹرسٹ قائم کرے۔

۲۔ مدارس عربیہ کی نگہداشت: یہ مسئلہ اوپر حل ہو گیا بعض حیثیتوں سے ان کی نگہداشت کی ذمہ داری کلیتاً حکومت پر ہے اور بعض جہتوں سے صرف مسلمانوں پر اور بعض حیثیتوں سے دونوں پر۔ اس لئے ہرچند کہ ان کی ذمہ داری کلیتاً حکومت پر عائد نہیں ہوتی لیکن پھر بھی حکومت کو فراخ دلی سے ان کی مالی مشکلات میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔

۳۔ مدارس کا انتظام: باوجود ان مدارس کی دینوی افادیت کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس پر اصرار کرے گا کہ یہ مدارس خالصتہً لوجہ اللہ خدمت کرتے رہیں اور اسی جذبے کے ماتحت انھیں باقی رہنا چاہئے۔ یہ جذبہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہے اور جو مدارس اس جذبے کے تحت چلنا چاہتے ہیں

اور اپنے مخصوص مصالح یا دیرینہ روایات کے ماتحت حکومت کی امداد سے مستغنی رہنا چاہتے ہیں وہ حسب سابق آزادانہ چلتے رہیں۔

لیکن بدلے ہوئے حالات میں سب مدارس تو حکومتی اعانت سے مستغنی نہیں رہ سکتے۔ اکثریت حکومتی امداد کی خواہاں ہے بالخصوص جب کہ ملک میں اپنی ہی حکومت قائم ہے اور حکومتی امداد ٹیکس دہندوں ہی کی بالواسطہ اعانت ہے۔ اس لئے ان کے نظم وضبط کارکردگی اور حساب کتاب کی نگہداشت کے لئے مقامی ذمہ داروں کی مشترکہ ذمہ داری ہونی چاہئے۔ اور اس کے لئے حکومت کی بالادستی ضروری ہے اس لئے نہیں کہ حکومت اس بالادستی کے توسط سے ان مدارس کی پالیسی میں مداخلت کر سکے بلکہ اس لئے کہ بصورت فساد و انتشار اس کا ازالہ کیا جا سکے نیز ان کی جائز ضرورتیں حکومت سے پوری کرائی جا سکیں۔

۴۔ نصاب کی اصلاح: موجودہ نصاب میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ بنیادی تبدیلی سے میری مراد یہ ہے کہ بعض علوم کو عملاً نصاب سے محض اس بنا پر خارج کر دیا جائے کہ ان کی افادیت ان سے زیادہ ترقی یافتہ علوم کے پیش نظر ختم ہو چکی ہے۔ اس قسم کا "مبنی بر افادیت" اصول تو عمومی درس گاہوں کی تنظیم جدید کے سلسلے میں ملحوظ رہنا چاہئے۔ یہاں اصولی مسئلہ عملی زندگی کے لئے مفید نصاب بنانے کا نہیں ہے بلکہ اصل الاصول علوم قدیمہ کا تحفظ ہے جو ہمارے اسلاف کی ذہنی و فکری کاوشوں کا ایک بیش قیمت ورثہ ہیں۔

اس کے ساتھ متداول درس میں چند فنون اور بڑھانے ہوں گے۔ لسانیات کے سلسلے میں طلبہ کو جدید عربی سے آشنا کرانا ہے جو اس وقت ممالک عربیہ میں مستعمل ہے جو طلبہ اس کے اہل اور شائق ہوں اُن میں جدید عربی بولنے اور لکھنے کی مشق اور تاریخ ادب کے سلسلے میں ممالک عربیہ کی انیسویں بیسویں صدی مسیحی کی ادبی وثقافتی تحریکات سے واقفیت ضروری ہے۔

دینیات کے سلسلے میں عہد حاضر کی لادینی وملحدانہ نیز دیگر معاشی ومعاشرتی تحریکات کا کم از کم سرسری مطالعہ ضروری ہے تاکہ اس پس منظر میں اسلام کی افادیت ومقبولیت کو سمجھا

اور سمجھایا جاسکے۔ اس طرح ایک نئے علم کلام کی ضرورت بھی پوری ہوسکے گی۔

معقولات کے سلسلے میں اور اسی طرح جملہ علوم کے سلسلے میں اُس پس منظر کے واضح کرنے کی ضرورت ہے جس کے اندر یہ علوم وفنون ظہور میں آئے۔ سماج کی خدمات انجام دیتے رہے اور ترقی پاکر موجودہ سائنس اور فلسفہ کی شکل میں منتقل ہوئے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے

اولاً: تاریخی تعارف کے لئے عمومی تاریخ اور ہر مضمون سے متعلق اُس کی خصوصی تاریخ کا اضافہ ہونا چاہئے۔

ثانیاً: موجودہ درس نظامی اس دور کا ساختہ و تیار کردہ ہے جب کہ اسے افادی حیثیت سے بنایا گیا تھا اور اس لئے متاخرین کی شروح و متون داخلِ درس کی گئی تھیں۔ اب چونکہ بنیادی نقطۂ نظر ہی بدل رہا ہے اور اس نصاب کے ایک معتدبہ حصے کی حیثیت افادی کے بجائے تاریخی و ثقافتی قرار دی جارہی ہے تو متاخرین کی شروح و متون کے ساتھ ساتھ متقدمین کی مصنفات بھی مناسب مقام پر داخل درس کی جائیں مثلاً فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعدیہ اور میبذی وصدرا کے ساتھ ساتھ شیخ بوعلی سینا اور فارابی وغیرہ کی مصنفات بھی شامل کی جائیں ریاضی میں تصریح و شرح چغمنی کے ساتھ ساتھ شرح تذکرہ مجسطی قانون مسعودی اور صور الکواکب وغیرہ شامل کئے جائیں۔ اسی طرح اصولِ فقہ میں نور الانوار توضیح تلویح اور مسلم الثبوت کے ساتھ جو آٹھویں صدی کے بعد کی تصانیف ہیں تحریر، اصول بزدوی، اصول سرخسی بھی مناسب مقام پر شامل کی جائیں کلام میں شرح عقائد نسفی کے ساتھ طوالع، محصل، التمہید للباقلانی وغیرہ داخل کی جائیں۔

لیکن اس اضافے کے ساتھ یہ اصول ملحوظ رہے کہ موجودہ درس نظامی ہر چند کہ اپنی افادیت کھو چکا ہو پھر بھی کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے اور جس اضافہ کی میں تجویز کررہا ہوں اس کی افادیت مشکوک ہے لہٰذا موجودہ درس کو سر دست علیٰ حالہ لازمی رہنے دیا جائے اور اضافہ مجوزہ کو بطور اختیاری مضمون داخلِ درس کیا جائے۔ دونوں کی اضافی افادیت کو زمانہ آگے چل کر متعین کردیگا فیصلے کی روشنی میں نیا نصاب متعین ہوگا۔

رفاہ عام

از

(جناب مولوی محمد انظر شاہ صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند)

(۴)

راستوں کی حفاظت پھر نہ صرف سڑکوں کا جال بچھا دیا اور ان کو ہموار بنا کر مصفّٰی کیا اور آرام کی بقیہ تمام صورتیں بہم پہنچائیں۔ بلکہ سب سے بڑا کارنامہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ راستوں کو مامون و محفوظ کرنے کے لئے زبردست حفاظتی اقدامات کئے گئے اور اس طرح ہزاروں لاکھوں راہ گیر اور مسافروں کی مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری لے کر سفر کے پرصعوبت اور وحشت ناک مراحل ان کے لئے آسان کر دیئے۔ سڑکوں اور راستوں کی حفاظت سے صرف انسانوں کی جان ہی محفوظ نہیں ہوتی۔ بلکہ خوراک کے وہ انبار جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل کئے جا رہے ہیں جس سے لاکھوں انسانوں کی زندگی اور موت کا سوال وابستہ ہے اس کو منتقل کرنے کے محفوظ ذرائع میسر آتے ہیں اور اسی طرح سینکڑوں وہ اشیاء جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کی جاتی ہیں ان کو بھی پہنچانے کے لئے مامون اور پرامن راستے تیار ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ اسی طرح کے سینکڑوں فوائد ہیں جن کا حصول صرف پرامن اور محفوظ راستوں ہی پر موقوف ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے رفاہی تذکروں میں راستوں کی حفاظت کے اہتمام کی اطلاعیں بکثرت ملتی ہیں چناں چہ مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں میں کسی بھی علاقہ میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ وہاں حکومت مسلطہ راستوں کی حفاظت نہ کر سکی سوائے ایک صحرائے خراسان کے کہ وہاں پر خاطر خواہ حفاظتی اقدامات نہ ہو سکے ابن حوقل نے خراسان کے اسی صحرا کے متعلق لکھا ہے

"یہ ایسا لق و دق غیر آباد صحرا ہے کہ ان نشانات کے سوا جو حکومت کی جانب سے تھوڑی

تھوڑی تھوڑی دور پر قائم کر دیئے گئے ہیں کسی اور چیز سے نہ منزل کا پتہ چلتا ہے اور نہ مقام کا"

(ابن حوقل بحوالہ ہزار سال پہلے ص۲۱۱)

ابن حوقل کے بیانات سے اتنا بھی ضرور معلوم ہوا کہ حکومت نے نشانات وغیرہ لگا کر راہ نمائی کے کچھ ممکن طریقے نکالنے کی کوشش بھی کی تھی نیز اسی سیاح کے بیانات سے اس کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ آخر یہ حصہ اس درجہ مخدوش کیوں تھا؟ ابن حوقل لکھتا ہے کیوں کہ اس صحرا میں نہ زیادہ بستیاں ہیں اور نہ ان کے رہنے والے، اسی لئے خراساں کے اس صحرا میں اس درجہ حالات خراب نظر آتے ہیں۔ نیز اس علاقہ میں مطلوبہ زبردست حفاظتی اقدامات کے نہ ہونے کی ایک خاص وجہ ابن حوقل یہ بھی بتاتا ہے

"اس صحرا کا تعلق کسی خاص اقلیم اور علاقے سے نہیں اگر کسی اقلیم و علاقہ سے اس کا تعلق ہوتا تو اس وقت اس اقلیم کی حکومت اس کے حفاظت کی ذمہ دار ہوتی"

لکھا ہے

"مشکل یہ ہے کہ اس صحرا کے چاروں طرف مختلف اور متعدد حکومتوں کی سرحدیں پھیلی ہوئی ہیں۔ متعدد سلاطین کے قبضہ میں صحرا کا یہ حصہ ہے" (ایضاً)

چناں چہ یہ حصہ۔ قومس، سجستان، کرمان، فارس، اصفہان، قم، کاشان، رے وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے اور ہوتا ہے یہ کہ راہ زن

کسی ایک علاقہ میں کوئی فساد کرتے ہیں تو دوسرے علاقہ میں جاکر پناہ گزیں ہوجاتے ہیں — فَاِذا افسد لقاطع فی عمل دخل فی عمل آخر (ابن حوقل ص۲۸۵)

گویا کہ بالکل وہی انتشار اور بدنظمی جو آج کل ہندو پاکستان کی بعض سرحدوں پر ہو رہی ہے چناں چہ ہندوستان کا مشہور ڈاکو بھوپت جس طرح ہندوستان میں بعض ڈاکے اور سفاکانہ حملوں کے بعد پاکستان کے حدود میں داخل ہوگیا۔ اس کی تفصیلات اخبار دیکھنے والے لوگوں کے سامنے ہیں۔ بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خراسان کے اس لق و دق صحرا میں یہ جو بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔

اصل نتیجہ تھی طوائف الملوکی اور کسی ایک حکومت کے قائم نہ ہونے کا، میری ان تفصیلات کی روشنی میں جو ابن حوقل کے متعدد بیانات کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے اس کو دیکھنے کے بعد خراسان کے اس علاقہ میں اس بے حفاظتی کا الزام مسلمانوں پر صحیح نہ ہوگا اور اس کے باوجود سیاح کے بعض بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی حفاظتی اقدامات ضرور کئے گئے تھے اگرچہ وہ ضرورت کے مطابق نہیں تھے جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ آیا ہوں۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ وہ دو مرتبہ اس صحرا سے گذرا ایک مرتبہ قافلہ کے ساتھ اور دوسری بار مسافروں کی ایک چھوٹی سی ٹولی کی رفاقت میں اور دونوں مرتبہ وہ اس صحرا سے بخیر و عافیت گذرا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خراسان کے اس علاقہ میں کچھ زیادہ اور وحشت ناک ابتری نہیں پھیلی ہوئی تھی بلکہ حالات بھی قابو سے باہر نہ تھے تاہم راستوں کی حفاظت کا وہ اہتمام جو مسلمانوں کا امتیاز ہے اس کی واقعی شکل یہاں پر موجود نہ تھی'

ولید بن عبدالملک جس نے اپنے رفاہی کاموں سے خلافت راشدہ کے دور کی یاد تازہ کردی تھی لکھا ہے کہ اس کے پاس اطلاع پہنچائی گئی کہ انطاکیہ[ع۵] اور مصیصہ کے درمیانی علاقوں میں شیروں کی کثرت ہوگئی ہے جس کی وجہ سے راہ گیروں کے لئے راستوں پر چلنا دشوار ہوگیا، اسی وقت ولید نے حکم دیا کہ شیروں کو ختم کردیا جائے، شیروں کو پھانسنے کے لئے جو جانور بھیجے گئے تھے ان کی تعداد کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

ع۵ دمشق کے بعد انطاکیہ اور آب و ہوا کے اعتبار سے خوش گوار علاقہ اسلامی مفتوحہ علاقوں میں انطاکیہ ایسا کوئی نہ ہوگا اس کے کوچہ و بازار قصور و محلات میں پانی دوڑتا پھرتا ہے۔ پن چکیاں خیابان اور ہر قسم کی زراعت و کھیتیاں موجود ہیں۔ العتبی کپڑا یہاں نہایت اعلیٰ درجہ کا بنایا جاتا ہے رستوائی اور اصفہانی طرز کے کپڑے بھی یہاں بنائے جاتے ہیں حمص، معرۃ، مصر میں جس طرح سانپ اور بچھو داخل نہیں ہوتے اسی طرح انطاکیہ میں بھی داخل نہیں ہو سکتے حبیب نجار کا مقبرہ بھی اسی خوب صورت شہر میں ہے۔ ۶۳۹ء میں یہ علاقہ اسلامی مفتوحہ علاقوں میں داخل کیا گیا تھا۔

"چار ہزار بھینس اور بھینسے اس طرف بھیجے گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے نفع پہنچایا۔" فوجه اربعة آلاف جاموس وجاموسة فنفع اللہ عزوجل (الہمدانی ص۱۱۶)

یعنی شیر اس علاقہ کے اس طرح ختم کردیئے گئے۔ ابوالفدا نے اسی واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ اس طرح ملک شام میں پہلی مرتبہ بھینس داخل ہوئی۔ یہی مسلمانوں کا وہ امتیاز ہے جو رفاہ عامہ کی دلچسپیوں میں ان کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے کوئی ٹھکانہ ہے ولید کی اس بلند حوصلگی کا کہ بے تامل صرف ایک راستہ کو پُرامن بنانے کے لئے چار ہزار جانور بھیج دئے گئے۔ ابوالفدا نے لکھا ہے کہ ان جانوروں کے ساتھ بنجارے بھی روانہ کئے گئے تھے۔ اس اہتمام پر جو کچھ خرچ ہوا اس کا کم سے کم تخمینہ لگا کر کچھ بھی سوچئے کہ رفاہیت کے شاندار کارنامے جو مسلمانوں کی تاریخ کا ایک فرزاں باب ہے کیا اس کی مثال اقوام کی تاریخ میں موجود ہے؟

بحری راستوں کی حفاظت بری راستوں کے ساتھ، بحری گذرگاہوں کے لئے بھی حفاظتی اقدامات کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں ملتا ہے چنانچہ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ نہرالابلہ کے قریب ایک گرداب عظیم تھا یہاں پر پانی کی گہرائی کی بھی انتہا نہ تھی یہی وجہ تھی کہ جہاز سمندر کے تمام حصوں سے خیروخوبی کے ساتھ گذرے لیکن جوں ہی اس جگہ پہنچتے تو ڈوب جاتے اور آدمیوں کے ساتھ ہزاروں اور لاکھوں کا سامان برباد ہو جاتا، گرداب عظیم کی اسی ہلاکت خیزی کی اطلاع جب ہارون رشید کی بیوی زبیدہ کو پہنچائی گئی تو

"زبیدہ نے پہلے کشتیوں کے ذریعے قابو پانے کی کوشش کی اور آخر میں چٹانوں سے اس کو بھروا دیا۔ اس طرح بحری مسافر اس گرداب سے محفوظ ہو گئے" (ابن حوقل ص۱۶۰)

اسی طرح بحری قزاقوں سے بھی حفاظت کا انتظام کیا گیا تھا جیسا کہ مقدسی نے لکھا ہے

"ہر جہاز میں جنگی سپاہیوں کا اور ان لوگوں کے ایک گروہ کا ہونا ضروری ہے جو نفط (پٹرول) کے دشمن پر آگ پھینکتے ہیں" ولابد فی کل مرکب من مقاتلة ونفاطین ص۱۳

بہرحال بحری اور بری راستوں کی حفاظت کے ایسے مؤثر انتظامات کئے گئے تھے کہ راہ گیر

بڑے اطمینان کے ساتھ سفر کر سکتے تھے اور مسافرت کے عالم میں ان کی جان و مال کے سلسلہ میں کسی خطرہ کا امکان نہ تھا۔

سرائیں راہ گیروں اور مسافروں کے لئے پُرامن راستوں کے علاوہ مسلمانوں نے جابجا سرائیں بھی بنوائی تھیں تاکہ سفر کے دوران مسافر آرام کے ساتھ چند روز قیام بھی کر سکیں ولیدہی کے متعلق اطلاع دی گئی ہے

"اس نے مسافروں کے لئے سرائیں بنوائیں۔" (تاریخ امت ۳ صفحہ ۱۲۷)

مہدی نے قادسیہ سے زبالہ تک کی سراؤں کی مرمت کرائی جس کے متعلق پہلے میں ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے سمرقند کے عامل سلیمان ابن ابی السری کے پاس فرمان بھیجا

"وہاں کے شہروں میں سرائیں تعمیر کراؤ اور جو وہاں سے گذریں ان کو یک شبانہ روز کھانا کھلاؤ۔ مریض ہے تو دو روز ٹھہراؤ، ان کے سامان اور گھوڑوں کی حفاظت کرو۔ اگر اپنے گھر تک جانے کے لئے ان کے پاس کرایہ نہ ہو تو کرایہ کا انتظام کرو۔" (سیرت عمر بن عبد العزیز صفحہ ۱۱)

سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق مورخ لکھتا ہے

"سراؤں کی تعمیر کر کے ان پر اوقاف بھی مقرر کئے گئے تھے۔" (سیرت ایوبی صفحہ ۲۰۹)

گویا کہ مسافروں کے اخراجات کے لئے ایک متعین رقم بھی دی جاتی تھی تاکہ راہ گیر نہ صرف ٹھہرنے کی جگہ ہی پا سکیں بلکہ دوسری ضرورتوں کو بھی سلطانی وظیفہ سے مہیا پائیں اس سلطان کشور کشا کے داد و دہش اور رفاہی کاموں کی تاریخ اس درجہ دلچسپ ہے کہ صفحہ صفحہ پر رفاہیت کے تذکرے نظر آتے ہیں جن میں سے کچھ ہم بھی جستہ جستہ ذکر کریں گے۔

ابن حوقل نے اسلامی علاقوں میں چل پھر کر سراؤں کا جو انتظام اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس پر وہ لکھتا ہے

"کوئی شہر یا کوئی گذرگاہ جس میں لوگوں کی آمد و رفت ہو یا کوئی آباد گاؤں ایسا نہیں ہے جس

میں بڑی بڑی سرائیں بنی ہوئی نہ ہوں۔ اتنی بڑی کہ اُترنے والوں کے بعد جگہ باقی بچ رہتی ہے (ص ۳۲)

اور ماوراء النہر کے متعلق تو اس نے یہ حیرت انگیز اطلاع دی ہے

"صرف اس علاقے میں دس ہزار سے اوپر سرائیں ہیں"

اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھتا ہے

"بہت سی سرائیں تو ایسی ہیں جن میں اس کا انتظام ہے کہ مسافروں کو اور ان کے جانوروں کو کھانا، چارہ سرائے ہی کی طرف سے دیا جاتا ہے"

فی کثیر منہا اذا نزل النازل اقیم علف دابتہ وطعامہ

(ابن حوقل ص ۳۹۰)

مسافر خانے جس طرح ان سراؤں کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے کیا گیا تھا اسی طرح آرام دہ مسافر خانوں کی تعمیر اور ان کے متعلقہ انتظامات سے بھی مسلمان عام طور پر دلچسپی لیتے رہتے بلکہ رفاہِ عام کے یہ چند شعبے ایسے ہیں کہ علاوہ حکومتوں کے عام مسلمانوں نے بھی اپنے وسائل و ذرائع کی حد تک اس قسم کے انتظامات میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسافروں کو آرام پہنچانے اور زیادہ سے زیادہ ایسی سہولتیں ان کے لئے مہیا کر دینا جس سے وہ غربت میں بھی خود کو وطن میں سمجھیں اور مسافرت کا وحشتناک تصور ان کے لئے جانگسل نہ ہو۔ اس قسم کے ترغیبی مضامین احادیث میں بکثرت ہیں جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسافروں کو تمام سہولتیں پہنچانے کا یہ غیر معمولی جذبہ غالباً آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا کردہ ہے۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے مسافر خانہ معقول شکل و صورت اور درشست انتظام کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنوایا، جیسا کہ لکھا ہے

"مسافروں کے لئے سب سے پہلا مسافر خانہ عمر بن الخطاب نے بنوایا اور اس کی تقلید عثمان رضی اللہ عنہ نے کی"

(یعقوبی جلد ۲ ص ۲۳۵)

ولید نے بھی مہمان خانے تیار کرائے جیسا کہ اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

"شہروں میں مہمان خانے بنوائے" (تاریخ امت ج ۳ ص ۱۲۶)

سنوسی زاویے | میں نے ابھی لکھا تھا کہ مسافر نوازی میں حکومتوں سے زیادہ عام مسلمانوں نے بھی حصہ لیا ہے چنانچہ اس دعوی کی شہادت کے لئے امیر شکیب ارسلان کے اس سفرنامہ کو جو طرابلس کی سیاحت سے متعلق انھوں نے قلم بند کیا ہے، پیش کرتا ہوں۔ سینوسیوں نے جو زاویے اور خانقاہیں لق ودق صحرا میں تیار کی تھیں اور جن کو اپنے حسن انتظام سے باغ و بہار بنا رکھا تھا اسی کے متعلق امیر لکھتے ہیں کہ

"مسافر، راہ گیر یا فقیر محتاج ان زاویوں میں سے کسی زاویہ میں اتر جاتے ہیں پھر جب تک ان کا جی چاہتا ہے اس وقت تک قیام کرتے ہیں، مہمان بنے رہتے ہیں ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھتا"

ان الغریب والسائل او الفقیر المعتر لنزل بزاویۃ من ھذہ الزوایا فیقیم ما یشاء ویتضف ما یشاء ولا یسألہ احد عن شی (ص ۱۱)

امیر کے ان الفاظ سے کہ "جب تک جی چاہتا مہمان بنے رہتے" ظاہر ہے کہ ان کے کھانے پینے اور بقیہ تمام ضروریات کا انتظام انھیں زاویوں کی طرف سے ہوتا۔ اس کی بھی اطلاع دی گئی ہے کہ ہر قبیلہ کا زاویہ علیحدہ ہوتا۔ اور مہمان کو اپنے، اپنے زاویہ میں ٹھہرانے پر سب ہی مصر ہوتے اور یہ صرف سینوسی ہی کے لوگوں کا طرز نہیں تھا بلکہ اقطار عالم میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کا ایک زمانہ میں تمدن یہی تھا چنانچہ ابن حوقل نے ماوراء النہر کے مسلمانوں کے متعلق لکھا ہے

"عموماً یہاں کے ارباب ثروت و دولت اپنی دولت کا بڑا مصرف سرائیں بنوانے کو سمجھتے ہیں" (ص ۳۲۹)

مہمان نوازی | کثرت سے ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان علاوہ سرائی اور مسافر خانوں کے مہمان نوازی میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے اور جس فراخ دلی سے مسافر نوازی کرتے اس کی مثال نہیں مل سکتی چنانچہ ابن حوقل خراسان کے علاقہ کے ایک رئیس جعفر بن سہل کے متعلق لکھتا ہے

"پچاس سال کی مدت میں کوئی ایسا آدمی نہ ہوگا جو خراسان پہنچا ہو اور اس امیر کے بذل و نوال سے مستفید نہ ہوا ہو۔"

امیر نے مہمانوں اور مسافروں کو آرام پہنچانے کی جو تدابیر کی تھیں ان کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

"سراؤں میں گائیں پلی ہوئی ہیں منیجران کا دودھ نکلواتے ہیں اور مسافروں کی تواضع خالص دودھ سے ہوتی ہے ہر سرائے میں تقریباً سو سو گائیں رہتی ہیں اور گرمیوں میں انواع و الوان کھانوں کے علاوہ لسی کا بھی مسافروں کے لئے انتظام ہے۔" (ابن حوقل ص۲۰)

سغد کے علاقہ کے ایک مکان کے متعلق ابن حوقل کا بیان ہے

"تقریباً سو سال تک یہ مکان، مسافر خانہ بنا رہا، بسا اوقات کسی اطلاع کے بغیر سو، ڈیڑھ سو تک مہمان پہنچ گئے، ان کا کھانا، جانوروں کے لئے چارہ۔ اور سردی گرمی میں ضرورت کے کپڑے اس طرح مہیا کر دیئے گئے کہ مسافروں کو اپنا سامان کھولنے کی ضرورت تک محسوس نہ ہوئی (ایضاً)

اور مسافر نوازی کا یہ شوق اس درجہ غالب آگیا تھا کہ مقریزی مصر کے مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے

"صاحبِ مقدرت گھرانوں میں کھانا عموماً ضرورت سے زیادہ اس لئے پکا لیا جاتا ہے تاکہ وقت بے وقت اگر مہمان آجائے تو اسے تکلیف نہ ہو۔" (مقریزی جلد ا ص۳۱)

ماوراء النہر کے مسلمانوں کی مہمان نوازی کے جذبہ کے مختلف مظاہر کی اطلاع دیتے ہوئے ابن حوقل نے یہ عجیب بات لکھی ہے

"مہمانوں کے لئے ہر ایک شخص جس حد تک ہوا پنے گھر کو سجا کر رکھتا ہے۔" ص۳۳

ابن حوقل نے لکھا ہے کہ ہر رئیس پر یہی دھن سوار ہے کہ کوئی کشادہ اور وسیع مکان تیار کرائے تاکہ مسافروں کو ٹھہرانے کا خاطر خواہ انتظام ہر وقت ہو سکے، صدیوں مسلمان مساجد کو اسی لئے وسیع و کشادہ بناتے رہے تاکہ مسافروں کی بڑی سے بڑی تعداد مساجد میں مقیم ہو سکے،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے ۲۰ ہزار لوگوں کی گنجائش کی مساجد تیار ہوئیں اور زیاد کے دور میں جو مسجد تیار ہوئی اس میں ساٹھ ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی۔ بہر حال سینکڑوں سال تک مسلمانوں کے تمدن کا عنصرِ غالب یہی مسافر نوازی رہی ہے۔ رفاہِ عام کا یہ اتنا وسیع شعبہ ہے کہ اس کے وسیع اور پھیلے ہوئے نظام پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

پانی پلانے کا انتظام علاوہ قیام و طعام کہ جس کا انتظام ہر سرائے اور مسافر خانہ میں کیا گیا تھا مسلمانوں نے بڑی کشادہ دلی اور سیر چشمی کے ساتھ، عام مسافروں اور راہ گیروں کے لئے جس چیز کا انتظام کیا تھا وہ قدم قدم پر سبیل تھی جن میں نہ صرف پانی ہی مہیا کیا گیا تھا بلکہ بقول ابن حوقل برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی ہر جگہ موجود تھا ابن حوقل کا بیان ہے

"میں نے ایسا بہت کم دیکھا کہ کہیں مسافر خانہ ہو یا سڑک کا موڑ تا کہ ہو یا کوئی محلہ یا کسی دیوار کے سایہ میں لوگ جمع ہوتے ہوں اور وہاں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی سبیل پر موجود نہ ہو	وقل ما رأیت خاناً او طرف سکة او محلة او مجمع ناس الی حائطٍ بسمرقند یخلو من ماء جمدٍ مسبلٍ ص ۳۳۵

اسی سمرقند کے متعلق ابن حوقل یہ بھی بتاتا ہے کہ یہاں دو ہزار سے زیادہ مکان ایسے ہیں جن میں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی مفت تقسیم کیا جاتا ہے اوقاف کے تحت ان کا انتظام چلتا ہے اور جگہ جگہ سقابے بنا دئے گئے ہیں کہیں مستی اور کسی جگہ مٹی کے بڑے بڑے مشکوں میں پانی روزانہ بھروا دیا جاتا ہے جس سے عام راہ گیر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مراکش کے متعلق امیر شکیب ارسلان بھی لکھتے ہیں

مراکش میں وقف ہے جس کے تحت روزانہ گرمیوں میں برف سے بجھا ہوا پانی مہیا کیا جاتا ہے	"وفی مدینۃ مراکش وقف لسقی الماء المثلج فی ایام القیظ کما فی دمشق" (حاضر العالم الاسلامی ج ۱ ص ۲۹۳)

امیر کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک کے اکثر و بیشتر حصوں میں اس قسم کے انتظام کئے گئے تھے۔ صدیوں تک رفاہیت کے یہ شاندار کارنامے مسلمانوں کے تمدن کا جزو بنے رہے۔ آج بھی بعض مجسم خیر مسلمانوں کی طرف سے شہروں میں ٹھنڈے پانی کا انتظام بدستور کیا جاتا ہے جس سے راہ گیر بڑا نفع اُٹھاتے ہیں۔

"شفاخانے" مریضوں اور بے یار و مددگار بیماروں کے لئے جگہ جگہ ہسپتال کھولے گئے جن میں نہ صرف ادویہ و علاج و معالجہ ہی مفت تھا بلکہ بیماری کے ایام میں پرہیزی غذاؤں اور لطیف فواکہات کا انتظام بھی مسلمانوں کی طرف سے کیا جاتا تھا بیمارستان یعنی ہسپتال کا باقاعدہ انتظام ولید کے دور سے شروع ہوا جیسا کہ لکھا ہے

وكان اول من عمل البيمارستان للمرضى

وہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے بیماروں کے لئے ہسپتال بنوائے (یعقوبی جلد ۲ ص۳۲۵)

اوران شفاخانوں کے ساتھ، کھانے پینے اور پرہیزی غذاؤں کا جو انتظام کیا گیا تھا اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

"جہاں ہر ایک کو کھانا کپڑا دیا جاتا تھا اور ان کا علاج کیا جاتا معذوروں اور اندھوں کی خدمت اور راہ نمائی کے لئے ایک ایک خادم بھی ملتا" (تاریخ امت ج ۳ ص۲۷)

گویا کہ ولید کے اس رفاہی سلسلہ سے نہ صرف محتاج بیمار فائدہ اٹھاتے بلکہ ہر طبقہ کا مریض جو شفاخانہ میں پہنچ جاتا معالجہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولت اس کے لئے بہم پہنچائی جاتی۔ اندھوں اور معذوروں کے لئے خادم ولید کے رفاہِ خلق سے متعلق نیک جذبہ کی بڑی گہری اطلاع دیتے ہیں۔ اسی طرح مقتدر نے بھی ایک شفاخانہ بنوایا تھا جیسا کہ لکھا ہے۔

"اس نے اپنے ذاتی صرف سے ایک شفاخانہ بنوایا" (تاریخ الخلفاء ص۳۹۰)

(باقی آئندہ)

ادبیات

غزل

از

(جناب اکمؔ مظفر نگری)

طور پر اک تصادمِ برقِ نظر نے کیا کیا
جلوہ نما نے کیا کیا جلوہ نگر نے کیا کیا

غنچے خود اپنے وقت پر صحنِ چمن میں کھِل گئے
جوشِ نمو کا فیض تھا بادِ سحر نے کیا کیا

کارگہِ حیات میں عزمِ غلط سے درگزر
اڑ کے بسوئے آفتاب شبنمِ تر نے کیا کیا

تازہ و شوخ کر دیا اور بھی نقشِ آرزو
فصلِ جنوں طراز میں خونِ جگر نے کیا کیا

جلوۂ سادہ رنگ کو بخشیں تجلیاں ہزار
پھر بھی یہ ہم سے ہے گلہ ذوقِ نظر نے کیا کیا

رونقِ سوز و ساز تھا محفلِ حسن و عشق میں
پھونک دیا پتنگ کو شمعِ سحر نے کیا کیا

چشم زدن میں کہہ دیا زندگیٔ جہاں کا راز
دیکھا بھی تو نے بے خبر رقصِ شرر نے کیا کیا

زخمِ جگر کا حال میں اپنی زباں سے کیا کہوں
یہ تو خود آپ سوچ لیں تیرِ نظر نے کیا کیا

کرتی رہی مقابلہ جلووں کا بن کے جلوہ ساز
حسن کی بارگاہ میں تابِ نظر نے کیا کیا

نذرِ صد انقلاب ہے نظمِ حیاتِ عشق پھر
کام لیا نہ ضبط سے دردِ جگر نے کیا کیا

صبر و سکوں کا اختیار اتنا سمجھ لے اے اکمؔ
تیری رضا کے باب میں حکمِ قدر نے کیا کیا

غزل

از

(جناب رعنا جگی)

ناگہاں یورشِ آفات ہوئی جاتی ہے — زندگی مرگِ مفاجات ہوئی جاتی ہے

عقل بھی موجبِ آفات ہوئی جاتی ہے — روشنی باعثِ ظلمات ہوئی جاتی ہے

ان سے اب ترکِ ملاقات ہوئی جاتی ہے — جو نہ ہونا تھی وہی بات ہوئی جاتی ہے

کچھ تمھیں اپنے تغافل کی خبر ہے کہ نہیں — بے رخی پرسشِ حالات ہوئی جاتی ہے

دل کی دھڑکن بھی سکوتِ نگہ شوق میں ہے — ہم ہیں خاموش مگر بات ہوئی جاتی ہے

حادثاتِ غمِ دوراں کو دعا دیتا ہوں — کم سے کم زیست خوش اوقات ہوئی جاتی ہے

عشرتِ گردشِ پیمانہ بھی فرطِ غم سے — تلخیٔ گردشِ حالات ہوئی جاتی ہے

اب نہ وہ جام و سبو ہیں نہ وہ مے کشِ ساقی — منتشر بزمِ خرابات ہوئی جلتی ہے

مانگتا ہوں کبھی جینے کبھی مرنے کی دعا — زندگی حرفِ مناجات ہوئی جاتی ہے

شکریہ پرسشِ احوال کا اے چشمِ کرم — جی رہا ہوں بسر اوقات ہوئی جاتی ہے

اشک اُمڈ آئے کسی حادثۂ غم کے بغیر — بے گھٹا آج تو برسات ہوئی جاتی ہے

اب نہ وہ سرمستی و وارفتگیٔ حال کہاں — زندگی تابعِ حالات ہوئی جاتی ہے

ایک وہ رات بھی جن کی ہے سحر کی صورت — ایک ہم جن کی سحر رات ہوئی جاتی ہے

ضبطِ غم بھی ہے اک اعلانِ محبت رعنا
چپ ہوں مشہور مگر بات ہوئی جاتی ہے

تبصرے

مسند امام اعظم ابو حنیفہ مترجم اردو تقطیع کلاں۔ ضخامت ۴۱۴ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد درج نہیں غالباً آٹھ روپیہ ہوگی پتہ :۔ محمد سعید صاحب اینڈ سنز۔ ناشران و تاجران کتب قرآن محل۔ مقابل مولوی مسافرخانہ۔ کراچی

کس قدر عجیب بات ہے کہ مخالفین ہمیشہ سے یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کو حدیث میں درک نہیں تھا۔ اس بنا پر اُن کا سرمایہ اجتہاد قیاس ہی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام عالی مقام کے مسانید یعنی احادیث کا وہ مجموعہ جن کی روایت کا سلسلہ امام صاحب پر منتہی ہوتا ہے تعداد کے اعتبار سے امام مالک کے مسانید سے دوسرے نمبر پر ہی ہے پھر جن حضرات نے امام صاحب کے ان روایات کو مدون و مرتب کیا اُن میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ پر امام فن ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ امام صاحب کی روایات کو کیا مرتبہ و وقار حاصل تھا زیر تبصرہ کتاب بھی امام اعظم کی مرتب کردہ ہے جس میں سوا پانچ سو روایات مختلف ابواب فقہ کے ماتحت مندرج ہیں مولانا سعید حسن ٹونکی نے ہر حدیث کا شگفتہ اُردو میں ترجمہ کیا اور حسب ضرورت اُس پر مفید نوٹ لکھے ہیں شروع میں مولانا عبدالرشید نعمانی کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں تحقیق و جستجو سے امام اعظم کی روایات کو جن محدثین نے مدون کیا اُن کے حالات، فن حدیث میں امام صاحب کا مقام۔ مسند امام ابی حنیفہ کا محدثین کے نزدیک مرتبہ و مقام ان سب چیزوں پر روشنی ڈالی ہے اس مقدمہ کے بعد مختصراً امام صاحب کے حالات قاری احمد صاحب کے قلم سے ہیں، غرض کہ علماء۔ طلبا اور عوام ہر ایک کے لئے یہ مجموعہ نعمت غیر مترقبہ ہے

تجرید صحیح بخاری اردو تقطیع کلاں۔ ضخامت ۵۲۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد درج نہیں۔ مندرجہ بالا پتہ سے ملے گی محمد سعید صاحب اینڈ سنز نے احادیث کے مجموعوں

کو اُردو میں منتقل کر کے شائع کرنے کا جو ایک وسیع اور مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب
بھی اس کی ایک حسین کڑی ہے صحیح بخاری میں جو احادیث مکرر آئی ہیں علامہ حسین بن مبارک
زبیدی نے اُن کے مکررات اور اسانید کو حذف کر کے تجرید بخاری کے نام سے ایک مجموعہ مرتب
کیا تھا جو دو ہزار ایک سو اسی احادیث پر مشتمل تھا۔ زیر تبصرہ کتاب۔ اسی کا اردو ترجمہ ہے جو
صاف اور سلیس اور عام فہم زبان میں کیا گیا ہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اردو خواں حضرات
بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے شروع میں علامہ زبیدی اور امام بخاری کے حالات اور فنِ
حدیث میں ان کا جو مرتبہ ہے اگر اس پر ایک مقدمہ بھی ہوتا تو علما اور طلباء کے لئے بھی بہت
مفید ہوتا بہرحال عام مسلمانوں میں حدیث کا ذوق پیدا کرنے اور اس کی دینی اہمیت وعظمت
سے اُن کو آشنا کرنے کے لئے یہ سلسلہ بہت مفید ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

ماہنامہ مقام رسالت مرتبہ جناب سلیم الدین شمسی صاحب تقطیع کلاں۔ ضخامت ۴۸
صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت چار روپے سالانہ پتہ:- دفتر مقام رسالت ۱۳۲
برنس روڈ کراچی ۵۔

پاکستان میں فتنۂ انکار حدیث میں جو پھیلاؤ اور شدت پیدا ہو رہی ہے دوسری جانب سے
اس زہر کا تریاق مہیا کرنے کی سعی بھی اسی قدر ہو رہی ہے چنانچہ اس رسالہ کا جو ماہانہ ہے مقصد
یہی ہے۔ یہ برابر پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور ہر اشاعت میں مختلف مختصر لیکن مفید مضامین
کے علاوہ اس فتنہ کا ذکر اور اُس کا رد ضرور ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں دفاع عن الحق کی دو صورتیں
بیان کی گئی ہیں ایک "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَن" اور دوسرا "وَجَزَاءُ سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ
مِثْلُهَا" مقام رسالت کا عمل یوں تو دونوں پر ہی ہے لیکن دوسرے طریقہ کا پلّہ نسبتاً
بھاری ہے یہ خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے صحیح الخیال اور مستند علماء مثلاً مولانا مفتی
محمد شفیع دیوبندی۔ اور مولانا محمد یوسف بنوری کی امداد و اعانت رسالہ کو حاصل ہے اس لئے
مسلمانوں کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔

ماہنامہ آستانہ زکریا ملتان مدیر اعلیٰ مخدوم زادہ محمد سجاد حسین صاحب قریشی تقطیع کلاں ضخامت ۴۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت پانچ روپیہ سالانہ پتہ:- دفتر آستانہ زکریا - شہر ملتان (پاکستان)۔

ملتان کی سرزمین کو حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ جو کبار اولیاء اللہ میں سے تھے آپ کی آرام گاہ ہونے کا شرف وفخر حاصل ہے اسی مناسبت سے اس ماہنامہ کا نام بھی آستانہ زکریا رکھا گیا ہے، اور اسی مناسبت سے اس میں دوسرے مختلف قسم کے مفید اور دل چسپ مضامین کے علاوہ خاص تصوف اور ارباب معرفت کے متعلق دو تین مضمون ہر اشاعت میں ہوتے ہیں آخر میں چند صفحات سندھی زبان میں بھی ہوتے ہیں رسالہ بحیثیت مجموعی دلچسپ، مفید اور معلومات آفریں ہے۔

معارف الحدیث جلد دوم مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع کلاں ضخامت ۳۰۴ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت مجلد ۲؎، ساڑھے پانچ روپے پتہ:- کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ - لکھنؤ

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے احادیثِ صحیحہ کا انتخاب اُردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ شائع کرنے کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے اس سلسلہ کی پہلی جلد کئی سال ہوتے شائع ہوچکی ہے اور برہان میں اُس پر تبصرہ بھی ہوچکا ہے اب یہ دوسری جلد شائع ہوئی ہے جو کتاب الرقاق اور کتاب الاخلاق اور ان کے ماتحت بیسیوں ابواب پر مشتمل ہے۔ فاضل مرتب کا اصل مقصد چوں کہ دلوں میں خوفِ آخرت۔ اور خوفِ خدا پیدا کر کے مسلمانوں کو سیرۃً وعملاً مسلمان بنانا ہے اس لئے انھوں نے ایسی ہی احادیث کا انتخاب کیا ہے جن سے یہ مقصد بوجہِ احسن حاصل ہو متنِ حدیث کے ساتھ اُس کا اُردو ترجمہ اور اُس کی تشریح اس انداز میں کی گئی ہے کہ عقلی اور کلامی بحثوں کے خارزار سے بچ کر سیدھی سیدھی باتیں دل پر اثر انداز ہوں اور سعید روحیں اُن سے اثر پذیر ہو کر اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ اب تک

ہمارا ذخیرۂ احادیث صرف علما اور عربی خواں حضرات کے لئے مخصوص تھا۔ مگر اب بحمداللہ یہ سرمایہ اُردو میں منتقل ہونا شروع ہوگیا ہے اور اس کا یقیناً مسلمانوں کی عام دینی زندگی اور مذہبی فکر و شعور پر اچھا اثر پڑے گا ضرورت اس کی ہے کہ مسلمان ان کتابوں کا مطالعہ کریں اور اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں سے چند لمحے روزانہ ان کتابوں کے مطالعہ کے لئے بھی پابندی سے نکالیں، شروع میں مولانا ابوالحسن علی کے قلم سے ایک مختصر مقدمہ بھی ہے۔

حیاتِ وحید الزماں تقطیع کلاں ضخامت ۱۶۵ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت للعہ پتہ:- نور محمد اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔

مولانا وحید الزماں وقار نواز جنگ حیدرآباد کے بڑے فاضل اور صاحبِ علم بزرگ تھے ۱۹۲۰ء میں وفات پائی علومِ اسلامیہ و دینیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے حلقۂ ارشاد و ہدایت سے وابستہ ہونے کے باعث اہلِ دل اور صاحبِ باطن بھی تھے۔

مولانا کا خاص ذوق علومِ قرآن وحدیث کو اُردو میں منتقل کرنا تھا چناں چہ ان کی اکثر کتابیں اسی سلسلہ کی ہیں ان میں اہم کارنامہ صحاح ستہ کا اردو میں ترجمہ، تبویب القرآن اور وحید اللغات ہے جو ۲۸ جلدوں میں ہے۔ اردو کے علاوہ موصوف نے عربی میں بھی چند رسالے لکھے ہیں جو فقہ پر ہیں۔ مولانا عبدالحلیم چشتی نے اس کتاب میں موصوف کے سوانح اور علمی کارنامے بڑی تحقیق اور جامعیت سے بیان کئے ہیں اور بڑا کمال یہ ہے کہ علمی دیانت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا چناں چہ مولانا مرحوم کی تالیفات پر تبصرے کے سلسلے میں لائق مصنف کو جہاں کچھ امور قابلِ اعتراض نظر آئے انھوں نے اس کی صاف نشان دہی کی ہے۔ سوانح نگاری کا یہ خالص علمی اور غیر جانب دارانہ طریقہ اس عہد کے بہت سے سوانح نگاروں کے لئے سبق آموز ہوگا۔ امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کتاب کی قدر کریں گے۔

تازیانے ترجمہ المنبہات۔ تالیف زین القضاۃ احمد بن محمد الحجی۔

ترجمہ مولانا ابو البیان محمد حماد۔

تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات۔ طباعت وکتابت بہتر۔ قیمت مجلد (۳ روپے)

مذکورہ بالا پتہ سے ملے گی۔

عربی میں المنبہات کے نام سے ایک واعظانہ کتاب پائی جاتی ہے۔ عام طور پر اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ یا ابن حجر مکی کی تصنیف ہے لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ چناں چہ صاحب کشف الظنون نے اس غلط فہمی کی تصحیح بھی کردی ہے، اگرچہ کتاب محض واعظانہ ہے اور اس بنا پر روایات حدیث میں صحت کا بھی اہتمام نہیں کیا گیا تاہم عربی زبان شگفتہ اور اثر انگیز ہے اور مضامین میں حکمت وموعظت کی بھی بہت سی مفید باتیں آگئی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب عام مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اسی مذکورہ بالا کتاب کا مع متن کے آزاد ترجمہ ہے جو شگفتہ اور سلیس ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کیا گیا ہے۔ شروع میں جو پیش لفظ اور تعارف ہے وہ محض بھرتی کی چیز ہے البتہ عرض ناشر میں کتاب کے اصل مصنف کی تحقیق کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ کار آمد اور مفید ہے۔

احادیثِ نبوی کا شاندار ذخیرہ
اردو زبان میں

ترجمان السنہ

"ترجمان السنہ" حدیث شریف کی ایک لاجواب کتاب ہے جس کے ذریعہ سے ارشاداتِ نبوی کا نہایت اہم اور مستند و معتبر ذخیرہ نئے عنوانوں اور نئی ترتیب کے ساتھ ہماری زبان میں منتقل ہو رہا ہے۔ اس کتاب میں احادیثِ نبوی کے صاف و سلیس ترجمے کے ساتھ تمام متعلقہ مباحث کی دلپذیر تشریح و تفسیر بھی کی گئی ہے اور اس تشریح میں سلفِ صالح کی پیروی کے ساتھ جدید ذہنوں اور دماغوں کی بھی پوری پوری رعایت کی گئی ہے۔ "ترجمان السنہ" کی تالیف موجودہ زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق اسلامی لٹریچر میں ایک عظیم الشان اور زبردست اضافہ ہوا ہے

کتاب کی ترتیب اس طرح قائم کی گئی ہے:-

(۱) متن مع اعراب (۲) شستہ اور عام فہم ترجمہ (۳) ہر حدیث پر مختصر تشریحی نوٹ (۴) باب کے خاتمے پر مندرجہ حدیثوں کے متعلق ایک عام اور سیر حاصل بحث۔

جلد اول جس کے شروع میں ایک مبسوط اور محققانہ مقدمہ بھی ہے۔ اس میں ارشاداتِ نبوی کی اہمیت، احادیث کے درجۂ استناد و اعتبار، تدوینِ حدیث کی تاریخ، حجیتِ حدیث اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے اور بہت سے ائمہ حدیث اور فقہا رامت کے ضروری حالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ کتاب التوحید سے اصل کتاب شروع کی گئی ہے۔ تقطیع ۲۹×۲۲ صفحات ۵۹۲ قیمت دس روپے مجلد بارہ روپے۔

جلد دوم اس جلد میں کتاب الایمان والاسلام کی ۵۰۰ حدیثوں کا ذخیرہ ہے۔ صفحات ۵۱۲ قیمت نو روپے مجلد گیارہ روپے۔

جلد سوم اس میں کتاب الایمان کے بقیہ بابوں کے علاوہ پوری کتاب الانبیاء بھی آگئی ہے صفحات ۵۶۰ قیمت دس روپے آٹھ آنے مجلد بارہ روپے آٹھ آنے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی-۶

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا۔